

168

DATA ENTERED

فتویٰ زبدان

یعنی تحریک ختم نبوت کی تفسیر و تبیین میں لکھے ہوئے
مختلف احباب کے نام خطوط، جن میں اسلام کے بنیادی
مسائل ختم نبوت، مسئلہ ارتداد، توحید و رسالت، مقام
نبوت، احسان و استحسان پر تبصرہ اور مختلف آیات قرآنی
اور ارشادات نبوت کی تشریح کی گئی ہے۔

— دانا —

حضرت مولانا الحافظ الحاج محمد علی صاحب صدیقی

صدر دارالعلوم الشہابیہ سیالکوٹ

— دانا —

مکتبہ قاسمیہ رینگپورہ روڈ شہر سیالکوٹ

سلسلہ مطبوعات فقیر

تالیف ... حضرت مولانا محمد علی صاحب مدنی

عناوین ... ۳۳۷

آیات ... ۹۲

احادیث ... ۶۵

کل صفات ... ۳۱۲

طابع ... محمد شریف قاسمی

ناشر ... مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ

مطبع ... اقبال پرنٹنگ پریس سیالکوٹ

قیمت مجلد ... پانچ روپے پچاس پیسے

رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ

فروری ۱۹۶۴ء

تاریخ اشاعت ...

۲۹۷۰۲
۵۲۵
۱۱۶۶

DATA ENTERED

فہرست

نگاہِ اولین

خط مرقوم یکم ستمبر ۱۹۵۳ء

معاملی اور مصائب کے اندر مبتلا ہونے میں جوہری فرق — مشقتیں اور تکلیفیں را، محبوب میں ترقی طراح
کامیاب ہیں — مومن کو گھبراہٹ مصائب سے نہیں بلکہ معاصی سے ہوتی ہے۔

خط مرقوم ۵ ستمبر ۱۹۵۳ء

اللہ پاک کی یاد میں بہتات اور دوام — آیت قرآنی وَتَبْتَئِلُ إِلَيْهِ تَفْتِيلًا میں مبالغہ اور تہدید کی شرطیں
بتسل کی انواع اور ان کا اصطلاحی نام — دعوت اور دعویٰ میں فرق — دعوت کے فرائض واجبات اور مستحبات۔

خط مرقوم ۷ ستمبر ۱۹۵۳ء

قرآن کی بیان کردہ وحی کی دو قسمیں — اتباع وحی اور تلاوت وحی میں فرق — قرآن کی زبانیں
وحی سے دو چیزیں مراد ہیں ایک، اِذَا كُنَّا لِلَّهِ رَدْدَةً حَافِظِينَ كَذَاتِهَا۔

خط مرقوم ۱۱ ستمبر ۱۹۵۳ء

نہاڑ چھوڑنے پر نبوت کی وعید — دینی زندگی کی الٹی ہونی بساط اور اس کی تصویر — دنیا اور اس کی
تمام دولت سامان عبادت ہے، حکومت مفضد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ، خالص دیوانی قوانین میں تذکارت۔

خط مرقوم ۲۵ ستمبر ۱۹۵۳ء

اللہ جل شانہ کا بندوں کے نامہ پیغام انسان مناظرہ کا حیوان ناطق نہیں بلکہ ایک ذمہ دار اخلاقی وجود ہے۔
الہی شریعت میں استغفار کی حقیقت — غفر کے لغوی معنی عفا لیت کی دو صورتیں اعمالِ تبت میں داخل ہونے کا سبب ہیں۔

خط مرقوم ۲۰ ستمبر ۱۹۵۳ء

نبی کریمؐ کے میں مولانا محمد قاسمؒ کا نظریہ — اوصاف کی قسمیں — نبوت یعنی ایک دعوت ہے۔

اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اوصاف کا موصوف ذاتی پر اختتام — حضور انور کیلئے نبوت حادث ہے

خط مرقوم ۲۲ ستمبر ۵۳ء از ۵۰ تا ۶۵

انکار حدیث کے فتنے کو پدید آئی فتنہ کہنے کی علیٰ ترجمہ — نبی صاحب کتاب کو نہیں بلکہ صاحب وحی کو کہتے ہیں

آغاز بخاری میں آیت وحی لانے کی وجہ مصادر و مظاہر سے وحی کا تعلق — نبی شامی کا اخلاقی اور ذہنی پیار ہے

خط مرقوم ۲۹ ستمبر ۵۳ء از ۶۶ تا ۷۸

سالار نبوت کی زندگی کا نام اسلام ہے — صورت ارشاد قرآنی بگڑی ہوئی قوموں کیلئے اکیس نہیں ہے۔ نبوت کا

لوگ فیصلہ — دعوت کا کام اوپر سے نیچے شروع ہوتا ہے — رسالت محمدیہ اجتماعی بعثت کی حالت ہے۔

خط مرقوم ۳ اکتوبر ۵۳ء از ۷۹ تا ۱۰۲

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا دوسرا نام اسلام ہے — مسلمان زندگی کے ہر شعبہ میں اسے

کا قیدی ہے۔ آزادی کا اسلامی مفہوم — تخت حکومت سے اسلامی زندگی کا مطالعہ۔

خط مرقوم مورخہ ۱۰ اکتوبر ۵۳ء از ۱۰۳ تا ۱۱۰

عقل خود پرستی اور ایمان خدا پرستی کا نام ہے — مقام رسالت کے بارے میں ایمان کی تین شرطیں —

اتباع اور اطاعت میں بنیادی فرق — قانون سازی میں خلافت راشدہ کا مقام نبوت سے نیچے اور اجتہاد آگے ہے

خط مرقوم مورخہ ۱۲ اکتوبر ۵۳ء از ۱۱۱ تا ۱۲۲

موضوع تراویح پر روایت ابن عباس کی تحقیق — روایت کے خارج — حدیث کے ضعیف ہونے

کی وجہ — ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان کا چہرہ، تہذیب کے راویوں کی ثقاہت، امام شعبہ کی تکذیب کی کہانی

خط مرقوم مورخہ ۱۴ اکتوبر ۵۳ء از ۱۲۵ تا ۱۳۹

اللہ کی صفت اور اس کی قسمیں — مسلک تاویل یا تفویض — کلام کی اور علم کلام کی بیچاریگی — معتقدان

میں اطمینان کی راہ کلام نہیں بلکہ قرآن ہے — امام غزالی کا اعتراض قرآن میں غیبی حقائق کے ماننے کا مطالبہ نہ کرنا

خط مرقوم اللہ کی صفت اور اس کی قسمیں — مسلک تاویل یا تفویض — کلام کی اور علم کلام کی بیچاریگی

سوسائٹی میں سرور میاں نہ درج ہے۔ بہت بڑی سرمایہ داری والی الٹا کوٹا پسند ہے۔ نمونہ کی معتدل زندگی۔

خط مرحوم مورخ ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۳ء از ۱۵۶ تا ۱۶۸

اخلاق کا سرچشمہ۔ غضب اور شہوت کی نیرنگیوں کا ازالہ چاہتی ہے۔

اسلام ان کا ازالہ نہیں امانہ چاہتا ہے۔ عبادت کے موضوع پر ارباب مذاہب میں فکر و نظر کا اختلاف۔

خط مرحوم مورخ ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۳ء از ۱۶۹ تا ۱۷۳

اسلامی نظام حیات کی برتری کی تمنا۔ رائے عامہ اور جمہوریت۔ رائے عامہ کے جائزہ لینے

کا طریق۔ باطل کی ہواؤں سے حقائق کے چراغ نہیں بجھتے۔ جو کچھ مل جائے غنیمت ہے۔

خط مرحوم مورخ ۳ نومبر ۱۹۵۳ء از ۱۷۴ تا ۱۷۵

خلوت ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ سبحانہ کی شان جمالی و جلالی۔ بلا اور بلا و حسن

میں فرق۔ شیخ اکبر اور مولانا روم کا نظریہ۔ علامہ محب اللہ بہاری کا تعارف

خط مرحوم مورخ ۱۰ نومبر ۱۹۵۳ء از ۱۷۶ تا ۱۸۳

حسن پسندی اور حسن کاری۔ قرآن حسن کاری کا داعی بن کر آیا۔ حسن پسندی کے لئے قرآن

و حدیث کا سہارا۔ حسن پسندی کا نسب نامہ۔ حسن کاری کی تشکر کے۔ آیت نکیم سے اخذ کردہ نالج۔

خط مرحوم مورخ ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء از ۱۸۴ تا ۱۸۶

خداری کا الزام خود الزام تراشیوں کی کھلی خداری کا آئینہ دار ہے۔ عبدالملک بن مردان کا آزادی

ماننے کو چیلنے کے لئے آرزو نہیں۔ سیاسی زندگی کے سارے گوشے آج مصلحت اور منفعت کے تقاضوں پر گھومتے ہیں۔

خط مرحوم مورخ ۲۹ نومبر ۱۹۵۳ء از ۱۸۷ تا ۱۸۸

رحمت میں رحمت، مصیبت میں نعمت کا تصور، تنہائی غنا، و عذاب نہیں بلکہ بیماری کی دعا ہے۔

خلوت اور جلوت کا تقابل۔

خط مرحوم مورخ یکم دسمبر ۱۹۵۳ء از ۱۸۹ تا ۱۹۲

وقت کی قدر و قیمت۔ انبیاء و وقت کے سب سے زیادہ قدر دان تھے۔ قبر کا بھیانک اور خوفناک

منظر۔ یہاں منٹ۔ ہل اور گھڑی بڑی قیمت ہے۔

خط مرقوم مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۳ء

کچھ اپنا حال۔ روزانہ کا لاکھ عمل۔ جیل کی زندگی کے چوبیس گھنٹے۔ دن بھر کے مشاغل اور روزمرہ کا پروگرام۔

خط مرقوم مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۳ء تا ۱۹۶۱ء

۱۹۵۳ء کا غمیں ڈرامہ۔ اللہ کی شان قدیری اور اس کی شان حکیمی کی توضیح اور ان میں باہمی فرق۔ ما بقوم اور ما بالفسہم کی تشریح۔ اسلامی قومیت کا فیصلہ وقت کا اہم تقاضا ہے۔

خط مرقوم مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۵۳ء تا ۲۰۰۰ء

وساوس دد کرنے کی پانچ تدبیریں۔ اصلاح نفس کے دو طریقے طریق توت اور طریق ولایت اور دونوں میں فرق۔ جو اس کی اور مشاعر کی طرح لطائف بھی پانچ ہیں۔

خط مرقوم مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۳ء تا ۲۰۰۰ء

انسان ایک عالم صغیر ہے۔ روح سے اخلاق کا تعلق۔ جو اس اور مشاعر کی طرح لطائف پیکار۔ بھی اگر کام نہ کریں تو انسان حیوانیت سے بھی گر جاتا ہے۔

خط مرقوم مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۵۳ء تا ۲۰۰۸ء

توحید بطور مقام حاصل کرنے کا نسخہ اور اس کی ترکیب استعمال۔

خط مرقوم مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۵۳ء تا ۲۰۰۹ء

خلوت کی لذتیں اور پرکیف نفع اندوزیاں۔ اللہ کی یاد وہ نعمت ہے۔ کس سے آگے کسی نعمت کا تصور بھی نہیں۔ خواب میں بشارت۔ جرم کا کھلے بندوں اقرار۔

خط مرقوم مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۵۳ء تا ۲۰۱۳ء

حکیم الامت شاہ ولی اللہ کی ذات صرف علمی نہیں بلکہ اسناد لالی شخصیت ہے۔ شاہ شاہ کے سینہ تجدد سے ابلی ہوئی ہدایت علم الہی اور ربانی ہے۔ فکر و عمل کی دو قوتیں۔

خط مرقوم . مورخہ یکم جنوری ۱۹۵۲ء . از ۲۲۰ تا ۲۲۲

و تہذیبی ، فن و اینداری اور پیشہ دینداری ۔ نبوت کا پیش ہنار اور علم کے موضوع پر اس کا مطالبہ ۔ نفس کو لذت و دوسروں پر اپنی برتری جتانے میں آتی ہے ۔ اچھی صحبت اور اس کی عزت

خط مرقوم . مورخہ ۴ جنوری ۱۹۵۲ء . از ۲۲۳ تا ۲۲۶

میر خسرو شیخ نظام الدین بلخی کے مرید سید پیر اور مرید میں بے حد محبت ہے ۔ جیل بلحاظ صورت خانقاہ سے ملتا جلتا اور وہ ہے ۔ تخلیہ اور تخلیہ تصوف کے دو رکن ہیں ۔ جیل کی زندگی سزا سزا تخلیہ ہے ۔

خط مرقوم . مورخہ ۸ جنوری ۱۹۵۲ء . از ۲۲۷ تا ۲۳۰

سید علیان ندوی کی زحمت جماعتی زندگی کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے ۔ سید صاحب بہت بڑا علمی سپہار اور تقدس و تقویٰ کا قومی سرمایہ بنے ۔ قانون کے خلاف قرآن و سنت نہ بننے کا مفہوم

خط مرقوم . مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۵۲ء . از ۲۳۱ تا ۲۳۶

سنہ نبیؐ کی ہدایت میں عقائد ۔ اعمال اور اخلاق کی اصلاح اور اسلام میں ان کے مدارس ۔ اسلام ایک جاندار وجود ہے عقائد اس کا دماغ ۔ اعمال اس کے اعضاء و جوارح ۔

خط مرقوم . مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۵۲ء . از ۲۳۷ تا ۲۵۱

ماننے کو اسلام ۔ نہ ماننے کو کفر اور مان کر چھوڑ دینے کو ارتداد کہتے ہیں ۔ قرآن کی چند اصولی اور قانونی ہدایات ، انفرادی اور اجتماعی ارتداد کا قرآن میں ذکر ہے ۔

خط مرقوم . مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۵۲ء . از ۲۵۲ تا ۲۶۰

معیزہ اگر دلیل نبوت ہے تو دلیل اور مدلول میں مطابقت ۔ معجزہ کے وہیں نبوت ہونے پر ایک مثال ۔ معجزہ کے دلیل نبوت ہونے پر یہ مشہور ہے کہ اہل حدیث مولانا محمد حسین صاحب کے نام نوا محمد تقی کا خط

خط مرقوم . مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۵۲ء . از ۲۶۱ تا ۲۷۰

زبان کی شیریں جواب تلخی کی تلخی سے ۔ موت کو حیات دیکھ کر اسلام کے داعی کا موت ان کے روئے ہوئے بندوں کو ممانہ کا نام ہے ۔ عروہ کی سزا چاہتے ہیں

خط مرقوم مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۵۲ء از ۲۷۵ تا ۲۷۸

حقوق اور فرائض کا فرق — اسلام نے مسلمانوں کے سامنے فرائض رکھے ہیں۔ فرائض کی تلاش ادا کرنے کا جذبہ ادا کرنے فرض پر اللہ کا شکر — سوچنے کہ چیز صحت ادا کرنے فرض ہے۔

خط مرقوم مورخہ ۲۷ جنوری ۱۹۵۲ء از ۲۷۹ تا ۲۸۵

الطفیل کی شخصیت — دعوت کا پر آشوب زمانہ — الطفیل کی مکہ میں آمد — وفد قریش کی الطفیل سے ملاقات —

خط مرقوم مورخہ ۳۰ جنوری ۱۹۵۲ء از ۲۸۶ تا ۲۸۸

حدیث الدانیہ سبحان المؤمن کی تشریح — مسلمان کے لئے دنیا کے جیل خانہ ہونے کا مشہور مطلب اور احادیث کی روشنی میں اس کی تردید —

خط مرقوم مورخہ ۲ فروری ۱۹۵۲ء از ۲۸۹ تا ۲۹۴

یزید بن زومان کی روایتی تحقیق — تراویح میں اختلاف کا بنیادی نقطہ — مرسل حدیث کی تعریف — مراسلات موطا کا حکم — مرویات مرسلہ کی آئینی حیثیت —

خط مرقوم مورخہ ۶ فروری ۱۹۵۲ء از ۲۹۷ تا ۳۰۳

زمانہ کی تاریخ اور پھر قید کی توسیع — جیل کی زندگی میں بے فکری — علائق کی کثرت — غم و الم کا سامان ہے —

مورخہ ۳۰ جنوری ۱۹۵۲ء

نگارہ اولین

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں مجھے تو اسی بالحق کے نتیجے میں قید و بند سے دو چار ہونا پڑا۔ میں جیل میں چوبیس گھنٹوں کی مشغولیت کا پروگرام بنا کر زندگی گزارنے کا نوکر ہوں۔ ان مصروفیتوں میں فرصت کے جولمحات مل جاتے۔ ان کو میں اس طرح گزارتا یا یوں سمجھئے کہ جیل سے باہر کی زندگی میں فکر و مطالعہ کی لگی ہوئی چاٹ اس طرح پوری کرتا کہ کسی نہ کسی دوست سے زبان دہن سے نہیں بلکہ زبانِ قلم سے باتیں کرتا۔ بس زبانِ قلم سے کی ہوئی مختلف وقتوں میں باتوں کا نام فقوشِ زنداں ہے۔ ان خطوط کا نہ کوئی پس منظر ہے اور نہ کوئی ایک خاص موضوع ہے بلکہ یہ مختلف وقتوں اور مختلف عنوانوں پر منتشر خیالات ہیں۔

رہائی کے بعد میرے عزیز شاگرد مولانا حافظ امیر علی نے ان منتشر اوراق کو یکجا کیا۔ یکجا ہونے کے بعد کچھ احباب نے ان کی اشاعت کے لئے اصرار کیا۔ بالآخر مولانا حافظ محمد شریف قاسمی مالک مکتبہ قاسمیہ نے ان کی اشاعت کے لئے کمر ہمت باندھی۔ اور ہمت بھی اس طرح کہ پہلے ان کو مرتب شکل میں صاف سحر کتابی صورت میں لکھا۔

میرا کام صرف اس قدر ہے کہ ہر خط کی پیشانی پر خلاصہ میرا لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ساری محنت کا سہرا میرے ان دو عزیزوں کے سر ہے۔ اختصار یا تطویل کسی خاص تاثر کے پیش نظر نہیں بلکہ یہ وقت کی مرافقت

اور طبیعت کے نشاط کی وجہ سے ہے۔ ان میں توحید، رسالت، مقام نبوت، انکار حدیث، مسئلہ ارتداد، ختم نبوت اور دوسرے کلامی، فقہی، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مسائل پر تبصرہ کے ضمن میں مختلف آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی تشریح کی گئی ہے اور بتایا ہے کہ ہم اس مقصد کو بھول گئے جس کے لئے اللہ نے بے شمار قوموں کی موجودگی میں ہمیں منتخب کیا تھا۔ ہمیں نبوت سے جو مقصد ملا تھا۔ کہ لوگوں کو انسانوں کی خدائی سے نکال کر خدائے واحد کا پرستار بنائیں۔ اسے فراموش کر دیا۔ لوگ اللہ کی شریعت کی جگہ اپنے من گھڑت قوانین نافذ کرنے لگے۔ ہم اسلامی اور نبوی قید و بند سے آزاد ہو کر ایک طرح کی اباہی زندگی کے خوگر ہو گئے۔ گویا نہ نبی کی امت ہیں۔ اور نہ وحی و رسالت پر ایمان ہے۔ نہ حساب کا ڈر ہے اور نہ آخرت کا خوف ہے۔ ہم تمدن و اجتماع، سیاست، اخلاق اور معاشرت میں ان قوموں کی کاپی کرنے لگے جن کی وجہ سے اللہ ان سے ناراض ہوا تھا۔ اور ان پر اپنا غضب نازل کیا تھا۔ **قیل لانسف ویاللعار۔**

ہمارے پیش نظر کوئی صحیح اور اعلیٰ مقصد نہیں رہا۔ ہماری نگاہ و اور جہد و جہد کھلنے پینے اور عیش و عشرت تک محدود ہو گئی۔ دنیا کی قوموں میں ہماری کوئی خصوصیت اور امتیاز باقی نہیں رہا۔ ہم اپنے ہم جنسوں کی طرح ہی انسانوں کا ایک گلہ ہو کر رہ گئے۔ ہمارے بادشاہ اور سلاطین اپنی زندگی کے ایک گوشہ میں دنیا کے جبابرہ سے بھی بازی لے گئے۔ اور فراعنہ و نمارودہ کی طرح دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے سے ہٹ کر کلمتہ الکفر کی بلندی میں مصروف ہو گئے۔

ہمارے دولت مندوں میں تکبر پیدا ہو گیا۔ ہمارے سردار اور اکابر قوم فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے۔ یہاں تک کہ ہمارے فساق و فجار بفض و حسد، جاہ طلبی، دنیا پرستی، عیش پسندی، آغوش سے غفلت، خونریزی، بے حیائی، حق تلفی، بد عہدی، بے وفائی اور اللہ سے تجاوز، ظلم و بے انصافی، اسراف و تبذیر اور فواحش و منکرات میں آج اپنی مثال آپ ہیں۔ فاناللہ والی اللہ الممشکی۔

اس کا نتیجہ ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر ہم پیچھے دھکیلے جا رہے ہیں اور ہر قدم پر ہمیں ناکامیوں سے ہمدوش ہونا پڑتا ہے۔

آج بھی ہم ناکام نہیں اگر ہم اپنی اندرونی اور بیرونی قوتوں کی اصلاح کر لیں۔ یعنی ہمارا قلب ایمان سے معمور ہو جائے۔ اور روح دینی تعلیمات اور اسلامی اخلاق کے ذریعے پاکیزہ ہو جائے۔ سینہ میں دینی حمیت جوش مارنے لگے اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ پوری دنیا میں آگ لگ رہی ہے۔ اور اسے بجھانے کے لئے پانی مسلمان کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے۔ اس کے لئے دوڑ دوڑ کر محنت اور جدوجہد کو ہم اپنا نصب العین بنالیں۔ اس راہ میں اپنی لذتیں، اپنی مسرتیں، اپنا خواب و غور بھول جائیں تو ہم آج بھی قضا، الہی اور حکم ربانی بن کر سب پر غالب آسکتے ہیں۔ قرآن، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام کی سیرت آج بھی موجود ہیں۔ ہمیشہ یہی مسلمانوں کے لئے قوت اور زندگی کا منبع، جوش ایمان کا مخزن رہی ہیں مسلمانوں نے ہمیشہ ان سے زندگی اور طاقت حاصل کی ہے۔ آج بھی اگر ہم ان پر خاص توجہ کریں۔ ان کی اشاعت میں خاص حصہ لیں۔ خود پڑھیں اور اپنے بچوں کو

پڑھائیں تو ہم عزت اور قوت کے مالک ہو سکتے ہیں۔ ان سے ہٹ کر
 کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔
 ۱۹۵۳ء میں لکھی ہوئی یہ دستاویز اب احباب کی کوششوں سے
 ۱۹۶۲ء میں شرمندہ طباعت ہو رہی ہے۔ اللہ کرے کہ میری یہ آہیں
 کسی کی اصلاح حال کا سامان ہو کر میرے لئے رضاء مولیٰ اور نجات آخرت
 کا ذریعہ ہو جائیں۔ وما ذالك على الله بعزیز۔

محمد علی صدیقی

کان الشدائد

۱۹ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۵ فروری ۱۹۶۲ء

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

یکم ستمبر ۱۹۵۲ء

زندگی کی ساری بد حالیوں کا بنیادی سبب، معاصی اور مصائب کے اندر
بتلا ہونے میں جوہری فرق اور دونوں کے نتائج، مشقتیں اور تکلیفیں
راہ محبوب میں ترقی مدارج کا سامان ہیں۔ مومن کو گھبراہٹ مصائب
سے نہیں بلکہ معاصی سے ہوتی ہے۔

جیسی فی اللہ وفتحنا اللہ وایاکم لما یجبه ویرضاه اسلام علیکم

مصائب بھی اللہ جل شانہ کا بہت بڑا انعام ہیں۔ شیخ جیلانی رحمہ نے فتوح الغیب
میں لکھا ہے کُلُّ بَلَاءٍ نَعْمَةٌ مِّنَ اللّٰهِ۔ اور کیوں نہ ہو وفاقے محبوب سے جنائے
محبوب زیادہ قیمتی ہوتی ہے بشرطیکہ صاحب بلا دانائے راز اور صاحب حال ہو۔
اگر صاحب حال نہ ہو تو خوش حالیوں میں نوعیت اور بد حالیوں میں جزو عیت
نمایاں ہوتی ہے۔ اللہ پناہ دے۔ ان دونوں سے مل کر جو حالت و کیفیت رونما
ہوتی ہے اس کا ناہو عیت ہے یعنی انسانی نفسیات کی وہ کیفیت جسے ہم لاپٹی
اور بے صبر اپن کہتے ہیں

بد حالی میں گھبرانے والا اور خوش حالی

اذا امتہ الشر جزوعاً و

میں اچھائی کے راستے میں روک بن

اذا مسه الخیر منوعاً۔

جانے والا۔

میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ کبھی سنا یا پڑھا تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ علیہ السلام ایک مجلس میں بلاؤں کے انعام الہی ہونے پر کچھ فرما رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور بیماری کے لئے دعا کی درخواست کی۔ حاضرین حیران تھے کہ دیکھئے اب اس نعمت کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ کہنے لگے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا۔ اہا! بیماری بھی ہم پر تیرا انعام ہے لیکن اس انعام کے عمل کی ہم میں بلاقت نہیں تو اس نعمت کو صحت کی نعمت سے تبدیل فرما دے۔

یہی وہ انعام ہے جس سے مدارج میں ترقی ہوتی ہے۔ مقامات طے ہوتے ہیں قرب الہی زیادہ سے زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ مگر بے حال اسے قدر کی نگاہ سے کب دیکھتے ہیں۔ وہ تو دنیا کی اس ٹیپ ٹاپ کو ہی مقصود بنا لیتے ہیں۔ آخرت سے آنکھیں اندھی ہوتی ہیں ایسی اندھی کہ وہاں کا کروڑ بھی یہاں کی رقی کے مقابلے میں نظر نہیں آتا۔

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ

الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ

خَافُونَ

آج ہمارے سناری بد حالیوں کی داستان اسی ایک نقطہ میں سمٹی ہوئی ہے کہ صحابہ کرام کے برعکس ہماری دن رات کی تگ و دو ہمارے سفر، ہماری تجارت، ہماری سیاست، اور ہماری تعلیم آخرت سے الگ ہو کر دنیا اور صرف دنیا کی ہو کر رہ گئی ہے۔ روح ایمان میں ناسور بھوٹ آیا زندگی کے کسی گوشے میں بھی اس زندگی کے اعمال کے خیال سے اور جزا کا تصور نہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے کردار گفتار میں تبیین ہے اور ہر فعل ہر ادا اور ہر حرکت اخلاص کی دولت سے محروم ہے

فَاِنَّا لِلّٰهِ وَاِلٰى اللّٰهِ الْمُنْتَقِلٰتُ

غالباً ازالۃ الخفاء میں حضرت فاروق اعظمؓ کا یہ ارشاد گرامی بڑھا تھا کہ جب بھی کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہوں تو اپنے اندر چار جنتوں کا احساس پاتا ہوں۔ اول یہ کہ اس سے میرے دین کو صدمہ نہیں پہنچا۔ دوسری یہ کہ اس مصیبت سے بڑی مصیبت سے دوچار نہیں ہوا تیسری یہ کہ اس کی وجہ سے میں رنائے حق سے محروم نہیں ہوں۔ چوتھی یہ کہ اس پر اللہ پاک سے اجر کا امیدوار ہوں۔

دراصل گھبرانے کی چیز معاصی نہیں معاصی ہیں۔ ایمان کی روح میں بے چینی ہوتی ہے معاصی کے ابتلاء سے اور سکون آتا ہے راہ محبوب میں رنائے محبوب کی خاطر تکلیفیں اٹھانے سے۔ اور یہ سکون ترقی کر کے اس درجے پر پہنچ جاتا ہے کہ اس میں لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور یہ لذت ہی ہے کہ مضطرب و بے چین لبوں پر یہ تمنا آجاتی ہے۔

وَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِي سَبِيلِ
اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلَ -

مجھے پسند ہے یہ بات کہ راہ مولیٰ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مجھ پر اللہ جل شانہ کا بڑا انعام ہے پہلی بار بھی اور اس بار بھی بڑی ترقی ہے اور بہت سیر و سیاحت ہے روح لذت کی جن سرشاریوں سے دوچار ہے اس کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں۔ میں قربان جاؤں ذات قدوس جل جلالہ کے کہ مجھ پر کیسی مہربانی کی اور اپنے قریب کرنے کے لئے غیب سے کیسی امداد فرمائی۔ فلله الحمد ولله الشکر۔

پہلی بار تین ماہ میں اپنی کم مانگی کی وجہ سے جو چیز ہاتھ نہ آئی تھی وہی اللہ اب قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس دفعہ عرصہ چھ ماہ کا ہے۔

یقیناً کامل ہے کہ بے پایاں عنایات ہوں گی۔ رحمتیں ہوں گی اللہ جل شانہ

اپنی لگن اور دل کی فادوئوں میں اپنی محبت کا سوز عطا فرمائے یہی باقی ہے اور
اس کے سوا سب فانی ہے۔ زاد آخرت بننے کی اسی میں صلاحیت ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

بنام حضرت مولانا محمد حسین صاحب فاضل دیوبند خطیب جامع چاہ جٹان سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

مورخہ ستمبر ۱۹۵۳ء

اللہ پاک کی یاد میں بہتات اور دوام، آیت قرآنی وَتَبْتَئِلُ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا
میں یاد الہی کے سو دمنہ ہونے کے لئے مبالغہ اور تدریج کی شرطیں
تبئیل کی انواع اور ان کا اصطلاحی نام، دعوت اور دعویٰ میں فرق،
غزود تقویٰ سب سے خوفناک مرض ہے، دعوت کے فرائض و اجبات
اور مستحبات، انسان صرف حیوان ناطق نہیں بلکہ ایک ذمہ دار
اخلاقی وجود ہے، قرآن نے امت کو نیکی کی دعوت سے نہیں دعویٰ
سے منع کیا ہے۔

عزیزم! سلمکم اللہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آج تم یاد آئے زندگی کے سانس الحمد للہ نہ صرف بہتر بلکہ بہترین گذر رہے
ہیں۔ اتنے بہترین جو بہتوں کے لئے شاید سامان رشک ہوں ایسا رشک کہ تمنائیں
کریں اور گڑگڑا کر یہاں پہنچنے کی دعائیں کریں۔ ہر روز اللہ جل شانہ سے قرب ہو
رہا ہے زبان ہر آن ذکر اللہ سے مرطوب رہتی ہے الحمد للہ۔

یقین مانو یہ نعمت عظمیٰ باہر نصیب نہ تھی اور ایک عرصہ سے باوجود
کوشش کے ہاتھ نہ آتی تھی اللہ جل شانہ کی عنایت سے یہاں اس
راہ کی ساری مشکلیں حل ہو رہی ہیں۔ خدا سے دعا کرو کہ ذکر اسم رب
کے مطالبے کی پابجائی میں دو باتیں نصیب ہوں۔ بہتات اور دوام۔
قرآن کے اشارات سے یہی ٹپکتا ہے سورہ مزمل میں تم نے یہ آیت بار بار
پڑھی گی۔

واذکر اسم ربك وتبتل الیہ تبتیلًا

یاد کر اپنے رب کے نام کو اور کٹ جا اس کی طرف کٹ جانا

اسم رب کے ساتھ تثبیل کی جو قید لگائی گئی ہے وہ بڑی ہی معنی خیز ہے پھر تثبیل کے ساتھ تثبیل کی قید اس سے زیادہ اور پھر فعل اور مصدر کا وزنی اختلاف خلاف قیاس بہت زیادہ گہری معنویت رکھتا ہے شائد

مدارج میں اسلام کے مشہور محقق حافظ ابن القیم نے اس اختلاف کی طرف ایک چلتا سنا اشارہ کیا ہے یاد پڑتا ہے لکھا ہے کہ تثبیل تفعیل ہے۔

اس کا خاصہ میالغہ ہے۔ اور تثبیل تفعیل ہے۔ اس کا خاصہ تدلیج

ہے۔ آیت کا حاصل یہ ہے کہ ذکر اسم رب بہتات کے ساتھ دیر تک

اور لگاتار ہو تو مفید و مطلوب ہے تثبیل یعنی انقطاع ایک جنس ہے

اس میں ساری انواع داخل ہیں۔ یعنی تثبیل عن الہوا جس۔ تثبیل عن الخواطر

تثبیل عن اللذائذ۔ اور یہی انواع ہیں۔ جنہیں اصطلاحی زبان میں تقلیل طعام

تقلیل کلام، تقلیل منام اور تقلیل احتلاط مع الانام کہتے ہیں۔ ان چار

میں بہتات ہو اور عرصہ دراز تک ہو تو ذکر اسم ذات رنگ پیدا کرتا

ہے۔ اسی رنگ کے پیدا ہونے کے بعد تسلیم و توکل کی صفات ظاہر ہوتی

ہیں۔ شاید رب المشرق والمغرب لا الہ الا هو فاتخذہ وکیلاً

کے مفہوم میں اسی طرف اشارہ ہے۔ مفہوم کی قید اس لئے لگا رہا ہوں۔

کہ یہ آیت کا مدلول اور منطوق نہیں ہے۔

بہر حال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ذکر اللہ دوام اور بہتات کے ساتھ

عجیب نعمت ہے یہ راہ خود بہت ہی عزیز ہے۔ مگر راہ نوردی میں

رہبر کامل کے بغیر بہت ہی مشکلات ہیں۔

اچھا اب رخصت ہونا ہوں تقریباً پونے دس بجے ہیں کھانا کھا چکا

ہوں نہ بھتی ہوئی دال ماشن کھائی ہے۔ مولوی حبیب احمد نے پکائی
تھی کچھ گسرتھی مولوی صاحب زاد چاہتے تھے۔ مگر افسوس کہ میں تصنع نہ کر سکا اگرچہ
میری صاف گوئی ان کی کچھ دل شکنی کا باعث ہوئی۔ اسے کاش وہ نہ پوچھتے
اور نہ میں کسر کو ظاہر کرتا اللہ مجھے معاف کرے۔

آج رات بھی کچھ بد مزہ گزری تہجد کو آنکھ نہ کھلی۔ ایک خواب بھی
بارہ بجے دیکھا کہ کسی جگہ پانی میں ہوں ایک سرکش گھوڑا اپنے مالک سے
بگڑا اور سرپٹ پانی کی طرف آیا مجھے دیکھ کر مجھ پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔
خود اس کے مالک ہی نے شور مچایا میں چپ رہا۔ مالک نے گھوڑے
کو مار کر میری طرف سے ہٹا دیا۔ الحمد للہ بیدار ہوا تو لا الہ الا اللہ
رب العرش الکریم پڑھا۔ مولوی حبیب احمد جو بیدار ہوئے
ان کو خواب سنایا انہوں نے بھی بے ساختہ الحمد للہ کہا۔

بد مزگی کی کہانی بھی سن لو۔ میں نے لیٹے لیٹے اپنے ایک رفیق
سے کہا ہم تین ہیں۔ اور تینوں مزاج کے اعتبار سے مختلف، مولوی
حبیب احمد کی طبیعت میں تازگی اور اس تازگی کا ظہور ان کی حسن پسند
طبیعت سے ہوتا رہتا ہے۔ غلام محمد صاحب آزاد منشی آدمی ہیں
رات کو لیٹے لیٹے ان سے کہا کہ اب باہر جا کر کسی برائی میں حصہ نہ لینا
بات طول کھینچ گئی اور بد مزگی ہو گئی۔ توبہ و استغفار کی پچھتایا کہ
بات کا آغاز کیوں کیا تھا تصور اپنا تھا بات کہنے کا انداز غلط، داعیانہ
اور حکیمانہ نہیں بلکہ اندازہ حاکمانہ تھا۔ کوفت ہوئی اور نیت داڑھی گئی
پھر آنکھ لگی پھر کھلی۔ اسی کشمکش میں تہجد سے محروم ہو گیا۔ یہ ساری آفت
اپنے متعلق ایک بڑی غلط فہمی سے ہوئی اپنے کو عالم سمجھا بلکہ نفس کے

چھپے چور نے اپنے تئیں تقویٰ کی انراہٹ دیکھی۔ طاعت اور بندگی کا سب سے خوفناک مرض غرور تقویٰ ہے۔ بہت بڑی انسانی زندگی آج گناہوں کا شکار صرف اس لئے ہے کہ ارباب علم کا انداز سخن غلط ہو گیا دعوت کا نہیں بلکہ دعویٰ کا ہو گیا اللہ ہم پر رحم کرے۔ کتنے ہی دل ہیں جو صرف ہماری اس غلط روش کی وجہ سے محروم ہدایت ہیں۔ جب بھی داعی مدعی کے مقام سے بولتا ہے دعوت کی روح سرپیٹ کر بیٹھ جاتی ہے اور بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ نہیں بلکہ غلط نتائج پیدا کرتی ہے۔ ہدایت کی جگہ ضلالت، سعادت کی جگہ شقاوت ابھرتی ہے۔

شاید شیخ زادہ نے امر بالمعروف کے فرائض، واجبات، سن اور مستحبات شرح شریعتہ الاسلام میں قلم بند کئے ہیں۔ بڑی کٹھن منزل ہے۔ لوگوں کو دعوت کی ضرورت کے ساتھ اس کی نزاکت کا احساس نہیں ہے۔ حالانکہ اصلی کامیابی کا راز اسی میں ہے۔

افسوس ہے کہ لوگ اپنے کو دعوت کے مقام سے بچانے کے لئے عموماً قرآن کی یہ آیت تلاوت کر دیتے ہیں۔

لَمَّا تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ

حالانکہ اس آیت میں دعوت سے نہیں بلکہ دعویٰ سے منع کیا گیا ہے۔ دعوت یہ کہ تم کسی سے نماز پڑھنے کی درخواست کرو اور دعویٰ یہ کہ تم نماز نہیں پڑھتے ہو اور کہتے ہو کہ نمازی ہوں۔ قرآن کو دعویٰ پسند نہیں ہے۔ قرآن نے شواہد کے معائب میں سب سے بڑا عیب یہی بتایا ہے کہ

إِنَّهُمْ لَقَائِلُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ

وردہ جہان تک دعوت کا تعلق ہے۔ یہ تو قرآن کا قائم کردہ وہ فریضہ

ہے جس کا امت سے مطالبہ ہے۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ

امام رازی فرماتے ہیں کہ سن بیان یہ ہے اور ترجمہ یوں ہے۔ چاہیے کہ ہو یعنی تم ایک ایسی امت ہو لوگوں کو نیکی کی دعوت دے۔ اس خیال کی بھی کوئی قیمت نہیں کہ نیکی کی دعوت کے لئے پہلے نیک ہونا ضروری ہے نیکی کی دعوت دینا خود مستقل فریضہ ہے۔ اور نیک ہونا الگ چیز ہے۔

یاد پڑتا ہے کہ ملا علی قاری محدث نے شرح بدء الامالی میں لکھا ہے کہ نیکی نہ کرنا ایک گناہ اور نیکی کی دعوت نہ دینا دوسرا گناہ ہے۔ چونکہ ایک گناہ کہہ رہے ہیں اس لئے ضرور دوسرا گناہ بھی کریں گے۔ یہ کوئی عقل کی بات نہیں ہے پوری تفصیلات چاہتے ہو تو احیاء العلوم، مجالس البراہین اور شرح شریعت الاسلام کا مطالعہ کرو۔

تلاوت قرآن طویل قراءت کے ساتھ، نماز اور لا الہ الا اللہ کی

پابندی کرو کہ اس عالم میں کام آنے والی چیزیں یہ ہیں۔

عزیز! یہ جہان فانی ہے یہاں کی ہر چیز مٹ جانے والی ہے۔ آخرت ہی توجہ کی چیز ہے اسی کا یقین انسان کو اس زندگی میں ایک ذمہ دار اخلاقی وجود بنانا ہے اس تصور سے الگ ہو کر انسان مناطقہ کے حیوان ناطق کے سوا کچھ نہیں۔ بے قیادی اور اباحت مطلقہ اس کے اثرات ہیں۔ اور بس۔ سلجھانے کی گتھی دنیا نہیں آخرت اور صرف آخرت ہے دنیا دار فنا ہے یہاں آنا رہنے کے لئے صرف چند روزہ ہے اور اصلی گھر آخرت بنانے کے لئے ہے۔

میرے عزیز! یہاں سے لگی ہوئی بھوک کا مداوا روٹی سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ روٹی بھیک سے بھی مل سکتی ہے اور یہاں پیٹ پتوں سے بھی بھر سکتا ہے۔ آہ بند و بست تو اس بھوک کا ہونا چاہیے جس کا مداوا کوئی نہیں اور جہاں کوئی غذا بھوک کو دور نہ کر سکے گی۔

لَا يُغْنِي عَنْ جُوعِ

الغرض

لَا عِيشَ إِلَّا عِيشَ الْآخِرَةِ

دھیان کی چیز آخرت ہے۔ اور اس کے لئے یہاں ایمان کے ساتھ عمل صالح کی ضرورت ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی کو بھی معمولی نہ سمجھو۔ بلکہ خدا کا شکر کرو کہ اس نے کرنے کی توفیق دی پھوٹے سے پھوٹے گناہ کو معمولی نہ سمجھو بلکہ توبہ کرو اور استغفار پڑھو۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

بنام۔ مولوی حافظ محمد شریف قاسمی مدرس دارالعلوم الشہابیہ مالک مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

مورخہ، ستمبر ۱۹۵۳ء

قرآن کی بیان کردہ وحی کی دو قسمیں، اتباع وحی اور تلاوت وحی میں فرق، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد و استنباط اور اس بارے میں قرآن کی ہدایت، قرآن کی زبان میں وحی سے دو چیزیں مراد ہیں ایک ما اراک اللہ اور دوسری ما انزل اللہ حدیث ابو سعید خدریؓ کا صحیح موقف، حدیث کی حضور انور کی جانب سے اجازت۔

صدیقی شوکت صاحب

حیرت ہے کہ اس قدر جلدی کیوں موعوب ہو جاتے ہو بات سنو سننے کے بعد دلیل کی ترازو میں تولو اور سوچو کہ کیا کہا گیا ہے۔ کیوں کہا گیا ہے۔ صرف اتنی سی بات سے پریشان ہو گئے ہو کہ ”قرآن حکیم سے باہر وحی کوئی نہیں قرآن سے باہر وحی ہونے کی قرآن میں کوئی سند نہیں۔ قرآن میں واضح طور پر موجود ہے کہ وحی وہی ہے جو قرآن میں اور جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔“

میں تو سمجھتا تھا کہ تم قرآن کا سمجھ کر مطالعہ کرتے ہو گے مگر مجھے بہت گہرے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تمہارے تاثرات دیکھ کر میری امیدوں پر اوس پڑ گئی میں محسوس کرتا ہوں کہ ایک دفعہ خود قرآن کی مدد سے اصل بات تک تمہاری رسائی ہونی چاہیے۔

اتنی بات تو تم جانتے ہو کہ قرآن حکیم نے خود وحی کے بارے میں جس چیز پر جگہ جگہ زور دیا ہے وہ صرف دو باتیں ہیں ایک وحی کا اتباع

دوم وحی کی تلاوت -

قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر اتباع وحی کا جس انداز سے مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس پر غور کرو۔ سورہ انعام پارہ مکہ میں ہے۔

رَاتَّبِعْ مَا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ

تو چل اس چیز پر جو وحی کی گئی ہے۔ تیری طرف تیرے پروردگار کی جانب سے۔

سورہ یونس کی آخری آیت ہے۔

رَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ

تو چل اس چیز پر جو وحی کی گئی ہے تیری طرف اور صبر کر یہاں تک کہ فیصلہ کر دے اللہ اور وہ بہترین فیصلہ ہے۔

کچھ آیات وہ ہیں جن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا موقف بیان کیا ہے

إِنِّ اتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ - (سورہ انعام)

میں صرف اس چیز کا پیرو کار ہوں جس کی میری طرف وحی آتی ہے

سورہ یونس میں ہے۔

إِنِّ اتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ

رَبِّيَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ

میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں

اپنے رب کا نافرمان ہوں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات میں جہاں بھی وحی کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ بلا قسید حکم

دیا ہے کسی بھی قسم کی کوئی قسید نہیں لگائی نہ زمان کی اور نہ مکان کی اور نہ کوائف کی

اور ایسے موقع پر جب نبوت کا ذکر آیا ہے۔ تو مَا اَوْحَىٰ اِلَيْكَ كِي جگہ خود ذات نبوت کو دکھا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ
فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ
يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ

کہدو! اگر تم اللہ سے محبت کرتے
ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے پیار کرے گا
اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔

اِتَّبِعُونِي میں یاے متکلم کا مصداق خود ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اور اس کے ذریعے قرآن نے امت سے آپ کی اتباع مطلق کا مطالبہ کیا ہے یعنی یہ فرمایا ہے کہ ذات نبی کی اتباع کرو لیکن یہ نہیں فرمایا کہ زندگی کے کس گوشے میں کرو۔ خود ذات نبی کو مَا اَوْحَىٰ اِلَيْكَ کی جگہ لانا بتا رہا ہے کہ نبی کی ذات کی اخلاق، افعال اور اعمال میں پیروی ما اوحی کی پیروی ہے۔ خیر یہ مہوٹ ذرا تفصیل طلب ہے کہنا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن نے جہاں بھی کئی اتباع کو بتایا، یا تا بہر تہ اتباع و وحی کو بتایا ہے بلا قید اور بلا وصف ہی بتایا ہے قرآن کے اوراق تمہارے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ کوئی لکی ڈھکی بات نہیں دیکھ لو جہاں بھی وحی کی اتباع کا ذکر ہوگا بے قید ہوگا۔ لیکن اس کے برعکس قرآن ہی میں ما اوحی کی تلاوت کا جہاں بھی ذکر آیا ہے۔ وہاں الکتاب کی ضروری قید کا اضافہ کیا گیا ہے۔

سورہ کہف میں ہے۔

وَاقْلُ مَا اَوْحَىٰ اِلَيْكَ
مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا
مَبْدَلًا لِّكَلِمَاتِهِ وَ
لَنْ تَجِدَ مِنْ دُونِهِ
مُلْتَحَدًا

اور تلاوت کر جو کچھ وحی کی
گئی ہے تیرے رب کی کتاب سے
نہیں ہے کوئی بدلنے والا اس
کی باتوں کو۔

اکیسویں پارے کا آغاز بھی یہی ہے -

اتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ

الْكِتَابِ - گئی تیری طرف کتاب سے -

ان آیات کو پڑھئے اور بار بار پڑھئے کسی بھی ترجمہ کی مدد سے ان میں ما اوحی الیک کے ساتھ من الکتاب کے طور کو دیکھئے۔ قرآن میں جہاں بھی تلاوت کا ذکر ہے وہاں کتاب کا بھی تذکرہ ہے صرف وحی کے ذکر میں تلاوت کہیں بھی مذکور نہیں ہے۔ مثلاً سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ میں ہے -

الَّذِينَ اتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ

يَتْلُوْنَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ

سورہ فاطر میں ہے -

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ

وَاقَامُوا الصَّلَاةَ - بلاشبہ وہ لوگ جو کتاب الہی کی تلاوت کرتے ہیں اور انہوں نے نماز قائم کی -

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اتباع کے مطالبہ پر صرف ما اوحی کہنا اور تلاوت کے موقع پر کتاب کی ضروری قید کا اضافہ کرنا صاف بتا رہا ہے۔ کہ وحی کتاب ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ کتاب سے باہر بھی وحی ہے جس کی پیروی کی جانی چاہیے۔ اس کی تائید سورہ نساء کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں فریق ثبوت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے -

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ

بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ - بیشک ہم نے نازل کی تیری طرف کتاب حق کیساتھ ہے تاکہ تو فیصلہ کرے لوگوں کے درمیان اس چیز سے جو اللہ کو دکھائی

یقیناً اس آیت میں ما اراک اللہ الکتاب سے الگ چیز ہے اور یہ قرآن ہی سے

پیش پا افتادہ مسائل کیلئے آپ کا اجتہاد اور استنباط ہے۔ حافظ ابن القیم نے

ما اذراك الله (جو دکھائے آپ کو اللہ) کی تعبیر میں ایک لطیف نکتہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہاں ہمارا ایت (جو دیکھیں آپ) اس لئے نہیں فرمایا کہ دین کے معاملے میں اطاعت خدا و رسول کی ہے۔ حتیٰ کہ رسول بھی یہاں اپنی ذاتی رائے نہیں رکھتا، یہاں رسول کا دیکھنا بھی خدا کے دکھانے کے تابع ہے۔ اسی کے مطابق آپ فیصلہ کرتے تھے اور جو کچھ فیصلہ فرماتے تھے اس کا ماننا ایمان کی ناگزیر شرط تھی۔

فَلَا وَرَبِّكَ إِلَّا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُخَيَّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ قرآن کی زبان میں وحی سے ما اذراك الله اور ما انزل اليك دونوں مراد ہیں۔ اور قرآن میں اسی کے اتباع کا حکم ہے۔ لیکن تلاوت کا حکم صرف ما انزل اليك اور الكتاب ہی کیلئے ہے اور چونکہ الكتاب کی تلاوت میں تعبدی حیثیت غالب ہے اسی لئے اس کو تغلیباً قرآن کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی پڑھنے کی چیز۔

یہیں سے اس حدیث کا مفہوم بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابوسعید خدریؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور جس کے متعلق شور مچانے والے شور مچاتے رہتے ہیں کہ حدیث کے لکھنے اور جمع کرنے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

حدیث سن لیجئے!

عن ابی سعید الخدریؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تکتوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحه۔

حضور انورؐ نے فرمایا ہے کہ مجھ سے قرآن کے سوا نہ لکھو۔ اور جس نے قرآن کے سوا لکھا ہو وہ اسے مٹا دے۔

مجھ سے حدیث روایت کرو اور یاد رکھو

وحدثنوا عنی ولا یرج و من

کذب علی متعدد افلیتتوا
یو شخص جانکر میرے خلاف جھوٹ

مقعداک من النار۔
اڑائے گا اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

اس حدیث میں جس چیز سے روکا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ تعبدی طور پر قرآن کے
علاوہ پڑھنے کی کوئی چیز نہ لکھو۔

اصل میں لفظ غیب سے پہلے اس کا موصوف محذوف ہے اور خود قرآن میں بھی کئی
مقامات پر ایسا ہی ہے۔ مثلاً من یتبع غیر صبیل المؤمنین اصل میں یوں تھا۔
من یتبع سبیلہ غیر سبیل المؤمنین

اسی طرح حدیث کی اصل عبارت یوں تھی۔ لا تکتبوا عنی قرآنا غیر القرآن
یعنی مجھ سے قرآن کے علاوہ پڑھنے کی کوئی چیز نہ لکھو کیونکہ جس چیز کی تلاوت
وقراءت تعبدی ہے وہ صرف کتاب ہے آسمان کے نیچے اور کوئی کتاب نہیں
ہے۔ جس میں تعبد ہو ورنہ تلاوت سے الگ ہو کر صرف تحدیث کی تو خود اس حدیث
میں حدّ ثوا عنی سے اجازت ہو رہی ہے اس لئے تحدیث کی یا کتابت کی ممانعت
اس حدیث سے کھینچ تان کر نکالنا خود ارشاد نبوت کو منشاء نبوت کے خلاف استعمال
کرنا ہے۔

الغرض مقصد یہ ہے کہ اتباع کے موقع پر صرف ما اوحی کہنا اور تلاوت میں
ما اوحی کے ساتھ من الكتاب کا اضافہ کرنا اس بات کی صاف اور واضح دلیل ہے
کہ ما اوحی البک کی دو قسمیں ہیں۔ مثلثو۔ اور غیر مثلثو
جہاں تک اتباع کا تعلق ہے۔ اس میں مثلثو اور غیر مثلثو دونوں یکساں
ہیں۔ کیونکہ قرآن نے بلا استثناء اتباع کا مطالبہ کیا ہے۔ اور جہاں تک تلاوت
کا تعلق ہے وہ صرف مثلثو کی کجائی ہے۔
والسلام علیکم ورحمة اللہ

ہمام خانہ، شوکت علی صاحب صدیقانی، اے۔ بی۔ ٹی محلہ، اسی شہیدان سیکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۵۳ء

قرآن میں بیان کردہ علائق محبت اور ان سے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ، ہمارے یہاں دین دنیا کے تابع ہے۔ اور صحابہ میں دنیا دین کے تابع تھی۔ ہمارے دین اپنانے کی کیفیت، نماز چھوڑنے پر نبوت کی وعید، دینی زندگی کی الٹی ہوئی بساط اور اس کی تصویر، دنیا اور اس کی تمام دولت سامان عبادت ہے۔ حکومت مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ، خالص دیوانی قوانین میں تذکار قیامت، زبان قلم یا زبان دہن سے نکلے ہوئے الفاظ کا حکم۔

السلام علیکم

صدیقی قاضی صاحب

نماز اشراق سے فارغ ہوا ہوں پونے چھ بجے ہیں۔ آسمان ابر آلود ہے رات ایک بجے بارش آئی بسترے اٹھائے اندر آگے موسم بڑا ہی خوشگوار ہے۔ تم یاد آئے ہو اسی کی تلافی خط سے کر رہا ہوں تمہاری یاد کے ساتھ تمہاری باتیں بھی یاد آ رہی ہیں۔ اس لئے نہیں کہ میرے لئے ان باتوں میں کوئی پیغام ہے بلکہ اس لئے کہ یہ تمہاری سادگی اور بھولے پن کی آئینہ دار ہیں۔

تم ہر چیز کو خالص دنیا دارانہ نقطہ نظر سے دیکھتے ہو دنیا داری خود غلط نہیں ہے صحابہ کرام بھی دنیا دار ہیں ان کے ساتھ بھی نفس کے تقاضے، شکم کی الجھنیں اور کام و دہن کی لذتوں کی تمنائیں تھیں مگر یہ سب دین کے تابع ہو کر تھیں جب اور جس جگہ دین ان کے مقابلے پر آتا ان کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑتا۔ قرآن نے ان کو سمجھایا بھی یہی تھا۔ سورہ براءت میں محبت کے سارے علائق کی ایک فہرست دی ہے۔ اور ان علائق کی اپوزیشن

اللہ ورسول اور خدا کی راہ میں جان کھپانے کو قرار دیا ہے لوگے ہاتھ دینے
 علاقہ سن لو۔ والدین، اولاد، بیوی، خاندان، دولت و سرمایہ، تجارت
 و دوکان، مکان، ان سے ولی لگاؤ کا نام دنیا ہے۔ ایک دنیا دار ان کے
 پیچھے دیوانہ وار بھاگتا ہے۔ مگر قرآن میں اب تک اللہ جل شانہ کی یہ حدائے

غریب موجود ہے۔
 ۱۱۶۶
 أَحَبُّ إِلَيْكَ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ
 فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ

مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کی خاطر جدوجہد
 کے مقابلے میں تمہیں یہ چیزیں پیاری ہیں۔ یعنی ان کی خاطر تم اللہ کا اللہ کے
 رسول کا کہا نہیں مانتے اور دین کے لئے قربانی نہیں کرتے تو پھر انتظار کرو۔
 ایک دوسری جگہ پر یہ بتاتے ہوئے کہ انسان کو خواہشوں سے پیارا ہے۔ اور
 یہی خواہشیں اسے پھلی معلوم ہوتی ہیں۔ خواہشوں کی فہرست میں عورتوں، بچوں، دولت
 کے دلربا اشیاء، مولیشی اور زراعت کو درج کر کے بتایا ہے کہ
 ذَالِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْهُ

پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا ہے اور کہا ہے کہ آپ ان لوگوں کو
 بتا دیجئے جن کے دامن خدا کی نافرمانی کے داغ سے آلودہ نہیں ہیں کہ اس متاع سے
 بہتر وہ متاع ہے جو اللہ جل شانہ کے پاس ہے اور یہ جنات تجسسی من تحتھا
 الا نهار وازواج مطہرات ورضوان من اللہ ہے۔

ہم میں اور صحابہ کرام میں فرق ہے تو صرف یہ کہ یہاں دنیا مقصود ہے۔ اور دین
 تابع ہے ہم دین کو اور اسلام کو صرف اس حد تک اپنائے اور قبول کرتے ہیں جس حد
 تک دنیا ہمیں اجازت دیتی ہے۔

آہ! اگر نماز جو دین کا سب سے بڑا ستون ہے۔ آج ہماری کمائی۔ ہماری تعلیم، ہماری ملازمت اور ہمارے کھیل میں دو کاٹ بنتی ہے تو اسے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مسلمان ہوتے ہوئے اسلام کے گھر سے کان پکڑ کر نکال دیا جاتا ہے اور نکالی دینے کے بعد پیغمبر کی وہی امت جو کبھی پیغمبر کی زبان سے نماز چھوڑنے والوں کے بارے میں یہ روح گسیل پیغام سنتی تھی کہ

مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعِدًّا فَقَدْ كَفَرَ

شاید بانی نے بجائے ہیں اور اسلام زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہیں۔ اس پر پس نہیں بلکہ اس خدا کی نافرمانی اور خالص نافرمانی کو کلمہ پڑھا کر اسلام میں داخل کر لیا جاتا ہے۔

میرے عزیز! اسلام کے ساتھ یہ طرز عمل صرف زندگی کے ایک گوشے میں نہیں بلکہ پوری کی پوری زندگی میں ہے۔ دین کی پوری بساط الٹی ہوئی ہے۔ دنیا کی مقصودیت ہم پر اس درجہ غالب ہے کہ ہم اس کے خلاف کچھ سنا بھی گوارا نہیں کرتے حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ دنیا و مافیہا ہمارے لئے ہے اور یقیناً ہمارے لئے لیکن ہم اس دنیا میں دنیا کے لئے نہیں بلکہ اللہ جل شانہ کے لئے ہیں۔ دنیا کی تخلیق کا مقصد ہماری منفعت ہے اور ہماری تخلیق کا مقصد صرف اللہ جل شانہ کی عبادت ہے اور یہ عبادت زندگی کے ایک گوشے میں نہیں بلکہ سارے گوشوں میں مقصود ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند نے اپنے کسی مکتوب میں لکھا ہے کہ انسان عبادت کیلئے ہے اور دنیا انسان کیلئے اس لئے دنیا جب تک سامان عبادت بنی رہے اور انسانی زندگی کے مقصد تخلیق میں خادم کی حیثیت سے رہے اس وقت تک حمت ہے۔ ورنہ یہ سراپا زحمت ہے۔

میرے عزیز! عقل بھی یہی کہتی ہے۔ روٹی پکانا مقصود ہوتا ہے۔ تو تو، چٹنا، چولہا وغیرہ

خادم کی حیثیت سے فراہم کئے جلتے ہیں ورنہ یہ چیزیں خود مقصود بالذات نہیں ہیں۔
 یا فلاسف کیسی بے عقلی ہے کہ زندگی میں نہ عبادت کا آٹا چھانا جاتا ہے نہ گودھا جاتا
 ہے اور نہ روٹی پکانے کا ارادہ ہوتا ہے مگر بازار سے وہ چیزیں لائی جا رہی ہیں جو مقصود کیلئے
 وسائل ہیں۔ آہ زندگی کے سارے گوشوں میں نظر مقاصد سے ہٹ کر صرف وسائل میں ٹنگ کر رہ گئی
 ہے صرف دنیا داروں کا نہیں بلکہ دین داروں کا بھی یہی حال ہے۔ دینی مدارس کو دیکھو کہ پہلے
 صرف و نحو کی کتابیں زبان دانی کا ذریعہ تھیں اور اسی حیثیت سے انکی تعلیم ہوتی تھی۔ اب معاملہ
 الٹ گیا۔ زبان دانی ختم ہو گئی صرف کتاب کا گھوٹنا اور ہر پہلو سے اس کے مصنف پر من مکنہ اعتراضات
 اور من گھڑت جوابات سوچنا رہ گیا ہے۔ اور جسے یہ چیز زیادہ آتی ہے۔ اسکی کتاب کی حد تک امامت
 مسلم ہے چاہے وہ زبان دانی میں صغریٰ کیوں نہ ہو۔

خالقا ہوں کو دیکھو کہ صوفیائے کرام نے جو اورداد، اشغال اور وظائف مقاصد کے وسائل کے
 درجے میں رکھے تھے آج وہ خود مقاصد ہیں۔ یاد رہے درد وہ کہلاتا ہے جو شیخ طریقت روحانی
 بیماری کو دور کرنے کے لئے پڑھنے کو بتائے۔

وظیفہ وہ کہلاتا ہے جو کوئی جسمانی بیماری یا مادی تکلیف کو دور کرنے کے لئے پڑھا جائے۔
 شغل وہ عمل کہلاتا ہے جس میں شیخ کیفیت مخصوص اور ہیئت مخصوص سالک کیلئے تجویز کرے
 مراقبے اسی میں داخل ہیں۔ ذکر الفاظ کا وہ مخصوص پیمانہ ہے جو جناب رسول اللہ صلی
 اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو۔

حکومت کو دیکھو کہ صحابہ کے زمانے میں یہ اسلام کی زندگی میں تابندگی کا ذریعہ تھی۔
 مگر آہ آج اسلام کی جگہ ہر باطل، ہر کفر، ہر ارتداد، ہر الحاد اور ہر زندقہ حکومت کے
 صدقے پھلتا اور پھولتا ہے۔ حکومت کا مقصد تو قرآن نے یہ بتایا تھا کہ

ان مکنا ہم فی الارض اقاموا

الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ

وامروا بالمعروف ونہوا عن المنکر

مگر آج معاملہ الٹا ہوا ہے نہ اقامت صلوٰۃ ہے اور نہ ایثار زکوٰۃ نہ امر بالمعروف ہے اور نہ نہی عن المنکر۔ بلکہ اس کے برعکس نماز کی جگہ بے دینی اور بددینی کی پڑوش ہو رہی ہے غلام سے لیکر ریڈیو کی مشین تک سے امر بالمنکرات کی علامت اور کھلم کھلا خدمت لی جا رہی ہے اور دنیا میں اسلام کی سب سے بڑی حکومت ہونے کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ **فان الله والى الله المذبتكى**۔ حکومت پر تنقید مقصود نہیں ہے۔ بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ وسائل نے مقاصد کی جگہ لے لی ہے۔ ذرائع منزل مقصود ہو گئے۔ اور مسافر راہ کی بوتلموں و لغزیدوں میں پھنس کر رہ گیا اتنا پھنسا کہ اب مرود زمان اور جہل و کوری سے اپنے مسافر ہونے کا بھی احساس نہیں رہا ہے دراصل یہ نتیجہ ہے آخرت کے بارے میں مطلع نظر غلط ہونے کا۔ اور جب بھی امتوں میں آخرت کے متعلق فکر و نظر نے غلطی کھائی یہی اور اسی قسم کے غلط نتائج پیدا ہوئے۔

یاد پڑتا ہے کہ تذکرہ الحفاظ میں حافظ ذہبی نے ابو اسحاق الفزاری کے حوالہ سے شیخ الاسلام امام اوداعی کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ صحابہ و تابعین میں پانچ چیزیں عام تھیں۔ لزوم جماعت، اتباع سنت، مساجد کی آباد کاری، تلاوت قرآن اور اللہ کے دین کی خاطر محنت کرنا۔ لیکن آہ اب دین چند سطحی رسموں کا نام رہ گیا۔ دینداری مٹ کر فن دینداری اور پیشہ دینداری نے جگہ لے لی۔

قرآن میں قصص انبیاء اور ایام اللہ کا غور سے مطالعہ کرو تو صاف معلوم ہوگا۔ کہ ہر برائی کی اصل بڑے عدالت الہی کے محاسبہ اور یوم جزا سے غفلت ہے۔ میں کبھی کبھی سوچتا کرتا تھا کہ سورہ البقرہ میں جہاں مالیاتی مسائل پر بحث کی ہے پہلے سورہ کا ذکر ہے۔ پھر قرآن کے لین دین کا تذکرہ ہے اور در بیان میں یہ آیت ہے۔

وا تقوا يوماً ترجعون فيه الى الله الخ

سوچنے کے باوجود جوڑ اور ربط سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ایک جمعہ عین تقریب کے دوران میں شرح صدر ہوا کہ آیت سوو کی بحث کے خاتمہ پر ہے اور خاتمتہ البحت یہ ہے کہ سوو کو حرام کر دینے کے بعد بتایا ہے کہ اگر مقروض تنگ دست ہو تو مہلت دو اور اگر معاف کر دو تو کیا ہی کہنے ہیں۔ اس کے بعد یہ آیت ہے بتانا یہ چاہتے ہیں کہ اگر تم یہاں اپنے محاسبہ میں آسانی کرو گے اور لوگوں سے رواداری کا برتاؤ کرو گے تو کل کو جب تم اپنا حساب دینے کے لئے چیکنگ کی خاطر پیش ہو گے اس دن سے ڈرو یہاں تم آسانی کرو گے۔ وہاں ہم حساب میں آسانی کریں گے۔

میرے عزیز دھیان کی چیز دنیا نہیں ہے آخرت ہے جہاں تولے اور ماشے کا نہیں بلکہ رتی رتی کا حساب ہوگا۔ زبان سے بولے ہوئے الفاظ جسم کا لبادہ پہن کر سامنے ہوں گے۔ زبان قلم سے نکلی ہوئی تخریب ہو جو ہوگی۔ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاید حضرت معاذؓ سے فرمایا تھا۔

رسول اللہ - الا ادلك بملأك الامر كلہ؟ کیا میں تم کو سارے معاملہ کی گانٹھ نہ بتا دوں؟

حضرت معاذؓ - یٰ اے رسول اللہ! ہاں اے اللہ کے رسول

رسول اللہ - کف لسانك اپنی زبان پر قابو رکھو۔

دبان نبوت سے نکلی ہوئی آواز سن کر کانپ گئے اور بولے

اٰنا لمواخذون بما نتكلم يا رسول اللہ؟

کیا ہماری اپنی گفتار پر بھی گرفت ہوگی یا رسول اللہ؟

فرمایا۔ تکلتك امك يا معاذ ما النار الا حصائد السمتم

واہ اے معاذ دوزخ تو زبان ہی کی لگائی ہوئی کھیتوں کا نام ہے۔

میرے پیارے اصل دنیا نہیں اصل تو آخرت ہے دنیا کے پیچھے وہاں تک چلو

یہاں تک اسوت کا فکر اجازت دیتا ہو۔ یہاں ہمیشہ رہنا نہیں ہے یہ وارفتاء نہیں وارفتاء ہے یہاں بندے بن کر رہنے والے وہاں کامیاب ہیں خواہ تمہاری نظروں میں کتنے ہی گم سے ہوئے ہوں اور حقیقت میں وہی دور اندیش ہیں۔ جو آگے کی زندگی کی تیاری میں ہیں۔ کیسی نا دور اندیشی ہے یہ کہ ساٹھ سالہ زندگی کے لئے یہ اہتمام یہ تگ و دو یہ دوڑ دھوپ اور آنے والی ابدی زندگی سے یہ غفلت۔ اللہ سے دعا کرو۔

اللهم لا عيش الا عيش الآخرة
 اللهم اني اسئلك لعيما لا ينفذ
 وقرّة عين لا تنقطع -
 آمين ثم آمين !

والسلام عليكم ورحمة الله

بتام جناب قاضی مقبول مجدد صاحب بی۔ اے محلہ دھارو وال سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۵۳ء

تقدیر کو برائیوں کے لئے آڑ اور خوبیوں کو اپنا کمال سمجھنا،
اللہ جل شانہ، کابندوں کے نام پیغام انسان مناسطہ کا حیوان نطق
نہیں بلکہ ایک ذمہ دار اخلاقی وجود ہے۔ اتباع سے مومن درجہ
مجبوریت پاتا ہے۔ گرد و پیش کے لحاظ سے دو حکم، اصطلاح شریعت
میں استغفار کی حقیقت۔ عفو کے لغوی معنی حفاظت کی دو صورتیں
عصمت اور حفظ۔ استغفار اور توبہ میں ایک لطیف فرق۔ اعمال
جنت میں داخل ہونے کا سبب ہیں۔ بدل اور قیمت نہیں ہیں۔
زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا تقویٰ ہے۔

السلام علیکم

عزیزی! سلمکم اللہ

تم ایم۔ اے کے سال اول میں کامیاب ہو گئے ہو گے اور خدا کرے کہ دوسرے
سال میں اسی طرح کامران رہو دنیا ظل ظلیل ہے۔ تم اب تعلیم کے ملک کی سیر کر کے
بارڈ پر پہنچ چکے ہو اللہ کا تم پر کتنا بڑا احسان ہے کہ حالات کی ساری ناسازگاریوں
اور واقعات کی لپری ناموافقتوں کے باوجود تم مولوی۔ مولوی عالم، مولوی فاضل،
مانشی فاضل، میٹرک، ایف۔ اے، بی۔ اے اور ایم۔ اے تک پہنچ گئے ہو کتنے ہی
سرمایہ داروں کے بچے ہیں جو سرمایہ کے نشے میں چور ہیں۔ لیکن جہل و گوری کی گود میں
کھیل رہے ہیں اسے کہتے ہیں۔ اللہ کا فضل۔

لوگ آجکل تقدیر کو برائیوں کیلئے آڑ اور بہانہ بناتے ہیں اور خوبیوں کو اپنا کمال
سمجھتے ہیں۔ صحابہ کرام خوبیوں کو منجانب اللہ کہتے تھے۔ اور برائیوں کو اپنی طرف منسوب
کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث قدسی میں اللہ جل شانہ، کا جو پیغام

بندوں کے زام لائے ہیں۔ غالباً اس کے الفاظ یہ ہیں۔

انما ہی اعمالکم احصیہا لکم
فمن وجد خیرا فلیمن اللہ
ومن وجد غیر ذالک فلا
یلومن الا نفسه

یہ صرف تمہاری ہی اعمال ہیں جن کو تمہاری خاطر
سمیٹنا ہوں یاد رکھو۔ جسے نیکی کی توفیق ملے اسے
اللہ کا شکر کرنا چاہئے اور جو کسی برائی کا ارتکاب
کرے اسے اپنے سوا کسی کو ملامت نہ کرنا چاہیے۔

العقد الفرید میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے حالات میں پڑھا ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کا خاتمہ ان
الفاظ پر کرتے تھے۔

ھذا مارای ابو بکر ان
کان حقاً فمن اللہ والامن
ومن الشیطان
یہ ابو بکر کی رائے ہے اگر حق ہو تو اللہ کی
جانب سے ہے ورنہ میری اور شیطان کی
جانب سے ہے۔

صحابہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقدیر کے بارے میں معلومات
مہم پہنچائیں تو بولے۔

افلا تنکل
کہا ہم رہ نہ جائیں یعنی کام نہ چھوڑ دیں۔

جو اب میں جو حکیمانہ بات ارشاد فرمائی سننے کے قابل ہے۔

اعملوا کل میسر لما
کام کرو ہر ایک کو اپنے اپنے مقدر

خلق له
کے لئے آسانی بہم پہنچائی جائے گی۔

دنیا جہد و جہد، سعی اور کوشش کا گھرانہ ہے یہاں سرگرم کارکن اور ان تھک
محنتی حیات جاوداں حاصل کر جاتے ہیں۔ نیکے اور اپاہج ہمیشہ ناکام رہتے
پیرد کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اچھائیوں کی نسبت اللہ جل شانہ کی طرف کرنی چاہیے
شانہ مدارج میں ایک حدیث ہے کہ

بزرگ چاہتا ہے کہ اللہ میں سے فلاں نیکی کی تو اللہ جل شانہ کہتا ہے کہ

اسے بندے میں نے تجھے توفیق دی۔ بندہ جب کہتا ہے کہ اللہ تو نے توفیق دی۔
 تو اللہ جل شانہ فرماتے ہیں کہ اسے بندے تو نے ارادہ کیا۔ اور کہا قال
 اللہ کی توفیق، تمہارے ارادے، تمہاری محنت اور سعی و کوشش کا نتیجہ آج
 تمہارے سامنے ہے بڑائی اور شادمانی دراصل محنت ہی کا ثمرہ ہے۔ شاہ عبدالحق
 نے اپنے متعلق لکھا ہے۔

چہ دود ہائے چراغ کہ در دماغ نہ رفت
 کدام بادہ محنت کہ در ایام نہ رفت
 کدام خواب و چہ آسائش و کجا آرام
 چہ خار خار کہ در بستہ فراغ نہ رفت
 بجز تم ز دل خود کہ عمر رفت و لے
 کنج غمگدہ ہرگز صحن باغ نہ رفت

بیس سال کی عمر میں تم نے تکمیل کر لی الحمد للہ علی ذالک
 اب تمہاری زندگی کا دوسرا مرحلہ سامنے ہے اگرچہ اللہ جل شانہ کی عنایت
 سے امید تو یہی ہے کہ جس طرح مرحلہ اول جو قرآن کی زبان میں لہو و لعب کا
 گوشہ ہے تعلیم میں گذرا اسی طرح دوسرا مرحلہ جسے زینت کہا ہے اور تیسرا مرحلہ جسے
 تقاضا اور پھر چوتھا مرحلہ جسے تکاثر فی الاموال والا ولاد کہا گیا ہے۔ یہ بھی
 اچھا اور بہترین گذرے گا مگر میرے عزیز انسان ایک ذمہ دار اخلاقی و بود کی حیثیت
 میں دوسرے جانداروں میں ممتاز ہے نہ کہ صرف ناطق کی حیثیت میں جسے مناطقہ
 کہتے ہیں۔ اور پھر انسان ہونے کے علاوہ ایک مسلمان کی زندگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
 سے وابستہ ہے۔ اسلامی فکر کے مطابق مرنے کے بعد جی اٹھنے اور اس زندگی کی
 رات رات کا حساب دینے کی ذمہ داری ہے اسی ذمہ داری پر آخرت کی نجات اور

ابدی فلاح کا دار و مدار ہے۔ اس ذمہ داری کا احساس یہاں جس قدر شدید ہوگا۔ اسی قدر یہاں تکلیفیں ہوں گی کہ

حفت الجنة بالمكاره جنت ناگوار لوگوں کے ساتھ ڈھانپ دیکھی ہے۔

اور

الدنيا سجن المؤمن دنیا مومن کا قید خانہ ہے۔

لیکن وہاں آرام ہی آرام اور راحت ہی راحت ہوگی۔

تکلیفیں مطلقاً مقصود نہیں شاید تم سوچو کہ میں تمہیں جوگ یا رہبانیت

کی طرف لیجا رہا ہوں اسلام تعذیب جسم کا نظریہ لے کر نہیں آیا بلکہ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اُس جہاں کی کامیابی رسالتِ آج کے اتباع سے وابستہ ہے اور اس اتباع کی راہ میں ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے یہ کہتے ہوئے کہ

رشته در گردنم انگندہ دوست ہر جا کہ می برد خاطر خواہ دوست

برداشت کرتے جانا ایمان کا تقاضا اور اسلام کی روح ہے اسی اتباع سے ایک مسلمان درجہ

قبولیت پر پہنچ جاتا ہے

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی اگر تم اللہ سے پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔

حبیبکم اللہ۔ اللہ تم سے پیار کرے گا۔

اور اسی سے مرتبہ عبدیت ملتا ہے جو تمام مراتب کمال سے بالا ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس دوسرے مرحلہ پر تمہاری زندگی کچھ ایسی اچھوتی ہو کہ لوگ دیکھ کر ہی اسلام یاد کر لیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ پورے اسلام کو اپنانے کیلئے اسلامی ماحول کی ضرورت ہے اسی ماحول اور گرد و پیش کے لحاظ سے قرآن میں دو حکم ہیں ایک جبکہ اس ماحول کے مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے جہاں کفر بازاروں میں، محفلوں میں، گھروں میں، تعلیم گاہوں اور مجلسوں میں تن کر چلتا ہے۔ فرمایا۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ جتنا بس میں ہے اللہ کی نافرمانی سے بچو
دوسری جگہ اس گروہ پیش میں رہنے والے مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے جہاں فضائل
اور ہواؤں میں اسلام سے فرمایا۔

اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ ایسا نافرمانی سے بچنے کا حق ہے بچو
کہنا یہ بچا ہوتا ہوں کہ زندگی کے ان گوشوں میں اسلام کی تم جیتی جاگتی تصویر بوجہ پر تمہاری
دسترس ہے یہی ما استطعتم کا مدلول ہے۔ اور جو تمہاری دسترس سے باہر ہیں ان کیلئے استغفار
کرو لیکن استغفار کو اسی عرف میں نہیں بلکہ اصلاح شریعت میں یعنی دل میں ندامت کے
احساس کے ساتھ خدا کی جناب میں معافی کی درخواست۔

استغفار صرف کردار اور گفتار کی غلطیوں سے نہیں کی جاتی بلکہ کام اور مطالبے میں
گونا گوں پر بھی ہوتی ہے۔ یہ غفر سے نکلا ہے۔ عام لوگ غفر کے معنی ڈھانپنے کے بتاتے ہیں
اور اسی لحاظ سے استغفار کے معنی پر وہ خواستن کرتے ہیں لیکن یہ غلط ہے غفر کے معنی حفاظت
کے آتے ہیں مغفرت کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سر کو تلوار کی مار سے محفوظ رکھتی ہے غفار پٹے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ
اڑا کو گرنے سے محفوظ رکھتا ہے اسلئے استغفار کے معنی حفاظت چاہنے کے ہیں۔ حفاظت دو طرح کی
ہوتی ہے ایک اعلیٰ اور ایک ادنیٰ۔ اعلیٰ یہ کہ بندے کو گناہ سے محفوظ رکھا جائے۔ ادنیٰ یہ کہ بندوں
کو پیش پا افتادہ معاصی کے نتائج سے محفوظ رکھا جائے۔ اعلیٰ یعنی بندے کو گناہ سے محفوظ رکھا جائے
اسکی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ بندے کے راستے سے گناہوں کو ہٹا دیا جائے اسے عصمت کہتے ہیں۔ یہ
خاصہ انبیاء ہے۔ دوم یہ کہ بندے کو گناہ کے راستے سے ہٹا لیا جائے اسے حفاظت کہتے ہیں یہ اولیاء
کیلئے ہے۔ اولیاء اللہ گناہوں سے محفوظ اور انبیاء گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں تفصیل دیکھتی ہو تو
مولانا شہید کا منصب امامت اور ابن القیم کا مدارج لکھو۔

بمیں استغفار پیش پا افتادہ گناہوں کے نتائج اور گناہوں دونوں سے بچنے کی کرنی
چاہیے اور سچ یہی ہے۔ کہ گناہوں سے وہ ہی بچائے تو بچ سکتا ہے۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا یہ جملہ کیسا معنی خیز ہے۔

اصحیح لی شافی کلہ لا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین
ان تکلنی تکلنی الی ذنب و عورۃ و خطیئة لا یغفر
الذنب الا انت۔

اے اللہ میرا حال ٹھیک کر دے مجھے مجھ پر آنکھ چھینکنے کی برابر بھی نہ چھوڑ
اگر تو مجھے چھوڑ دیا تو مجھ میں گناہ اور خطایں ہوں گی۔ پروردگار! گناہ تیرے
سوا بخشنے والا کوئی نہیں ہے۔

مدارج میں استغفار اور توبہ میں ایک لطیف فرق یہ بھی لکھا ہے کہ ماضی پر
استغفار اور مستقبل کے لئے گناہ نہ کرنے کا عہد توبہ ہے۔
اب قرآن کی آیت سنو۔

اَسْتَغْفِرُ وَاَرْبِبُكُمْ ثُمَّ تَوْبُوا اِلَيْهِ

تم اپنے مالک سے معافی چاہو اور توبہ کرو

بات کیسی سچ گئی اور بن گئی۔ رحمت حق جل شانہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے
کا بہترین ذریعہ استغفار ہے۔

لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو اللہ سب گناہ معاف فرما دے گا

میں اسی طرف اشارہ ہے اور یہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے

لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اَحَدٌ يَعْمَلُ بِاَعْمَالِنَا قَالَتْ وَاَنْتَ

يا رسول الله قال وما انا الا ان يتغمدني الله برحمته

کوئی بھی شخص اپنے عمل کے بدلے جنت میں نہ جائے گا حضرت عائشہ

نے کہا نہ آپ فرمایا نہ میں مگر کہ اللہ مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لے۔

تو اس کا اس کے سوا اور کیا مطلب ہے کہ جنت کروار و گرفتار کے گھمنڈ سے نہیں بلکہ رحمتِ حق سے ملے گی۔

شاید تمہیں وسوسہ ہو کہ قرآن میں تو جنت کو اعمال کی جزا قرار دیا گیا ہے۔ اور جگہ جگہ بماکانوا یعملون آیا ہے۔ جو بات بہت ہیں۔ مگر مجھے حافظ ابن تیمیہ کا جواب پسند آیا ہے۔ حدیث میں بجزملہ کی بار بار مقابلہ ہے۔ اور قرآن میں بماکانوا کی بار بار سبب ہے۔

مطلب یہ ہے۔ کہ اعمال جنت کی قیمت نہیں بلکہ دخول جنت کا سبب ہیں بہر حال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اب تمہارے پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا مرحلہ سامنے ہے۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے یہی زندگی کے سارے بگاڑ کا سرچشمہ ہے پھونک پھونک کر قدم رکھنا تقویٰ کے ٹھیٹھ اور واقعی معنی ہیں۔ حضرت عمر نے ابی بن کعب سے اس پر گفتگو کی تھی یہ مکالمہ ابن کثیر نے نقل کیا ہے۔

ما التقویٰ یا ابی قال اما سلکت طریقاً ذاشوک

قال عمار بلی قال ابی فما عملت هناك قال شمرت و

اجتهدت قال فذالك التقویٰ

اے ابی تقویٰ کیا ہے فرمایا کیا خاردار راستہ سے کبھی نہیں گزارے حضرت عمر نے کہا ہاں

ابی نے پوچھا وہاں کیا کیا؟ فرمایا احتیاط کی اور کپڑے سمیٹ لئے۔ فرمایا پس یہی تقویٰ ہے

یہ یا اسی کے لگ بھگ عبارت ہے اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے

پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا مطالبہ اگرچہ ساری زندگی میں ہے۔ لیکن جہاں

تک انفرادی زندگی یعنی تزکیہ نفس، اصلاح اخلاق اور درست اعمال کا تعلق ہے۔

اسے قرآن و سنت کے سانچوں میں ڈھال لینا تمہارے اختیار میں ہے۔ اس کے

بغیر انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں کوئی امتیاز نہیں۔ دنیا اور اس کی ترویج

میں خواہ کیسے ہی بلند مراحل پر پہنچ جاؤ مگر ایک روز بہر حال اسے ختم ہو جاتا ہے۔ بچپن سے جوانی اور جوانی سے پیری اور پیری سے موت کی منزل ناگزیر ہے۔ سلطان محمد تغلق شاعر تھا حالت نزع میں اس نے چند اشعار کہے ہیں۔

سیار دریں جہاں تپیدیم سیار نعیم و ناز دیدیم
اسپان بلند بر نشینیم ترکان گراں بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط و آخر پھل قامت ماہ نو خریدیم
کیسی اچھی تصویر ہے۔

عزیز من نہانہ پنجگانہ باجماعت کی پابندی اور کبائر سے اجتناب کے ساتھ اگر روزانہ صبح و شام رب اغفر لی و تب علی انک انت التواب الغفور سو سو بار کلمہ سوم سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر سو سو بار، دو و شریف سو بار۔ بعد نماز صبح تا طلوع تہلیل خفیہ اور بعد از طلوع تلاوت قرآن کو عادت کے درجہ میں اپنالو تو سمجھو کہ اللہ جل شانہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ بس اب رخصت ہوتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ

پنام جناب امین اللہ صاحب۔ دبیر ایم۔ اے پورہ ہیرا پورہ فیض مرے کالج سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۵۳ء

نبوت کے بارے میں مولانا محمد قاسم کا نظریہ، اوصاف کی قسمیں، نبوت بھی ایک وصف ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اوصاف کا موصوف ذاتی پر اختتام، وصف ذاتی لازوال اور امت ہوتا ہے۔ حضور انور کے لئے نبوت حادث ہے، حدوث اور مخلوق میں فرق، حدیث عائشہ کا مطلب، امت کی بعثت اور اس کے فرائض، مقام نبوت اور اس کی تشریح، خاتم النبیین سے حیات النبی پر استدلال، صرف یہ نہیں کہ نبی نہیں آئے گا۔ بلکہ نبی کا آنا آپ کے بعد عقلاً ناممکن اور محال ہے۔

تلمیذی العزیزہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

شائد آپ نے تخذیر الناس خود نہیں پڑھی دل نہیں مانتا کہ کتاب پڑھنے کے بعد آپ جیسا ذکی ان خیالات کا شکار ہو چھوٹی سی کتاب ہے۔ صرف چالیس صفحات کی۔ ایک دفعہ غور سے پڑھ لیجئے اطمینان دلانا تو میرے بس سے پاسر ہے اس کا تعلق دل سے ہے اور دل کا معاملہ اللہ جل شانہ کے قبضے میں ہے۔ بہر حال جو کچھ میں جانتا ہوں عرض کرتا ہوں۔ اور اس دعا کے ساتھ کہ یا مصرف القلوب صترف قلب... علی طاعة الحق۔ آپ تو کہہ رہے ہیں کہ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ ختم نبوت کے قائل نہیں مگر جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ کچھ اور ہے۔ صرف یہ نہیں کہ "نبی نہ آئے گا" کہ اسے تو سب ہی مانتے ہیں اور جانتے ہیں۔ مولانا کا نظریہ نبوت کے بارے میں اس سے بھی زیادہ اونچا ہے ان کا دعویٰ ہے کہ صرف آئے گا نہیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے بعد کسی اور نبی کا آنا ممکن ہی نہیں۔ فرمایئے کہ جو شخص امکان کی نفی کر رہا ہو اسے ہی وقوع کا مدعی بنا کر پیش کرنا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

لیجئے مولانا نے اسی تحذیر الناس میں بات یہاں سے شروع کی ہے۔

۱۔ اوصاف دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ذاتی اور عرضی۔ موصوف ذاتی کا وصف

عائد زاد اور اصلی ہوتا ہے۔ اور موصوف عرضی کا وصف موصوف ذاتی سے مانگا ہوا

اور مستعار ہوتا ہے۔

۲۔ موصوف عرضی میں اوصاف کا خواہ کتنا ہی تعدد ہو مگر سب موصوف ذاتی پر ختم

ہو جاتے ہیں اور کسی وصف عرضی کا کوئی بھی سلسلہ کبھی موصوف بالذات سے

متجاوز نہیں ہوتا۔

نبوت ایک وصف ہے نبی اس کا موصوف ہے عقلاً ضروری اور ناگزیر ہے

کہ چلے اس وصف کے موصوف کتنے ہی متعدد ہوں مگر ایک موصوف بوصف

نبوت بالذات ہو اور باقی موصوف بوصف نبوت بالعرض۔ مولانا قاسم العلوم نے

تحذیر الناس میں دعویٰ کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی وصف

نبوت کی موصوف بالذات ہے اور دوسرے انبیاء موصوف بالعرض ہیں سب کی نبوت

آپ کا فیض ہے اور آپ کی نبوت کسی کا فیض نہیں۔ یہ دعویٰ کر کے مولانا نے

سمجھنے والوں کے لئے اس کے دلائل کی طرف بھی اشارات کئے ہیں فرماتے ہیں۔

کہ جس طرح موصوف عرضی کے سارے اوصاف بہت کچھ پھیلاؤ کے باوجود موصوف

ذاتی پر ختم ہو جاتے ہیں اور آگے سلسلہ بند ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح یہ

بات بھی طے شدہ اور مسلم ہے کہ اوصاف ذاتی اپنے موصوف سے جدا نہیں

ہو سکتے اور اوصاف عرضی اپنے موصوف سے جدا ہو سکتے ہیں مثلاً چار کیلئے جفت،

تین کیلئے طاق، شمع کیلئے نورانی جسم کیلئے مکانی اور حرکت کیلئے زمانی مدنگ کیلئے

مرئی اور آواز کے لئے مسموع ہونا وصف ذاتی ہے کسی زمانے میں اور کسی موقعہ پر بھی ان سے یہ اوصاف جدا نہیں ہو سکتے ہوتے نہیں بلکہ اوصاف ذاتی کا اپنے موصوفوں سے جدا ہونا ممکن ہی نہیں ہے برخلاف اوصاف عرضیہ کے کہ وہ قابل زوال ہوتے ہیں جیسے زمین کی دھوپ، آئینہ کی چمک، کپڑے کی سپیدی۔ الغرض اوصاف اصلیہ اور خانہ زاد ائمٹ ہوتے ہیں ان کا اصلی اور خانہ زاد ہونا ہی اس کی دلیل ہے۔

یہ قاعدہ سننے کے بعد سمجھئے کہ نبی کریم صلی اللہ وسلم موصوف بوصف نبوت ذاتی ہیں اور دوسرے انبیاء موصوف بوصف نبوت عرضی ہیں۔ اور وصف کا اپنے موصوف ذاتی سے جدا ہونا نامکن ہے اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آجانے کے بعد کسی نبی کا آنا نامکن ہے یعنی وصف نبوت آپ کی ذات سے الگ ہو کر وجود کی گود میں کہیں پایا نہیں جاسکتا اسی کی طرف حدیث ۱۹ بنی بعدی میں اشارہ ہے اور اسی سے یہ بات بھی نکل آئی کہ چالیس سال کی عمر میں مکہ معظمہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ وصف ذاتی ہونے کی وجہ سے حادث ہے۔ مخلوق نہیں ہے۔ حدوث اور خلق میں تھوڑا سا فرق ہے تفصیل کا موقعہ نہیں دونوں میں عموم و خصوص کی نسبت ہے زید قائم میں صفت تہیام زید کے لئے حادث ہے زید قیام کا خالق نہیں ہے نبوت کا تعلق براہ راست اللہ جل شانہ کی صفت علم سے ہے اور یہی صفت اس کی مرئی ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ صفات باری میں صفت علم کا مقام کیا ہے اور خود عرفاء بھی کہتے ہیں کہ مرئی ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تعین اول ہے یعنی اللہ جل شانہ کی صفت علم و علمک ما لم تکن تعلم و کان فضل اللہ علیک عظیم میں اسی طرف اشارہ بھی ہے۔

کوئی مانے یا نہ مانے اپنا خیال یہی ہے کہ ذات رسالت علم خداوندی سے بے واسطہ

مستفید ہے اور علم پر صفات خاکہ کا اختتام ہے۔ اس لئے آپ پر نبوت کا اختتام ہے اور نبوت آپ کیلئے عالم میں حادث ہوئی ہے۔ ہمیں صرف اس کے حدوث کا پتہ ہے اور اسی کی تاریخ سے ہم واقف ہیں ہمیں مخلوقیت کی تاریخ کا پتہ نہیں ہے صرف اتنا بتانے والے نے بتایا ہے کہ اول ما خلق اللہ نوری او كما قال نتیجہ یہ کہ آپ عبائے نبوت پہننے سے پہلے ہی نبی تھے۔ شاید حدیث عربا ض میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے انی عند اللہ مکتوب خاتم النبیین اور کنت نبیا وادم بین الماء والطين او كما قال۔

اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ چونکہ ایک موصوف ذاتی کیلئے موصوف بالعرض متعدد ہوتے ہیں اس لئے مختلف گوشوں اور مختلف وقتوں میں انبیاء موصوف بوصف نبوت بالعرض متعدد آئے ہیں اور چونکہ وصف عرضی اور موصوف عرضی موصوف بالذات کی فرع ہوتے ہیں اور موصوف بالذات اوصاف عرضیہ کی اصل ہوتا ہے۔ اور مقصود بالذات وجود میں موصوف بالذات ہی ہوتا ہے۔ مثلاً روٹی کہ موصوف بالذات ہونے کی وجہ سے مقصود بالذات ہے اور تو، چمٹا، چوٹھا، نگرہی، آگ موصوف بالعرض ہیں اور غیر مقصود۔ لیکن شہود و ظہور میں موصوف بالذات سے مقدم ہیں اسی طرح انبیاء جو موصوف بالعرض ہیں ظہور میں موصوف بالذات سے مقدم ہیں اور حسب طرح موصوف بالذات کے ظہور کے بعد موصوف بالعرض ختم کر دیئے جاتے ہیں جیسے روٹی تیار ہونے کے بعد چوٹھے کی آگ بجھا دی جاتی ہے اور کسی موصوف بالعرض کی طرف توجہ نہیں رہتی بلکہ توجہات کا مرکز موصوف بالذات ہو جاتا ہے اسی طرح موصوف بوصف نبوت بالذات کے ظہور کے بعد انبیاء کی اطاعت و اتباع بھی ختم کر دی گئی اسی کی طرف نوکان مونسى حبا وبتعمروا وَنُرَكِّمُوْنِي نَفْلًا لَّكُمْ صَلَاةً لَا بُعِيْدُ اِمْبِيْن اِشَارہ ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی مشہور کتاب الخیر الکثیر میں بڑی بڑی حدی سے یہ بات کہی ہے۔

تعلق بات موسیٰ لوکان بعد رسول اللہ صلیا وسلمہ الا الاتباع

اسی سے اس بات کا تعلق ہے کہ اگر حضرت موسیٰ حضور کے بعد زندہ ہوں تو ان کو حضور کی

اتباع کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اور یہیں سے ایک بات اور بھی سمجھ میں آتی ہے کہ موصوف بالذات میں وصف کبھی مؤثر اور

کبھی علت ہوتا ہے مثلاً آفتاب کی روشنی اپنے موصوف آفتاب کا اثر ہے اور دنیا میں روشنی اور

گرمی کی آفتاب علت ہے۔ ستارے چمک رہے ہیں ہفتاب رات کی تابدیکی میں چاندنی تانے ہوئے

ہے یہ آفتاب کا اثر ہے۔ پانی گرم ہو رہا ہے کھیتیاں پک رہی ہیں۔ زمین تپ رہی ہے

آدمی اور جانور پسینے سے تھرا پور ہو رہے ہیں۔ آفتاب اسکی علت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم چونکہ موصوف بالذات ہیں ضروری ہے کہ آپ میں یہ دو باتیں ہوں ایک جگہ وصف نبوت

مؤثر بن کر آئے اور دوسری جگہ یہی وصف نبوت اپنے موصوف کی علت بن کر آئے اور یہ

بھی معلوم ہے کہ اثر اپنے مؤثر سے اور علت اپنے معلول سے کبھی جدا ہو کر نہیں آتا۔

یقیناً اور بلاشبہ ذات نبوت میں دونوں حیثیتیں موجود ہیں۔

ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ آفتاب جب تک لگا ہوں سے پوشیدہ رہتا ہے۔ مؤثر اور حیثیت

میں مقام غیبت پر اثر انداز رہتا ہے آفتاب پوشیدہ ہے مگر ستاروں کی چمک اور چاند

کی ہفتابی آفتاب کے اثر سے اپنا کام کر رہی ہے یہ اثر اپنے مؤثر سے قطعاً جدا نہیں ہے۔

موصوف بوصف نبوت بالذات کے آفتاب نبوت طلوع ہونے سے پہلے انبیاء کا موصوف

بوصف نبوت بالعرض بن کر آنا آفتاب نبوت کا اثر ہے۔

غالباً مستدرک حاکم میں جو حدیث آتی ہے خواہ وہ سند کے لحاظ سے کیسی ہو اس

میں اسی طرف اشارہ ہے۔

اول ما خلق اللہ نوری سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا فرمایا ہے

اور یہ پہلے معلوم ہو چکا کہ موصوف بالذات کے لئے موصوف بالعرض چند در چند

ہو سکتے ہیں مگر متاثر ہونے کی صورت میں موصوف بالعرض متعدد ہونے کے باوجود خارجی طور پر محدود اور محدود ہوں گے۔ دیکھ لیجئے۔ صبح کو آفتاب نکلنے کے بعد روشنی جو کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے معلول ہونے کے درجے میں اس کی علت آفتاب ہے جب موصوف بالذات پیغمبر کا آفتاب نبوت طلوع ہوا تو اس گرمی اور روشنی ایمان کی علت ذات نبوت نے اپنے معلول میں جو کچھ کام کیا وہ سب کے سامنے ہے شاید طلوع آفتاب ہی کی مناسبت سے حضرت عائشہؓ نے نبوت سے پہلے واقعہ بیان کرنے کے لئے فلق الصبح کی تعبیر اختیار کی تھی۔ غالباً بخاری کی حدیث میں حضرت عائشہؓ کے یہ الفاظ پڑھے ہیں۔

فَكَانَ لَا يَدْرِي رُبِّيَّ إِلَّا جَاءَ
 آپ جو خواب بھی دیکھتے صبح کو

مثل فلق الصبح۔
 سپیدہ صبح کی طرح سچا ہوتا۔

دیکھئے آفتاب ظہور کے بعد جب علت موثرہ کی حیثیت اختیار کرتا ہے تو معلول تعدد کے باوجود محدود اور محدود نہیں ہوتا بلکہ اس میں ہمہ آن اور ہمہ وقت وحدت ہی وحدت نظر آتی ہے اس کی ضیا پاشی بلا تیز یکساں طور پر ہوتی ہے ایسے آفتاب نبوت نے بھی طلوع کے بعد بالکل یہی حیثیت اختیار کی ہے۔ قرآن نے شاید اسی حیثیت کو بیان کیا ہے۔

وَمَا أَسْأَلُكَ إِلَّا كَافَّةً
 ہم نے آپ کو سب لوگوں کے لئے

لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا
 بشیر و نذیر بنا کر روانہ کیا ہے۔

جس آفتاب کے لئے علت ہونے کی حیثیت میں معلول بالعدد نہیں ہوتا۔ اسی طرح آفتاب نبوت کا یہی معلول علت ہونے کے وقت میں بالعدد نہیں رہا۔ یاد رکھئے اور خوب سمجھ لیجئے کہ جس طرح موثر ہونے کی حیثیت میں متاثر موصوف بالعرض ہوتا ہے اسی طرح علت ہونے کی حیثیت میں معلول بھی موصوف

بالعرض ہوتا ہے۔

موصوف بالعرض متاثر ہونے کی حیثیت میں محدود ہوتا ہے اور تغرد والفرادیت ہوتی ہے اور جب یہی موصوف بالعرض معلول بن کر آئے تو جمہوریت اور عمومیت کا لبادہ پہن کر آتا ہے موصوف بوصف نبوت بالذات نبی کریم آفتاب نبوت طلوع ہونے سے پہلے موثر ہونے کی حیثیت میں ہیں اور متاثرین ستاروں کی طرح محدود ہیں۔ جس طرح ستاروں کی چمک میں تفاوت ہوتا ہے۔ اسی طرح انبیائے سابقین موصوف بوصف نبوت بالعرض متاثرین میں فرق مراتب تھا۔ قرآن میں اسی طرف اشارہ ہے

تِلْكَ الرَّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ
عَلَىٰ بَعْضٍ - یہ پیغمبر ہیں ہم نے ان کو باہم ایک
دوسرے پر فضیلت دی ہے۔

اور جس طرح آفتاب کے طلوع کے بعد علت کی حیثیت میں معلول بالبعد کے لئے علت نہیں ہوتا بلکہ اس کا علت ہونا سب کے لئے یکساں ہوتا ہے اسی طرح آفتاب نبوت کے طلوع ہو جانے کے بعد معلول بالبعد کو ختم کر دیا گیا اور ایسے معلول نے اس کی جگہ لی جو کما اور این کی قید سے نہ صرف ناآبشتا بلکہ مانوس ہے اسی وجہ سے قرآن نے آپ کو خاتم النبیین کہا ہے۔ نتیجتاً وہی نبوت جس کے موصوف بالعدد متاثر ہونے کی حیثیت میں آتے تھے اب بھی قائم ہے مگر اب اس کا موصوف معلول ہونے کی حیثیت میں بالعدد نہیں ہے بلکہ پوری امت ہے۔

قرآن کو غور سے پڑھئے آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے ان تمام فرائض کو امت کا فرض قرار دیا ہے۔ جو نبی بوصف نبوت بالذات دیتا تھا۔ مثلاً ایمان، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دعوت الی اللہ، تبلیغ، شہادت علی الناس وغیرہ وغیرہ یہ امت کے وہ فرائض ہیں جن کی ادائیگی کے لئے قرآن نے امت محمدیہ کو برپا کیا ہے یہ اوصاف بالذات تو نبی کریم میں پائے جاتے ہیں مگر بالعرض اور بالاتباع امت میں نہ صرف قائم رکھے

گئے ہیں بلکہ ان کے قائم رکھنے کے لئے ہی امت برپا کی گئی ہے بالفاظ دیگر نبوت کے اوصاف کی امت موصوف بالعرض اور بالتبع ہے مگر فرق ہے تو صرف یہ کہ آفتاب نبوت محمدی نکلنے سے پہلے جب نبوت محمدی موثر کی حیثیت میں تھی اور انبیاء موصوف بالعرض متاثر تھے اور گئے چنے تھے اور نبوت محمدی کے آفتاب طلوع ہو جانے کے بعد آفتاب نبوت علت کے درجہ میں ہے اور امت اس کا معلول ہے اور معدود نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے اسی طرف الخیر الکثیر میں اشارہ کیا ہے

فَهَذَا كَانَ شَمْسًا وَاحِدًا یہاں اپنی بزرگی میں ایک ہی
فِي جَلَالِنَا آفتاب ہے

موصوف بالعرض دونوں جگہ ہے ایک جگہ متاثر ہے اور دوسری جگہ معلول ہے متاثر ہونے کی صورت میں ستاروں کی طرح معدود ہے اور معلول ہونے کی حالت میں غیر معدود ہے لیکن دونوں جگہ نبوت ہی کی بعثت ہے۔ متاثر بھی مبعوث تھا۔ اور معلول بھی مبعوث ہے۔ متاثر میں انفرادیت تھی اس لئے نبوت کا انتظالی اطلاق ہوتا تھا معلول چونکہ اجتماعیت کا لبادہ پہن کر آیا ہے اور طلوع آفتاب کے بعد آیا ہے اس لئے نبی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ شاہ ولی اللہ ہیجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔

وَاعْتَمِدُوا الْأَنْبِيَاءَ شَانًا مَنْ انبیاء میں بلحاظ مرتبہ سب سے اونچا
لَهُ نَوْعٌ آخِرٌ مِنَ الْبَعْثَةِ وہ شخص ہے جو ایک اور بعثت
أَيْضًا۔ کا بھی حامل ہو۔

اور جس طرح آفتاب نکلنے کے بعد آفتاب یکساں طور پر چمکتا ہے یہ معلول کی اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد ہے کہ علت سے کتنا اور کیا فائدہ اٹھائے۔ آئینہ، پینٹل، لوہا، مٹی، کاغذ سب پر دھوپ تو یکساں پڑتی ہے اور علت سب کے لئے ایک ہے لیکن ہر معلول فائدہ اٹھانے میں اپنی استعداد و قابلیت کے بلحاظ سب سے الگ الگ ہے

اسی طرح آفتاب نبوت بھی یکساں طور پر روحانی ضیا پاشی کر رہا ہے اور فائدہ اٹھانے والے اپنی اپنی استعداد کے مطابق فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان ہی فائدہ اٹھانے والوں میں ایسی تیز صلاحیت والے بھی ہوتے ہیں کہ دھوپ سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ نہ صرف خود گرم ہوتے ہیں بلکہ اپنے اثر سے اوزوں کو بھی گرمادیتے ہیں۔ شاید زبان نبوت نے صحابہ کرام کے بارے میں اسی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے

اَصْحَابِي كَالشَّمْسِ بَاطِحَةٍ
اِقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ
صحابہ ستاروں کی طرح ہیں۔ جن کے پیچھے چارے گئے راہ پاؤ گے۔

یہیں سے ایک بات اور بھی سمجھ میں آتی ہے جس سے آپ جان لیں گے کہ امت کو کار نبوت سپرد کرنے کے باوجود نام نبوت سے کیوں محروم کیا گیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ضروریات وصف کی ضرورت صرف موصوف بالذات کو ہوتی ہے اور وصف کے آثار و نتائج سے موصوف بالذات اور بالعرض دونوں ہمادوش ہوتے ہیں۔ مثلاً ریل میں بیٹھنے والے ریل میں بیٹھے ہیں۔ حرکت ریل میں ہوتی ہے تو متحرک بیٹھنے والے بھی ہوتے ہیں اور ریل جب چلتی ہے تو ریل میں بیٹھنے والے ضرور چلتے ہیں مگر چلنے اور حرکت کرنے کی نسبت موصوف بالذات یعنی ریل کی طرف ہوگی اور موصوف بالذات ہی کو ان افعال کا فاعل اور مستدالیہ قرار دیا جائے گا۔ نہ کہ موصوف بالعرض کو یہی ماجرا نبی کے اوصاف میں ہے۔ موصوف تو سب ہیں مگر نبی بالذات ہے اس لئے قاعدے کے مطابق نبی کا اطلاق موصوف بالذات ہی پر ہوگا نہ کہ موصوف بالعرض پر۔ لیکن نام کے مخصوص ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وصف نبوت کے آثار و نتائج سے امتی ہمادوش نہ ہوں گے بلکہ امت کو وصف نبوت کے آثار و نتائج سے بواسطہ موصوف بالذات اسی طرح حصہ ملے گا۔ جس طرح ریل میں بیٹھنے والوں کو بواسطہ ریل حرکت کا حصہ ملتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں الحیر الکثیر میں شاہ صاحب

فَكَذَلِكَ بَعْدَ تَمَثُّلِهِ فِي
مَوْطِنِ الْوُجُودِ الْحَدِيثِ
امْتِنَعَتْ تَلْقَى حَقِيقَةً مَامِنَ
الْحَقَائِقِ كَمَا لَا يَمِينُ قَبْلَ نَفْسِهَا

ایسے ہی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے کارگاہ وجود میں آنے کے
بعد کسی بھی کمال کا حاصل ہونا
ذات خود بغیر ترجمان محال ہے

بلا ترجمان۔

اسی طرف اشارہ ہے جو کچھ مولانا قاسم العلوم کی زبان سے ہم اب تک علمی مقدمات
کے ذریعے سن رہے ہیں۔ یعنی موصوف بالذات آجانے کے بعد اب کسی موصوف بالعرض
کا بالعدوانا ناممکن ہے۔ حرف بحرف شاہ صاحب نے بھی امتناع کے لفظ میں وہی
بات کہہ دی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہہ آیا ہوں کہ آفتاب نبوت نکل آیا ہے استعداد اور
صلاحیت شرط ہے ضیا پاشی ہو رہی ہے اور ہر جگہ ہو رہی ہے۔ رات نہیں ہے کہ واحد
بالعدو کی حیثیت میں ذرا سی چمک کی ہر متاثرہ نمائش کر سکے جیسا کہ ہوتا رہا ہے۔ دن
ہے اور کڑا لکے کی دھوپ نکلی ہوئی ہے اور واحد بالعدو کی ہستی کو

صَدَّ ذَٰلِكَ بِأَبِ الْنُبُوَّةِ اس نے نبوت کا دروازہ بند کر دیا

کہہ کر ختم کر دیا ہے اور صرف ختم نہیں بلکہ واحد بالعدو کی تلقی حضرت شاہ ولی اللہ
صاحب کے لفظوں میں ممنوع اور ناممکن ہوگی۔

امتنع ان یکون بعداً نبی ناممکن اور محال ہے کہ آپ کے بعد

مستقل بالتلقى (الخیر الکثیر) کوئی مستقل نبی ہو۔

شاہ صاحب کی عبارت میں استقلال سے دھوکے میں نہ پڑ جائیے۔ یہ مطلب
نہیں کہ مستقل نبی نہیں آئے گا۔ لیکن نبی کا تابع بن کر آئے گا۔ بعض کج بینوں کو یہ دھوکہ
ہو چکا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وصف نبوت کا موصوف بالعرض واحد بالعدو نہ ہوگا۔

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ شاہ صاحب ہی نے فرمایا ہے

فَمَا طَارَ طَائِرٌ مِنْ أَوْلَىٰ اجْتِنَاةٍ
 كَوْنِي بِرِزْدَةٍ خَوَاهُ كَيْسِي هِيَ اسْتَعْدَادٌ وَرُكْنًا هُوَ
 اسْتَعْدَادٌ إِلَّا وَقَعَ فِي شَبَكَةِ
 تَرْبِيَّتِهِ جَذْبًا إِلَىٰ نَفْسِهِ
 كَجَذْبِ الْبُخْنِ طَائِسٍ
 بِالْحَدِيدِ
 جب بھی اڑے گا تو اس کا مقام آپ
 کے تربیتی جال کے سوا کوئی نہیں
 آپ اسے اپنی طرف اس طرح کھینچتے
 ہیں جیسے مقلطیس لوہے کو۔

اسی کو عرفاء کی اصطلاح میں مقام نبوت کہا جاتا ہے۔ شیخ اکبر نے المحکم المکرر لفظ
 میں مقام نبوت کی جو تعریف کی ہے کہ

اعلم ان مقام الدعوة الى
 الله هو مقام النبوة
 لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کا نام
 مقام نبوت ہے۔

ختم نبوت ہوئی ہے، مقام نبوت ختم نہیں ہوا۔ بالفاظ دیگر انبیاء نہ آئیں گے
 انبیاء کا کام ہو گا یہ کار نبوت ہی مقام نبوت ہے شیخ اکبر ہی نے لکھا ہے کہ

وهو مقام النبوة والوراثة
 الكاملة المحاصل فيه يقال
 له النبي في زمان النبوة و
 يقال له الشيخ والاستاذ
 والواثر في حق العلماء بالله
 من غير ان يكونوا انبياء۔
 یہی مقام نبوت ہے اور یہی وہ
 وراثت کاملہ ہے کہ اس کے باربر وار
 کو زمانہ نبوت میں نبی۔ اور علماء کے
 حق میں شیخ اور استاذ کہا جائے۔ یہ
 علماء نبوت کا کام کرتے ہیں۔ مگر
 نبی نہیں ہوتے۔

بازاروں میں شور ہے کہ شیخ اکبر نے فتوحات میں ختم نبوت کا انکار کر دیا ہے
 مقام نبوت کی حقیقت شیخ کی زبانی آپ سن چکے ہیں اب ذرا ایک چھپتی نظر شیخ
 اس عبارت پر ڈال لیجئے جس کو اجمالاً جارہا ہے۔

ان النبوة التي انقطعت
بوجود رسول الله انما
هي نبوة التشريع لامقاها
جو نبوت حضور انور کی آمد سے ختم
ہوئی ہے وہ منصب نبوت ہے
نہ کہ مقام نبوت۔

فرمانے لا مقاہا کا کیا مطلب ہے جسے میں کار نبوت کہتا ہوں۔ شیخ اسے
یہی مقام نبوت کہتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک تو اس امت کے خیر امت ہونے کی
علت ہی اس امت کا مقام نبوت پر کھڑا ہونا ہے آخر آپ

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ
لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔
تم بہترین امت ہو۔ پیاگئے گئے ہو
لوگوں کے لئے حکم کرتے ہو تم
نیکی کا اور برائی سے روکتے ہو۔

کے لئے مطلب کا کون سا جامہ تراشیں گے۔

دیکھئے بات کہاں تھی اور کہاں پہنچ گئی۔ کہاں یہ مزعومہ کہ مولانا محمد قاسم ختم نبوت
کے قائل نہیں اور کہاں مولانا کا یہ فکر بلند کہ ختم نبوت صرف یہی نہیں کہ اب بالفعل
کوئی نبی نہیں آئے گا بلکہ نبی کے آنے کا امکان ہی نہیں ہے ایک بات ذہن میں آئی
ہے وہ بھی سن لیجئے وہ یہ کہ وصف نبوت بالعرض کا موصوف بالعد نہیں آئے گا
اور نہ آسکتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود وصف ناپید ہو چکا ہے بلکہ مطلب یہ ہے
کہ اس وصف کا موصوف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کہیں بالعد نہ موجود ہو سکتا
ہے اور نہ ہوگا قرآن نے آپ کو خاتم النبیین کہا ہے خاتم النبوة نہیں کہا۔ نبی موصوف
بوصف نبوت کو کہتے ہیں۔ وصف قائم اور موجود ہے اس کی موجودگی کی خود آیت
دلیل ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ
رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ
محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاریسے رسول
میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن

وَخَاتَمِ النَّبِيِّينَ
اللّٰہ کے رسول اور آخری نبی ہیں

دلیل عقلی یہ ہے کہ موصوف بالذات اپنے وصف سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا جیسے کہ پہلے عرض کر آیا ہوں اگر واقعہ یہ ہے تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ نبوت کا موصوف ذاتی بقید حیات بھی عالم تبردخ میں غنصری ہو۔ قرآن سے بھی کچھ اسی طرح کا اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ موضوع تفصیل طلب ہے میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مولانا قاسم العلوم نے صرف یہ نہیں بتایا کہ نبی نہیں آئے گا بلکہ یہ بتایا ہے کہ نبی کا آنا ممتنع اور ناممکن ہے۔

عربی زبان سے تو آپ آشنا ہیں کہ عربی میں ممنعات، یقینیات اور مشکوکات کو جب تعبیر کرنا چاہیں تو اسالیب مختلف ہیں۔ ممنعات کے لئے لو یقینیات کے لئے اذا اور مشکوکات کے لئے ان آتا ہے۔

سب مانتے ہیں کہ الہ حقیقی کے سوا دوسرے الہ کا وجود ممتنع ہے اس لئے اس امتناع کو قرآن میں ان لفظوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا۔

فلاسفہ اسلام کی اصطلاحی زبان میں جس دلیل کا نام دلیل تمانع ہے وہ اسے قرآن کی اس آیت پر منطبق کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ مجھے ان کی اس تفسیر سے اختلاف ہے۔ پھر حال عربی زبان میں لو ممنعات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ سکا کی کی مفتح العلوم میں ہے۔

إِنَّمَا يَتَّعَلَقُ بِمَا أَمْتَنَعُ بِأَمْتِنَاعٍ غَيْرِهِ عَلَى سَبِيلِ الْقَطْعِ

لیکن عربی زبان کی طرح اردو زبان میں ممنعات کے لئے الفاظ کا لفظ پہا پیمانہ نہیں ہے۔ لفظ اگر اردو میں مشکوک اور ممتنع دونوں میں مشترک ہے۔ اردو میں جب اگر کو ممنعات کے لئے بولیں گے تو یا بفرض یا بفرض محال کا اضافہ کریں گے۔

مولانا قاسم العلوم کے خیال میں چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصف نبوت میں
 موصوف بالذات ہونے کی وجہ سے کسی اور نبی کا آپ کے بعد آنا ممنوع، محال اور
 ناممکن ہے۔ اس لئے اس امتناع کو ظاہر کرنے کے لئے پیرایہ تعبیر یہ اختیار کیا ہے
 کہ — ”اگر بالفرض آپ کے زمانے میں ہی الخ“

و السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ڈنٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۷ ستمبر ۱۹۵۲ء

انکار حدیث کے فتنے کو پرویزی فتنہ کہنے کی علمی توجیہ، یہ بات کہ وحی قرآن
ہی میں محدود ہے خود قرآنی تصریحات کے خلاف ہے، نبی صاحب کتاب کو
نہیں بلکہ صاحب وحی کو کہتے ہیں، آغاز بخاری میں آیت وحی لانے کی وجہ
مصادر و مظاہر عمل سے وحی کا تعلق، نبی شناسی کا اخلاقی اور نوعی پیمانہ،
قرآن کی رو سے قرآن کے لئے بیان کی ضرورت ہے۔ قرآنی وحی اور وحی سنت
کے نزول کی صورتیں۔ امام ابو محمد الجوبینی کا بصیرت افروز بیان، ممانعت
کتابت کے متعلق حدیث ابوسعید کا مطلب، وحی کی تلاوت اور اتباع میں فرق

تلمیذی العزیز! السلام علیکم ورحمتہ اللہ

جو بات آپ نے پوچھی تھی اس کا مختصر سے مختصر جواب بھی ہو سکتا

ہے مگر اجال، اختصار اور اشارات سے بات آپ کے پلے نہ پڑے گی۔ اس لئے
قدرے تفصیل ضروری ہے۔

آپ نے انکار حدیث کے فتنہ کے لئے ”پرویزی فتنہ“ کا عنوان خوب تجویز کیا
یاد پڑتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے ۱۰ ہجری میں جب مختلف ملکوں
کے سربراہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کئے تو سربراہ ایران کے نام بھی ایک دعوتی
خط روانہ کیا تھا۔ اس سربراہ حکومت کا نام تاریخ میں خسرو پرویز ہے۔ حکومت کی
وسعت کا حال یہ تھا کہ ایک طرف اگر ہندوستان تک علاقہ تھا تو دوسری طرف عراق
عجم، شام اور روم کے قلب تک دامن سلطنت پھیلا ہوا تھا اور دمشق کا دیار نہ
صرف ایران بلکہ روم کے اکثر علاقوں پر بھی لہا رہا تھا۔ یہ چھٹی صدی کا آغاز تھا۔
۶۱۶ء میں رومیوں نے اگرچہ اپنا علاقہ واپس لے لیا تھا۔ مگر تاہم ایرانی حکومت

کا وید بہ ایشیا و یورپ دونوں پر قائم تھا ایران کی حکومت ایشیا کی سب سے بڑی حکومت تھی اور جیسی حکومت تھی ویسی ہی دربار حکومت کی بھی شان و شوکت تھی۔

آداب شاہی کے طریق، درباریوں کے درباری لباس، شاہی ہاڈی گاڑڈ کی پرہیزت سجاوٹ، شاہی ہاڈی گاڑڈ یعنی اسب سوار جو عربی میں بگڑ کر اساورہ بن گیا۔

۴۲۹ یعنی ۸۰۰ھ ہجری میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خط روانہ

کیا سفارت کی ذمہ داری حضرت عبداللہ بن حذافہ کے کاندھوں پر ڈالی گئی۔ اس گرامی نامہ میں خسرو پرویز کو دعوت اسلام دی گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن حذافہ کو ہدایت کی تھی کہ اولاً خط بحرین لے جائیں اور حاکم بحرین

سہ بلاذری نے مسعر بن کدام کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ یوم قادسیہ میں رستم کی معیت میں چار ہزار افراد پر مشتمل ایک دستہ تھا جسے جند شہنشاہ کہتے تھے۔ اسی دستے نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو پیغام بھیجا تھا کہ ہم مسلمان ہونے پر راضی ہیں بشرطیکہ ہمارے یہ حقوق گورنمنٹ تسلیم کرے۔

الف:- جہاں چاہیں گے ہم رہیں گے۔

ب:- وظائف اور حکومت کی امداد میں ہمارا حصہ ہوگا۔

ج:- ہم جس کو چاہیں گے اپنا حلیف بنائیں گے۔ یہ اور اس قسم کی دوسری شرطیں لکھ کر

روانہ کر دیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے جواباً فرمایا کہ ہو جاؤ لکھنا و علیکم ما علینا مگر وہ

اس مادے سے جواب سے مطمئن نہ ہوئے حضرت ابو موسیٰ اشعری نے مرکز میں اور منٹ سے استصواب کیا۔

مرکز کی جانب سے ہدایات پہنچیں کہ جس قیمت پر مسلمان ہوں کہ لوہا اور البصرہ میں آباد ہوئے اور ان کی

آباد کاری کے لئے جگہ مقرر ہوئی۔ یہاں انہوں نے ایک نہر کھودی اسی نہر کو نہر اساورہ کہتے ہیں۔ بعد ازیں

یہی اساورہ کچھ غزنیہ بعد کوفہ میں آباد ہوئے و اتوا الکوفۃ و اقاموا بحاصت ان کی کہانی

بڑی طویل ہے۔ اساورہ یا جند شہنشاہ دونوں ایک ہیں اور ایران کا شاہی ہاڈی گاڑڈ

ہے۔

مسک اعتراف کا شجرہ علمی میری تحقیق میں ان ہی سے ملتا ہے۔

کے توسط سے خسرو تک پہنچائیں۔ آپ ہدایت کے مطابق بحرین پہنچے اور حاکم بحرین کے توسط سے آپ کی پرویز کے دربار تک رسائی ہوئی خط دربار میں ترجمان کے ذریعے پڑھوایا گیا۔ خط سنانا مقصود نہیں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ خط جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانب سے لکھوایا تھا۔ سارے خط میں نہ قرآن کا ذکر تھا نہ وحی کا۔ یہ آپ کا فاتی مکتوب تھا۔ خط کے آخری فقرے سن لیجئے۔

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ سجانہ کے سوا

وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللَّهِ إِلَى النَّاسِ

اللہ کوئی نہیں ہے اور میں سب انسانوں

كَافَّةً لِيُنذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا

کی طرف اللہ کا فرستادہ ہوں۔ زندوں کو

اسلم تسلم فان ابیت

آگاہ کرنے آیا ہوں۔ مسلمان ہو جاؤ

فَعَلَيْكَ إِثْمُ الْجَوْسِ

نجات پائے گا۔ نہیں مانے گا تو مجوسیوں

(طبقات)

کا بوجھ بھی تیری گردن پر ہوگا۔

خسرو پرویز نے گرامی نامہ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ تاریخ میں لکھی ہوئی بات ہے کہ پرویز نے طیش میں آکر گرامی نامہ کو پزے پزے کر دیا۔ یہ قرآن نہ تھا بلکہ ارشاد نبوت پر مشتمل گرامی نامہ تھا جس کے پزے پزے ہوئے وہ ارشاد نبوت یعنی حدیث تھی اللہ اکبر عالم وجود میں سب سے پہلے جس نے ارشاد نبوت کو پارہ پارہ کیا اور پائے استحقاق سے ٹھکرایا پرویز ہے۔ اور آج تاریخ کی مختلف کروٹوں کے بعد جو ارشاد نبوت کے تقدس، عظمت اور اس کی محبت کو اپنے زور قلم سے پارہ پارہ کر رہا ہے اس کا نام بھی پرویز ہے۔ کتنی شاندار مطابقت ہے اور وقت کا کیسا بہترین توار ہے آپ نے فتنہ پرویزی کا عنوان بول کر تاریخ کی مستور صداقت کو شاہراہ عام پر لانے کا فرض انجام دیا۔ یہ بھی سن لیجئے کہ گرامی نامہ کے چاک کرنے کی اطلاع جب دربار نبوت میں پہنچی تو یہاں رد عمل کیا تھا امام بخاری نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے

ابن عباس کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسری کو خطر روانہ کیا۔ کسری نے پڑھ کر چاک کر دیا آپ نے دعا کی کہ خدا ان کو چکنا چور کر دے اگر یہ واقعہ جوش اور مسرت سے ڈوبا ہوا دیکھنا چاہتے ہو تو مولانا نظاسی کی تشریح خسرو پڑھو۔ مولانا نے دو جگہ واقعہ کو تفصیل اور جذبہ اسلامی کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہ تو آپ کے تجویز کردہ عنوان کی تقریب ہوئی۔

یہ بات کہ حجت تو صرف قرآن ہے کیونکہ وہ اللہ سبحانہ کی وحی ہے۔ ایک بنیادی غلط فہمی کی وجہ سے کہی گئی ہے۔ غلط فہمی یہ ہو گئی ہے کہ وحی صرف قرآن ہے۔ اور قرآن کے باہر جو کچھ ہے وہ اللہ کی وحی نہیں ہے حالانکہ یہ نظریہ خود قرآن کی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن حکیم نے خود انسان کے اللہ سبحانہ سے ہم کلام ہونے کی جو صورتیں بیان کی ہیں یہ ہیں:-

اور کسی آدمی کی طاقت نہیں ہے کہ	وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ
اس سے اللہ بات کرے مگر اشارے	اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ
سے یا پردے کے پیچھے سے یا بھیجے	حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا
کوئی پیغام رساں بس وحی کرے وہ	فِيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ۔

خدا سے جو خدا چاہے۔

یعنی کوئی انسان اپنی عنصری ساخت اور موجودہ قوتوں کے لحاظ سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اللہ سبحانہ اس دنیا میں اس کے سامنے ہو کر بالمشافہ کلام کرے اور وہ اسے برداشت کر سکے کسی انسان سے اس کے ہم کلام ہونے کی اتنی صورتیں ہیں۔ الف۔ بلا واسطہ پردے کے پیچھے سے کلام فرمائے یعنی نبی کی قوت سامعہ کلام الہی کی شنید سے لذت اندوز ہو کر آنکھ دیدار متفتح نہ ہو جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلاۃ الاسد کو پیش آیا۔ یہ میں دراز حجاب ہے۔

ہا۔ بواسطہ فرشتہ حق سبحانہ نبی سے کلام فرمائے مگر فرشتہ آنکھوں کے سامنے نہ ہو بلکہ براہ راست قلب پہنچے پر نزول کرے اور ذات نبی قلب ہی اس کا ادراک کرے جو اس ظاہرہ کو اس میں کوئی دخل نہ ہو۔ میرے خیال میں یہ صورت ہے جسے حدیث عائشہؓ میں یالیتنی مثل صلصلة الجرس سے تعبیر فرمایا ہے اسی کو ہوا شدہ علی فرمایا ہے۔ قرآنی وحی اسی صورت میں آئی ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ
لیکراترا ہے اس کو معتبر فرشتہ تیرے دل پر۔

اور

فَإِنَّمَا نَزَّلْنَا عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ
یقیناً اتارا اس کو تیرے دل پر اللہ کے حکم سے۔

میں اسی طرف اشارہ ہے یہی صورت اس آیت ویسے سئل رسولاً فیوحي بإذنها ما يشاء میں بیان کی گئی ہے۔

ج۔ تیسری صورت کو قرآن نے وحی ہی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ لعنت میں وحی کے معنی اشارہ مخفی کے آتے ہیں اس لئے اس میں خواب، دل میں بات کا ڈالنا، الہام وغیرہ سب داخل ہیں۔ چونکہ یہ صورت پوشیدہ طور پر اندر ہی اندر ہوتی ہے ذات ثبوت سے باہر کسی چیز کی نمود نہیں ہوتی اس لئے اس قسم کو وحی کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

قرآن کا نزول دوسری صورت میں ہوا ہے قرآن سے باہر قرآن ہی کی بیان فرمودہ وحی کی دو صورتیں اور بھی موجود ہیں اس لئے یہ کہنا ستر تا ستر غلط اور خود قرآن ہی کے خلاف ہے کہ قرآن سے باہر وحی کا کوئی وجود نہیں ہے اور اس انداز فکر کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہے کہ نبی کی تعریف خود قرآن نے جو بیان کی ہے وہ غلط ہو کر رہ جائے یعنی

قرآن کی زبان میں نبی صاحب وحی کو کہتے ہیں اور اس نظریہ کی بنیاد پر نبی صاحب وحی کو نہیں بلکہ صاحب کتاب کو کہتے ہیں۔ کیونکہ یہاں کتاب سے باہر وحی کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ بخاری شریف میں حضرت امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری نے بدوحی کے تذکرے میں جو یہ قرآنی آیت تمام آیات قرآنیہ میں سے منتخب کر کے درج فرمائی ہے۔

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا
إِلَى نُوحٍ - بلاشبہ ہم نے وحی کی تمہارے طرف
جیسا کہ ہم نے وحی کی حضرت نوح کی طرف

تو اس سے امام بخاری اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں یہ اور صرف یہ اتارنا چاہتے ہیں کہ نبی وہ شخص ہوتا ہے جس پر اللہ سبحانہ کی وحی آئے عنوان میں بدوحی کے ساتھ الی رسول اللہ کے اضافہ سے نبوت کی تعریف کی ہے اور تعریف کو مدلل کرنے کے لئے آیات وحی میں سے سورہ مائدہ کی آیت بالا کو لائے ہیں اور صرف اتنی بات نہیں بلکہ آیت کے انتخاب سے یہ بھی جانا مقصود ہے کہ انبیاء دو طرح کے ہوتے ہیں موسسین اور مجددین۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تعلق قسم اول سے ہے۔ نبوت کی تعریف کے بعد ضرورت نبوت بتانے کے لئے مشہور حدیث **إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** لائے ہیں۔ سمجھایا ہے کہ اقدار ہوں یا اخلاق، اعمال ہوں یا اقوال ان کی قدر و قیمت کا دار و مدار دو چیزیں ہیں ایک روح اور دوسری ڈھانچہ۔

روح عمل کو مصدر اور صورت عمل کو منظر کہتے ہیں۔ اقدار، اخلاق، اعمال اور

سلہ یہ میری ذاتی رائے نہیں بلکہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب میں بھی اسی قسم کی تصریح فرمائی ہے قاسم العلوم کے نام سے جو آپ کے مکتب سلسلہ میں شائع ہوئے ہیں ان میں رقم طراز ہیں۔

اعمال را بد و سواست یکے نیت و مبادی آن کہ آن را مصدر دوم پیکر و ہوت کہ منظر آن

اقوال کا کوئی بیانا اللہ سبحانہ کے یہاں پذیرائی نہیں جب تک ان کے مصادر اللہ کی رضا اور مظاہر اللہ کی وحی سے وابستہ نہ ہوں اور یہ بات نبوت کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہاں معاً یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ بات تو مان لی گئی کہ نبی وہ ہے جو صاحب وحی ہو۔ لیکن خود وحی کیا ہے؟ امام بخاری اس سوال کا جواب دینے کے لئے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی وہ مشہور حدیث لائے جس میں وحی آنے کی صورتیں بتائی گئی ہیں اور حدیث لاکر بتا دیا کہ ایک معلوماتی ذریعہ ہے لیکن یہ معلوماتی ذریعہ ہمارے ادراک کی دسترس سے باہر ہے۔ ہم کچھ جان سکتے ہیں تو وہ وحی نہیں بلکہ وحی کی آمدی کیفیت ہے اور وہ بھی تمثیل کے درجے میں۔ یہ اللہ کی دین ہے محنت و ریاضت سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے بعد نبی شناسی کا اخلاقی اور نوعی بیانا بتانے کے لئے حضرت عائشہؓ کی غار حرا والی حدیث اور شخصی بیانا بتانے کیلئے دربار ہرقل کی لمبی داستان لاکر کتاب کے دیباچے کو ختم کیا ہے۔ درمیان میں یہ جتانے کے لئے کہ نبی بننے میں خود نبی کی ریاضت کو دخل نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس کی حدیث لے کر آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی آنا اور وحی کے ذریعے نبی بننا تو بڑی بات ہے نبوت ملنے اور وحی آنے کے بعد خود وحی کو اپنی قوت سے حافظہ میں محفوظ رکھنا بھی نبی کی دسترس سے باہر ہے۔

ارادۃ قلم کو روک روک کر لکھ رہا ہوں خط کا محدود دائرہ تفصیل سے مانع ہے

در نہ جی چاہتا ہے کہ سینہ بخاری سے ابلی ہوئی علمی طاقت کو ان سینہ چاک دیوزہ گروں کے سامنے رکھوں جو ادب سے محروم اپنی خلوتوں میں حضرت امام پر زبان درازیاں کرتے رہتے ہیں! اور نہیں جانتے کہ ارشادات نبوت کی نگرانی میں ان کی جلالت شان کیا ہے۔

میں کہتا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن کی زبان میں نبی صاحب وحی کو کہتے ہیں۔ اور قرآن

منسے باہر فرجی کو نہ مان کر نبی صا جب کتاب کو کہنا پڑتا ہے اور یہ قرآن کی تصریح بجا
 رہے۔ آپ خود خود کر لیں قرآن ہی کے ذریعے ذرا اس معیار کو پرکھئے آپ کو پتہ لگ
 جائے گا کہ قرآن سے کتنی دوری ہو رہی ہے۔ مثلاً قرآن ہی میں خود قرآن کے متعلق
 اللہ سبحانہ کا لٹھا گرامی ہے
 وَإِن تَرَوْا كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ظَالِمِينَ
 ت إِذْ أَقْرَبُوا نَأَى فَا تَبِعُوا قُرْآنًا
 تَمَّتْ آيَاتٌ عَلَيْنَا بَيِّنَاتٍ
 (سورہ القیامتہ پا ۲۹) ان میں
 ہے اس کا کھول دینا۔

جب یہاں قرآن کا دعوائے یہ ہے کہ نزول قرآن کے بعد قرآن کا بیان اللہ سبحانہ کے
 ذریعے ہے اگر قرآن کا یہ بیان خود قرآن سے علیحدہ چیز ہے اور یقیناً ہے کیونکہ اگر قرآن
 ہی کو قرآن کا بیان بتایا جائے تو پھر اس کے لئے بھی قرآن ہونے کی وجہ سے بیان کی
 ضرورت ہوگی اور یہ سلسلہ لانا ہی ہو جائے۔ ماننا پڑے گا کہ قرآن کے لئے بیان قرآن
 سے الگ ہے۔ اگر یہ بیان قرآن سے الگ ہے تو یہ حسب وعدہ الہی عَلَيْنَا بَيِّنَاتٌ
 اللہ سبحانہ کی جانب سے ہے اور بدلیعہ وحی ہے لہذا اللہ سبحانہ کی جانب سے
 بتصریح قرآن ایسی وحی کا آنا ثابت ہے جو قرآن کے علاوہ ہے۔ یہ وحی جس کے
 ذریعے قرآن کا بیان عمل میں آیا ہے کونسی ہے۔ اور قرآن کی بیان کردہ کلام الہی کی
 صورتوں میں کونسی صورت ہے، اس کا حل بلا کسی تشویش کے ہر شخص معلوم کر
 لے سکتا ہے۔ یقیناً یہ کلام الہی کی وہ صورت نہیں ہے جس میں نزول قرآن ہوا
 تھا اور وہ صورت ہے جسے قرآن نے مِنَ وَرَاءِ حِجَابٍ کہا ہے اگر ہے تو صرف
 پیغمبری صورت ہے جسے قرآن إِلَّا وَحِيًّا کہہ کر لکھا ہے جس میں نصت فی اللہ
 درویش نے صیادقہ إِذَا هُمْ سَبَّ داخل ہیں اور اس صورت میں جو چیز قرآن کا
 بیان بن کر نازل ہوئی ہے وہ ذات نبوت کا اخلاقی، قولی، فعلی اور مجلسی زندگی کا

وہ پیمانہ ہے جسے قرآن الحکمتا اور مؤرخین السننہ کہتے ہیں تاریخ کی بے لاگ
علامت سامنے ہے حدیث پر تاریخ کا لفظ میں نے ارادہ بولا ہے کیونکہ حدیث کی

یہ حیثیت نوسب میں مسلم ہے اس کا فیصلہ ہے کہ

كَانَ الْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَى رَسُولِ

اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

وَيَحْضُرُ جِبْرِيلُ بِالسَّنَةِ

الَّتِي تَفْسِرُ ذَلِكَ

حضرت امام شافعی المتوفی ۲۰۴ھ نے الرسالۃ میں اب نہیں بلکہ اب سے

بارہ سو سال پہلے ہی بتا دیا نہ صرف یہ کہ السنۃ قرآن کا بیان ہے اور یہ بیان بھی

اللہ سبحانہ کی جانب سے بذریعہ وحی آیا ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ قرآن کی بیان کردہ

تین صورتوں میں سے جس صورت میں اس بیان کا نزول ہوا ہے وہ وہی ہے جسے

قرآن نے وَحْيًا کہا ہے اور جس میں نفث فی الروع، الہام وغیرہ داخل ہیں۔ فرماتے

ہیں۔

الْقِي فِي رَوْعِهِ كُلِّ مَا سَنَّ

وَسُنَّةَ الْحِكْمَةِ الَّذِي الْقِي

فِي رَوْعِهِ عَنِ اللَّهِ تَعَالَى فَكَانَ

مَا الْقِي فِي رَوْعِهِ سُنَّةً

یہاں یہ نکتہ بھی سمجھ لیجئے کہ اس آیت اذًا قَرَأْنَا فَاَتَّبِعْ قُرْآنًا ثَمَّ

عَلَيْنَا بَيِّنَاتٌ۔ میں اللہ سبحانہ نے قرآن کے پڑھنے کو اپنا پڑھنا اور قرآن کے بیان

کو اپنا بتایا ہے قرآننا اور بیِّنَاتٌ کے لفظوں پر غور کرو مگر قرآن ہی کی دوسری آیات

میں جس طرح قرآن کے پڑھنے کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت

کیا ہے۔ قرآن کریم میں لکھا ہے: **قُرْآنًا فَرَقْنَا لِتَفْقَهُهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مَكَّةٍ**۔ اور پڑھنے کی چیز جدا کیا ہم نے اس کو تاکہ تم پڑھو لوگوں کے سامنے بتدیج ایسے ہی قرآن کے بیان کو بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام بتایا ہے۔

أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔ انا ہم نے تمہاری طرف لاکر تاکہ تم بیان کرو لوگوں کے سامنے اس کو جو اتارا گیا ہے آیت میں لِلنَّاسِ اور مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ لاکر بتا دیا ہے کہ کتاب کے ساتھ نبوت آنے کی ضرورت ہی اس لئے درمیش آتی ہے کہ نبوت کے اقدار، افعال، اقوال اور اخلاق کے ذریعے لوگوں کے سامنے کتاب الہی کا منشا واضح اور صاف ہو کر آجائے اور یہی بیان ہے۔ بات تشذہ نہ جائے گی اگرچہ یہاں امام الحرمین کے والد محترم ابو محمد عبداللہ بن یوسف الجومنی المتوفی ۳۲۷ھ کے اس بیان کو نظر انداز کر جائیں جسے علامہ جلال الدین السيوطی المتوفی ۹۱۰ھ نے الاتقان فی علوم القرآن میں نقل کیا ہے فرماتے ہیں:۔

اللہ سبحانہ کی جانب سے نازل شدہ کلام کی دو قسمیں ہیں ایک قسم وہ ہے جس میں اللہ سبحانہ نے جبریل سے فرمایا کہ پیغمبر سے کہدو کہ اللہ سبحانہ کا یہ ارشاد ہے ارشاد ربانی کو جبریل سمجھتا ہے اور پیغمبر کو آکر بتا دیتا ہے اس قسم میں الفاظ الہی نہیں ہوتے بلکہ مراد الہی ہوتی ہے۔ عبارت کا بیمانہ جبریل کا ہوتا ہے۔ مگر روایت باللفظ نہیں ہوتی۔ دوسری قسم وہ ہے کہ اللہ سبحانہ جبریل سے فرمائیں کہ یہ خط نبی کو پڑھ کر سنا دو جبریل آئیں اور عینہ خط پڑھ کر سنا جائیں

یہ روایت بالفاظ ہے۔ دوسری قسم کی وحی قرآن ہے اوپری قسم کی سنت ہے۔
 اگر احادیث میں روایت بالمعنی کے جواز کا سرچشمہ بھی نہیں ہے کیونکہ
 جبریل نے سنت کی وحی روایت بالمعنی ہی میں کی ہے لیکن قرآن میں
 روایت بالمعنی ناجائز ہے اس لیے کیونکہ اس کی وحی باللفظ ہوئی ہے بظاہر
 دونوں وحیوں میں اس فرق کو قائم کرنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن بہ
 کی وحی میں صرف احکام کا اخبار مقصود نہیں بلکہ اس کے ساتھ الفاظ کا
 تعبیر اور تفسیر و اسلوب کا اعجاز بھی مشاوریابی ہے برخلاف سنت
 کے کہ اس میں صرف اخبار احکام مقصود ہے نہ لفظوں میں تعبیر ہے اور نہ
 اسے اسلوب اعجازی ہے۔ چنانچہ مشاوریابی میں اس کا آداب
 کے اور جو نبی کے اس بیان سے صحیح مسلم کی اس حدیث کا بھی پیشہ صنف ہو گیا ہے
 جس میں حدیث لکھنے کی زمانہ نزول قرآن میں ممانعت ہے کہ جب وہ یہاں
 حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَكْتُبُوا مِنْ قُرْآنِ اللَّهِ فِي شَيْءٍ مِنْ شَيْءٍ
 عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ بِمَنْ لَمْ يَكُنْ يَكْتُبُ الْقُرْآنَ كَمَا كُنْتُ أَكْتُبُ الْقُرْآنَ
 كَتَبْتُ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ حَتَّى يُبَادِنِي مَجْهَدٌ مِنْ عَدُوِّهِ يَمْنَعُ
 فِيمَنْ وَحَدَّثُوا عَنِّي وَلَا يَمْنَعُونَ كَمَا كُنْتُ أَكْتُبُ الْقُرْآنَ كَمَا كُنْتُ
 لَا يَجْرِي وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مِنْ جَوْشَنُ مَجْهَرٍ بِالْأَرَادَةِ جَوْرًا
 مُتَعَدِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدًا مِنَ النَّارِ يَرْجُو كَمَا كُنْتُ أَكْتُبُ الْقُرْآنَ
 مِنْ النَّارِ يَرْجُو كَمَا كُنْتُ أَكْتُبُ الْقُرْآنَ كَمَا كُنْتُ أَكْتُبُ الْقُرْآنَ
 حدیث کی زبانی روایت کرنے کے اعجازت نامہ کے ساتھ ممانعت کا کہ قرآن کے

سوامیرے سے کچھ نہ لکھو۔ اس کا سوائے اس کے منشا کیا ہے کہ قرآن کے الفاظ میں
 تعبد ہے۔ قرآن سے الگ ہو کر کوئی وحی نہیں ہے جس کے لفظوں میں تعبد ہو اور تعبد کا
 طور پر جس کی تلاوت کی جاتی ہو۔ خود انداز بیان بھی اس کی گواہی دے رہا ہے یہی تو
 فرمایا ہے کہ لا تکتبوا عنی غیر القرآن لفظ غیر عربی اسالیب میں اپنا موصوف
 چاہتا ہے اس لئے عبارت یوں ہے لا تکتبوا عنی قوا نا غیر القرآن مطلب
 صاف ہے کہ میرے سے پڑھنے کی کوئی ایسی چیز جس کے لفظوں میں تعبد ہو قرآن کے
 سوا مت لکھو آخر قرآن ہی میں من یتبع غیر سبیل المؤمنین
 آیا ہے اور اس کا مطلب صاف یہی ہے کہ من یتبع سبیل غیر سبیل المؤمنین
 ارشاد میں قرآن کے تعبد پر زور دیا جا رہا ہے اور ارشاد نبوت کا ایشا ربانکل
 واضح ہو جاتا ہے جب ہم حضرت ابوسعیدؓ کے اس بیان تک پہنچتے ہیں جو حافظ ابن
 عبدالبر نے جامع بیان العلم کے ص ۳۲ پر نقل کیا ہے۔

عن ابی نصر

عن ابی نصر قال قلت

لائی سعید الخدری

الا تکتب ما نسمع منک

قال تریدون ان تجعلوها

مصاحف ان نیتکم

صلحہم کان یعدنا فنحفظ

فاحفظوا کما کنا نحفظ

حفظ روایت کے تقاضے کے ساتھ کتابت سے ممانعت میں جو روح کام کر

رہی ہے وہ یہی ہے جس کی طرف امام جوینی نے اشارہ کیا ہے کہ یہاں لفظوں میں

تعبد نہیں ہے یہ مصحف ہی ہے جس کے الفاظ میں تعبد ہونے کی وجہ سے باوجود

اور میں نے اسے لکھا ہے کہ جو وحی کی چیز کی جو وحی
 اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ
 من شریخی
 کی جاتی ہے میری طرف میرے پروردگار
 کی جانب سے

قُلْ لَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدَ حٰى
 خَزَائِنُ اللّٰهِ وَلَا اَعْلَمُ
 الْغَيْبَ وَلَا اَقُوْلُ اَنْتُمْ
 اِلٰهِيْ مَلِكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا
 يُوْحٰى اِلَيَّ
 کہند ہیں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس
 اللہ کے خزانے میں اور میں غیب دان
 نہیں ہوں اور میں نہیں کہتا کہ میں فرشتہ
 ہوں۔ نہیں پیروی کرتا مگر اس چیز کی
 جو وحی کی جاتی ہے میری طرف۔

یہ اور اس قسم کی ان گنت آیات ہیں جہاں وحی کی اتباع کا تذکرہ کیا ہے۔ وہاں
 لفظ کتاب نہیں لایا گیا ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں جہاں تک قرآن کا میں نے مطالعہ کیا ہے
 مجھے تو اس میں بہت گہری معنویت محسوس ہوئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ صاحب وحی
 کا منشا اس محسوس فرق کو قائم کر کے صرف یہ بتانا نہیں بلکہ جتنا ہے کہ
 الف وحی جو ذات نبوت پر آئی ہے وہ صرف کتاب ہی میں محدود نہیں ہے۔ بلکہ کتاب
 سے باہر بھی وحی ہے۔

ب۔ کتابی وحی کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اس کے لفظوں میں تعبد اور تعبیر میں اجازت
 ہے۔ غیر کتابی وحی کی تلاوت نہیں بلکہ اتباع کی جاتی ہے۔

تلاوت خاص ہے کتابی وحی کے لئے اتباع کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں
 کتابی اور غیر کتابی کی تخصیص نہیں ہے۔ اس لئے اتباع وحی کے موقع پر کلام سے
 کتاب کی قید کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور چونکہ اتباع وحی کا دائرہ وسیع ہے اس لئے

جب اتباع کے مطالبہ پر وحی کی جگہ ذات نبوت کو لائے اور ذات نبوت کی اتباع کا اللہ سبحانہ نے مطالبہ کیا تو وہاں بھی ذات نبوت کو بلا قید ہی اتباع کے فعل کا

مفسوں بنا کر لائے ہیں۔ مثلاً: یا ایہا

اِنَّ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ

فَاتَّبِعُوْنِيْ - اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔

اپنی آیت میں بایں حکیم سے ذات نبوت یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے بلا قید آپ کی اتباع کا مطالبہ

کر رہے ہیں۔ حالانکہ قرآنی وحی کے دائرے تک تو آپ ایک محدود اور خاص ہی حیثیت کے مالک ہیں۔ مگر اس کے باوجود فیما او نحوہ الی من الکتاب یا فیہا

انزل الی من کتاب رزقی کی یہاں کوئی قید نہیں ہے۔ اگر ذات نبوت کسی درجے میں بھی ناقابل اتباع ہوتی تو مطلق اتباع کا حکم نہ آتا یہاں کوئی قید ضرور ہوتی۔ بلکہ

میں تو ترقی کر کے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی زبان میں کہتا ہوں کہ اگر آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی معاذ اللہ رضائے الہی کے پیمانے پر پورا نہ ہوتا تو اتباع کا بلا قید حکم نہ آتا۔ قرآن نے تو آپ کو بلا قید رضیٰ قراری دیا ہے۔

عَلٰی غَیْبِہِمْ اَحَدًا اِلَّا مَن

عَلٰی غَیْبِہِمْ اَحَدًا اِلَّا مَن غَیْبِہِمْ کَیْسِی کُوْبُرِہِمْ اَبْنِ شَیْخِہِمْ کُوْبُرِہِمْ

صرف ار رضیٰ فرمایا ہے فی الاعمال یا فی الاخلاق کی کوئی قید نہیں لگائی ہے۔ دوسرے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذات نبوت اخلاق، اعمال، احوال اور عقائد میں

رضیٰ ہے چونکہ ہر گوشہ میں رضیٰ ہے اس لیے بلا قید اتباع کا حکم ہوا ہے اور بلا قید اتباع کا حکم دلیل ہے اس بات کی کہ وحی صرف کتاب ہی میں محدود نہیں ہے۔

Marfat.com

بلکہ قدآن سے باہر بھی وحی ہے:

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پنام۔

مسٹر محمد شرف ایم۔ اے۔ بی۔ بی۔ ٹی۔ ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈسکہ ضلع سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۹ ستمبر ۱۹۵۳ء

سالار نبوت کی زندگی کا نام اسلام ہے، صرف ارشادِ قوی بگوشی ہوئی قوموں کے لئے اکسیر نہیں ہے، نبوت کا دو ٹوک فیصلہ، دعوت کا کام اوپر سے نیچے شروع ہوتا ہے، رسالتِ محمدیہ اجتماعی بعثت کی حامل ہے، دعوت کے میدان میں امتِ محمدیہ کے فرائض۔

اخی بالمکرم! وقتنا اللہ وایاکم لما یجمر ویرضاه السلام علیکم

جی چاہتا ہے کہ آپ سے ملاقات ہو۔ بہت سوچ و بچار کے بعد یہ تدابیر سوچتی ہے کہ خط کو ہی ملاقات کا پہلا سنا یا جائے۔

اگرچہ آپ سامنے نہیں ہیں اور آپ ہی پر کیا موقوف ہے اس وقت کمرے کی دیواروں کے سوا سامنے کوئی نہیں تصور کی دنیا میں غرق ہوں لیکن کبھی کبھی کان میں "سب اچھا" کی آواز آتی ہے تو چونک جاتا ہوں۔ اللہ اکبر جیل کے نگران جیل کی نگرانی کرتے ہیں۔ خود جاگتے ہیں اور ساری رات سب اچھا سب اچھا کہہ کر دوسروں کو بیدار رکھتے ہیں۔ مگر آہ اسلام کے نگران سو رہے ہیں۔ اسلام کے قیدی دیواریں پچاندے سے ہیں۔ دن رات قانون کی شکست و ریخت میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر وہ کہنے والا کوئی نہیں آپ جانتے ہیں کہ سالارِ نبوت نے چالیس سالہ عمر میں ماہِ دلوں کے سامنے جس دعوت کو پیش کیا۔ اور تیرہ سال تک لگاتار جس کی راہ میں شمشک، بوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، راز، تید، فاقہ اور بھلائی کے مرحلوں سے گزرے۔

تیرہ سال کی جائگاہ کوشش کے بعد مدینہ میں ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کیا دس برس تک خود اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر عرصے میں ہر

شعبہ حکومت میں ہی نہیں بلکہ زندگی کی ہر شاخ میں صرف تخیل نہیں۔ بلکہ پائیدار
 محسوس انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی، انفرادی
 اور اجتماعی زندگی کے اصول بتائے اور ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کر کے زندگی
 کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں لوگ اس کے نتائج محسوس شغل
 میں دیکھنے لگے۔

اس زندگی کا نام اسلام ہے اگر آپ چاہیں کہ اس زندگی سے الگ ہو کر اسلام
 کی جانیں اور سمجھیں تو بلا خوف و تردید کہہ سکتا ہوں کہ صرف جان نہیں سکتے بلکہ اسلام کا
 تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور اس سے جدا ہو کر آپ کے بارے میں جو کچھ بھی سوچیں
 گے۔ وہ اسلام نہ ہو گا پتہ نہیں کہ لوگ یہ موٹی سی بات کیوں نہیں سمجھتے آخر خود قرآن
 ہی میں یہ جو فرمایا ہے کہ:-

انزلنا اليكم نورا مبينا
 ہم نے تمہاری طرف ایک واضح روشنی اتاری
 اور دوسری جگہ ہے:-

قد جاءكم من الله نور و
 کتاب مبين
 تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک
 روشنی اور واضح کتاب آئی۔

تو اس سے یہی تو بتایا ہے کہ قرآن اور حامل قرآن دونوں نور ہیں۔ دعوتِ قرآنی
 کا کوئی تصور نبوت کی زندگی سے الگ ہو کر اسلام نہیں ہے آفتاب سے اگر آفتاب
 کی دھوپ کو آپ جدا نہیں کر سکتے تو قرآن سے نبوت کی عملی زندگی کو علیحدہ کیسے
 کر سکتے ہیں؟

اوت اس سلسلے میں آخر قرآن اور کیا کہتا۔ پیغمبر خدا کی محسوس اور مرئی زندگی
 سے الگ ہو کر اسلام سمجھنے اور جاننے کا نہ کبھی شبہ پیدا ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ یہ
 واقعہ ہے کہ قرآن کے نظریات اور مطالبات کی عمل کی دنیا میں چونکہ انتہا اس ذات

پیغمبر پر ہوئی تھی۔ جن کا منصب الرسول اور النبی تھا۔ اس لئے ذمہ داریوں میں
 ایسے شبہ کی گنجائش ہی کہاں ہوتی اور کیسے ہوتی؛ زیادہ سے زیادہ یہ شبہ ہو سکتا
 تھا کہ پیغمبر کا کام لوگوں کو تعلیم دینا ہے۔ اس لئے یہ معلم ہے اور معلم کے لئے ضروری
 نہیں ہے کہ اس کے کردار اور اعمال کو بھی اپنا پایا جائے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ کہتا
 کیا ہے اور بس۔ لیکن قرآن ہی نے یثْلُوهَا عَلَيْكُمْ آیَاتِنَا کے ساتھ وِیَسِّرْ لَكُمْ
 كَا اِضَافَةٌ كَرَّهَ اِچانک اس دروازے کو بند کر دیا۔ آخر جب الرسول کا مقام
 اتنا بلند ہے کہ

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ
 وہ خواہش سے نہیں بولتا

تو پھر سلسلہ کائنات کی کونسی ہستی اس کی مستحق رہ جاتی ہے جس کا عمل انسانی
 زندگی کے لئے نشانِ راہ کا کام دے سکے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک
 پوچھنے والے کو مخاطب کر کے کتنی فصیح بات فرمائی تھی۔

اما قرأت القرآن
 کیا تو نے قرآن نہیں پڑھا؟
 قَالَ نَعَمْ قَالَتْ فَذَلِكَ خَلْقًا
 اُس نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ قرآن
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 ہی آپ کے اخلاق ہیں۔

صرف ارشادِ قولی بگڑی ہوئی قوموں اور امتوں کے لئے اکسیر نہیں ہے جب
 تک اس کی ہر کابی میں عمل کا ٹھاٹھین مارتا ہوا سمندر نہ ہو۔ الہی ارشادات کیلئے
 عمل ہی کے سمندر کا نام سنت یا اعمالِ نبوت ہے۔ اعمالِ نبوت کا اتباع ہی
 دراصل قرآن کا اتباع ہے۔ شاید اسی تعبیر میں یہ برابری رکھی گئی ہے۔

اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ
 پیروی کرو اس چیز کی جو نازل کی گئی

مِّنْ شَرِّكُمْ
 تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی

طرف سے

اور

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ
فَاتَّبِعُوْنِيْ

اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری

پیروی کو رو

یعنی قرآن کی پیروی نبوت کے کردار سے الگ ہو کر پیروی نہیں ہے اسی کا نام اسلام ہے۔ اس کی پوری عمارت یگانہ خدا کی الوہیت کے نظریہ پر قائم ہے اور لا الہ الا اللہ اسی کی ترجمانی ہے۔ ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی جماعت اور اسلامی اسٹیٹ کے بننے تک اس زندگی نے جس قدر مرحلے طے کئے ہیں۔ ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری اور مستند تفصیلات ملتی ہیں شاید آپ نے کبھی نہ سوچا ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت اسلام کے داعی بن کر آئے عرب میں وہ مسائل موجود تھے جن سے آج دنیا والے دست و گریباں ہیں۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، معاشی بد حالی، طوائف الملوک اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ یمن اور عرب کے ساحلی علاقے اور عراق کا زرخیز صوبہ ایرانی اقتدار کے زیر نگیں، شمال میں رومی تسلط حجاز تک پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گڑھ قائم تھے اور عربان کی سود خواری کا نشانہ تھے، مشرقی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو فتح مکہ کی خاطر چند سال پہلے مکہ پر پڑھائی کر چکی تھی ان سب حالات کی موجودگی میں اور ان پیش پا افتادہ مسائل کے ہوتے ہوئے سرآمد رسالت نے بغیر تہیہ کی کارروائی کے لوگوں کے سامنے دعوت نبوت پیش کی اور الف سے یا تک زندگی کے سارے گوشوں کے لئے وہ رنگ و روغن فراہم کیا کہ دیکھنے والے آج تک اس کے نشانات دیکھ رہے ہیں۔

یگانے تو یگانے ان حق پوش بیگانوں نے بھی مانا ہے جنہیں رسالت کی ہر بڑی بات کو چھوٹی ثابت کرنے کا معصومانہ کمال حاصل ہے یعنی برجی زیدان

جیسا مشہور عیسائی مؤرخ باوجود اس خوش فہمی کے کہ

انتجت رجالاً نبغوا فی
السیادة والقيادة وكانوا
من اہم العوامل تاثيراً
فی سرعة نشر الاسلام۔
ایسے لوگ رونما ہو گئے جن میں
قیادت کی صلاحیتیں تھیں۔ بس اسلام
کے تیزی سے پھیلنے کا یہی لوگ
سبب بنے۔

را لتمان

یعنی رسالت اپنے اصول کی قوت اور گفتار و کردار کی خوبیوں سے نہیں بلکہ
اشخاص کے سہارے دنیا میں پھیل گئی۔ اضطراراً اس کا قلم بھی دعوت کے متعلق
اس اقرار پر مجبور ہو گیا۔

انما قام بجماعن صدق
واخلاص۔ (التمدن ص ۱۱۱)
آپ کی دعوت کی بنیاد راستی اور
اخلاص و تقار

نبوت کی اسی زندگی کو قرآن نے اُسوۃ حسنہ کہا ہے یہ اُسوۃ حسنہ
زندگی کے سارے گوشوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ امن و امان کا قیام، ملک کی آبادی،
مذہبوں کی نگرانی، فوجی تنظیم، بین الاقوامی مسائل یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں
جن کا حکومتوں سے تعلق ہے۔ اُسوۃ حسنہ کے دائرے میں اسی طرح داخل ہیں
جس طرح انفرادی اور جماعتی زندگی کے دوسرے مسائل۔ صرف مسائل ہی
نہیں بلکہ زندگی کی چھٹی سے چھوٹی بات۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ اسی اُسوۃ
حسنہ میں مسلمانوں کے بالوں اور ناسوں کی صفائی تک کی ہدایات موجود ہیں۔
ترمذی میں ہے کہ سلمان فارسیؓ سے جب کسی نے طنزاً یہ کہا کہ

قد علمکم نبیکم حتی

الغزاة۔

تو حضرت سلمان فارسیؓ نے بڑے جوش اور پورے حکیمانہ انداز میں کہا تھا کہ اجل ہاں واقعی ہماری زندگی کے ان گوشوں کے لئے اسلامی ہدایات موجود ہیں۔ حدیث کی کتابوں میں اس قسم کا بے شمار ذخیرہ موجود ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ایک شخص نے مضامین کیا۔ ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ آپ نے اس ناخن دراز سے کہا کہ رسول اللہؐ کے پاس ایک شخص آیا۔ اور عالم بالا کے بارے میں کچھ دریافت کرنے لگا۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ تم میں سے ایک شخص آکر عالم بالا کے متعلق پوچھتا ہے۔

واظظا سراہا کا تھا اظظا سراہا
علا نکہ اس کے ناخن جنگل کے پرندوں کے
السیر تجتمع فیہا الخبائث
ناخنوں کے مانند ہوتے ہیں جن میں
والتفت۔ (احکام شلا)
گندگی اور میل کچیل جمع رہتا ہے۔

بہر حال شخصی زندگی، دینا مندانہ، قومی تعلقات ہوں یا عام انسانی، بندوں سے ہوں یا تم سے، اسوۂ حسنہ ان سب پر حاوی ہے اور ہر شعبہ کے متعلق قوانین و دفعات رکھتا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسی نمونہ کی زندگی کا نام اسلام ہے۔ نبوت نے الف سے یا تک قائم کیا تھا اور اس سے ہٹ کر کبھی کسی سے کسی قیمت پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ کتہ کے درباب بست و کشاد نے ایک کا نفرنس میں فیصلہ کیا کہ ایک ڈیپوٹیشن کی وساطت سے کسی طرح آپ کو راضی کر لیا جائے ڈیپوٹیشن کیا اور نبرت کے مساتہ جن باتوں کو پیش کش کی یہ تھیں

الف۔ ان كنت انا جئت بهذا الحدیث تطلب به ما اوجبه من اذی
من اموالنا حتى اثارنا مالاً۔

ب۔ وان كنت انا تطلب به ان شرفنا فیما نحن نمرودان علینا۔

رجاء۔ وان كنت تريد به ملكاً ملكناك علينا۔

ان تینوں پیشکشوں پر ذرا منصفانہ نظر ڈالئے اور سوچئے کہ وقت کی پکار کبہ رہی ہے کہ

الف۔ اگر آپ مایاتی مسائل کی پریشانی اور معاشی بد حالی سے بے چین ہیں تو لیجئے سرمایہ حاضر ہے۔

ب۔ اگر آپ لیڈرشپ کے خواہش مند ہیں تو لیجئے قیادت حاضر ہے۔

ج۔ اگر آپ بادشاہ بننا چاہتے ہیں تو لیجئے بادشاہت موجود ہے۔

اگر آپ ایک سیاسی لیڈر کی نظر سے حالات و واقعات کو دیکھتے تو بلاشبہ آپ تیسری پیشکش کو اپنا لیتے کیونکہ اقتدار ہاتھ میں آجانے کے بعد کوئی کام نہیں رک سکتا۔ مگر جانتے ہو نبی تھے لیڈرنہ تھے ان پیشکشوں کا پیغمبرانہ جواب دیا تاریخ میں یہ جواب محفوظ ہے۔

ان باتوں میں سے مجھ میں کچھ نہیں جو تم

کہتے ہو میری آمد کا مقصد سرمائے کی

فراہمی۔ لیڈری اور حکمرانی نہیں ہے

مجھے تو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے

مجھ پر کتاب اتاری ہے اور حکم دیا ہے

کہ میں لوگوں کو اعمال نیک کے نتائج کی

خوشخبری سناؤں اور اعمال بد کے نتائج سے خبردار کروں۔

ماہی ما تقولون وما جئت

بما جئتكم بها اطلب

اموالكم ولا الشرف عنكم

ولا الملك عنكم لكن

الله بلغني اليكم رسولا

وانزل علي كتابا وامرني

ان اكون بشيرا وناذيرا۔

یہ ہے نبوت کا دو ٹوک فیصلہ اور اسے کہتے ہیں دعوت۔

اس مثالی زندگی کو ہر قیمت پر دنیا میں قائم رکھنے ہی کے لئے نہیں بلکہ

اسی زندگی کے قیام پر اصرار کرنے کے لئے دنیا سے سالانہ رسالت کے روانہ ہوجانے

کے بعد خود قرآن ہی نے ارشاد کی حد تک نگرانی کے وعدے کے ساتھ اسی مثالی زندگی کے لئے جو کچھ اور جتنا کچھ انتظام فرمایا ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے قرآن کا مطالعہ اس فکر کے ساتھ کیا ہے کہ یہ خدا کا آخری پیغام ہے اور ساری انسانیت کے نام ہے۔ سب کے نام اور سب سے آخر ہونا ہی اس پیغام اور پیغامبر کی وہ خصوصیت ہے جو اسے دوسرے پیغاموں اور پیغامبروں سے ممتاز کرتی ہے۔ سب کے نام یعنی بعثت عامہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ہر چہے اور ہر گوشے میں اسی مثالی زندگی کو قائم کیا جائے۔ قرآن اور سنت نے اس حقیقت کو جس صراحت کے ساتھ سمجھایا ہے وہ سب ہی جانتے ہیں۔

میں دکھانا یہ چاہتا ہوں کہ اپنے تو اپنے غیروں کو بھی اس اقرار سے گریز نہیں شکیب ارسلان نے کسی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ

كَانَ مُعْتَقِدًا بِرِسَالَتِهَا

إِلَى الْعَالَمِينَ كَافَّةً

اسی بنا پر خاص دعوت ہی کے سلسلے میں وقت کی بڑی بڑی حکومتوں کے نام خطوط روانہ کئے۔ غالباً شہدہ میں آپ نے ایک ہی روز چھ حکمرانوں کے نام دعوت نامے بھیجے۔ ان حکمرانوں میں اصم نجاشی والی حبشہ، برقل قیصر روم خسرو پرویز ایران، مقوقس عزیز مصر، حارث غسانی، ہوزہ ابن علی جیسے مشاہیر تھے۔ دعوت کی بنیاد یہ اور صرف یہ تھی کہ آپ کی بعثت عام ہے یعنی نبوت کا یہ پیغام سب کے نام ہے۔ اس لئے اسے سب تک پہنچانا چاہئے۔ سب تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ نبوت کے مشن کو لے کر چلنے والی ایک جماعت ہو۔ جو نبی نہ ہو مگر ذمہ داریوں کے لحاظ سے نبوت ہی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اس کے کا نڈھولیا بد ہو۔ اس جماعت میں وہ خصوصیات ہوں جو انبیاء میں ہوتی ہیں۔ — سالار نبوت

اور قرآن نے اس مقصد کے پیش نظر جماعت تیار کی تھی۔ وہ انہیں خصوصیات کی حامل تھی۔ علامہ شاطبی غرناطی نے المواقفات میں ان خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ افسوس کہ خط کا محدود پیمانہ تفصیل کی اجازت نہیں دیتا۔ جاننے والے

جانتے ہیں اور لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ یہ امت کی بعثت سے اور بتایا ہے کہ امت کی بعثت خود نبوی بعثت سے پیدا ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے

وان یكون قوم بخیر امة

آپ کی امت بہترین امت ہے اسے

اخرجت الناس فیکون بعثت

لوگوں کے لئے پاکیا گیا ہے اس لئے

یتناول بعثتا آخر

آپ کی بعثت سے ایک اور بعثت ہوئی ہے

آگے اس کی تائید میں قرآنی آیات اور حدیث بھی پیش کی ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پیغام نبوت محمدی چونکہ زبان و مکان سے بے قید ہو کر آیا تھا۔ اس لئے خود یہ بعثت ہی اپنے دائرہ کار کی رو سے چاہتی تھی کہ ایک دوسری بعثت ہو۔

لیکن یہ بعثت ذاتی نہ ہو اور انفرادی نہ ہو بلکہ یہ دوسری بعثت پہلی بعثت کے زیر سایہ ہو۔ اور اس لئے ہو کہ اس مثالی زندگی کو دنیا کے چپہ چپہ پر پھیلا دے۔ جسے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے پیش کیا اور نہ صرف پھیلا دے بلکہ اس کے پھیلنے پر اصرار بھی کرے۔ اسی موضوع پر یہ جو لکھا جاتا ہے کہ

فلا یظن ظان انہ حصل

کوئی گمان نہ کرنے کہ کبھی کوئی خیر نبوت

علی خیر بدون وساطتہ

محمدیہ سے الگ ہو کر ملی ہے کیونکہ آپ کی

نبوتہ کیف وهو السراج

ذات ہی وہ چراغ ہے جس سے سب کو

الذی یستضیء بہ الجمیع

روشنی ملتی ہے۔ اور آپ ہی وہ علم اعلیٰ

والعلم الاعلی الذی بہ

ہی جس کے ذریعے راہ نوردی ہو

یھتدی فی سلوک الطریق

سکتی ہے۔

تو اس سے یہی بتانا چاہتے ہیں کہ یہ اجتماعی بعثت دراصل اس انفرادی بعثت کے کمالات کا پر تو ہے جسے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے اور چونکہ نبوت کالایا ہوا پیغام عرب سے باہر ساری دنیا میں پہنچانا اس اجتماعی بعثت کا کام ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ یہ اجتماع ان فرائض، مواعید اور خوبیوں سے مالا مال ہو جو نبوت انفرادی کے لوازم ہوتے ہیں۔

ادوں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ قرآن نے جو ان فرائض نبوت کو جو نبی ہی کے فرائض ہیں امت کے فرائض بھی بتایا ہے۔ تو اس کی وجہ یہی اور صرف یہی ہے کہ قرآن کے نزدیک بعثت علمہ کا تکلیفی مقام یہی ہے۔ ذرا نبی، رسول کے فرائض کو قرآن کے درتوں میں جہاں جہاں آپ تلاش کر سکتے ہیں تلاش کیجئے۔ اور پھر انہی فرائض کا انتساب قرآن میں امت کی طرف دیکھ لیجئے۔ قرآن میں سب سے بڑا فرض جو نبی کا بتایا ہے وہ اللہ کی طرف دعوت ہے اسی وجہ سے آپ داعی ہیں قرآن کے لفظوں میں

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ

اپنے مالک کے راستے کی طرف بلاؤ
سے اسی فرض کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ امت کے متعلق بھی دعوت کے کام کو نہ صرف اسکی طرف منسوب کیا ہے بلکہ اس کام کے کرنے کا امت سے مطالبہ بھی کیا ہے اور کہا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ

چاہیے کہ ہو یعنی تم ایک ایسی جماعت جو

إِلَى الْخَيْرِ۔

خیر کی دعوت دیتی ہے۔

دعوت ہی کے ساتھ نبوت کے مشن کی مدد تک نبی کا دوسرا فرض جو تبلیغ بتایا ہے۔ اور پیغمبر سے اس کا مطالبہ کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ بَلِّغُوا

اسے رسول پہنچا دو۔

اس کو قرآن ہی میں امت کا مبرا کرنا ہے

يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ

پہنچاتے ہیں اللہ کے پیغاموں کو

دعوت نبوت پیش کرنے کے لئے قرآن نے انذار کے عنوان سے جو فرض

پیغمبر کا بتایا تھا اور جسے انجام دینے پر قرآن کو مدد درجہ اصرار تھا۔ اتنا اصرار کہ شاہد

اس سے زیادہ کسی چیز پر اصرار نہ ہو۔ نذیر اور منذار سے پیغمبر کا تعارف کر آیا

کبھی انذار الناس اور کبھی انذار عَشِيرَتِكَ کے اوامر آئے اسی فرض کو مبرا تمام

دینے کا قرآن ہی نے جن لفظوں میں امت سے مطالبہ کیا ہے وہ صبح نامنے ہے

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَ

چاہئے کہ دین میں نقاہت پیدا کریں

لِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ

اور چاہیے کہ اپنی قوم کو بیدار کریں۔

اسی سلسلے میں نبی کا جو مقام قرآن نے نبوت کے فرائض کو فروغ دینے کے

لئے شہادت تجویز کیا تھا جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو مشن خدا

کی جانب سے نبوت کے نام پر نبی کو دیا گیا ہے۔ نبی کا فرض ہے کہ وہ اپنے مخاطبین

تک پہنچائے۔

يَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ

ہو جائے رسول تم پر شہادت

شَهِيدًا -

دیئے والا

اور جس طرح اور جس انداز سے نبی نے اپنے مخاطبوں تک پہنچایا ہے ان مخاطبینوں

یعنی امت کا فرض ہے کہ اسی طرح اور اسی انداز سے زمان و مکان کی قید سے بے

تیاز ہو کر الناس یعنی دنیا میں بسنے والی انسانیت تک پہنچائے اور اسی شہادت

کے صدقے میں اس اعزازی لقب کا اپنے کو سچا مصدق بنا دے جو اسی فرض کی

اورائسی کے نتیجے میں خدا کی جانب سے اسے ملا ہوا ہے یعنی أُمَّةٌ وَسَطًا وَاللَّعْنَةُ

اور ایسے ہی بنایا ہم نے تمکو بہترین
امت تاکہ ہو جاؤ تم شہادت دینے والے
لوگوں کے سامنے۔

كَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً
وَسَطًا لِتَكُوْنُوْا شٰهَدًا
عَلَى النَّاسِ

اور بتانے والوں نے تو یہاں تک بتا دیا ہے کہ کلمہ کے خطاب کی زد صرف ان
مخاطبوں تک نہیں ہے جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے بلکہ قیامت تک آنے والے
مسلمانوں سے یہ آیت چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے اور اسی طرح جیسے کُتِبَ عَلَيْكُمْ
الصِّيَامُ مِنَ الْجِصَّاصِ نے لکھا ہے :-

یہ ساری امت سے خطاب ہے
اگلے پچھلے سب آیت کے نزول
کے وقت موجود تھے اور جو
قیامت تک ہوں گے۔

هُوَ خِطَابٌ لِّجَمِيعِ الْاُمَّةِ
اُولٰٓئِهَا وَاٰخِرُهَا مَنْ كَانَ
مَعَهُمْ فِي وَقْتِ نَزْوْلِ
الْاٰيَةِ وَمَنْ حَبَاۤءَ بَعْدَهُمْ
اِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ

کون نہیں جانتا کہ نبی کے فرائض میں سب سے ادنیٰ مقام امر بالمعروف اور
نہی عن المنکر کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت زندگی کا جو نمونہ پیش کر رہی ہے
لوگوں کو اس کی طرف بلائے اور اس زندگی کے خلاف جہاں جو بھی کوتاہی نظر
آئے اس کو روکے اور ٹوکے۔ قرآن میں ہے

يَاۤاُمَّرُؤَهُمُ بِاللَّعْرِوْفِ وَ
يَنْهَاهُمُ عَنِ الْمُنْكَرِ

وہ بیگی کا حکم دیتا ہے برائی سے
روکتا ہے۔

اور معلوم ہے کہ اس امت کے خیرام ہونے کو قرآن عزیز نے اسی فرض کی انجام
دہی پر موقوف کیا ہے۔ فرمایا :-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ

تم بہترین امت ہو پیا گئے ہو

لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ

لوگوں کے لئے نیکی کا حکم کرتے اور

وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

برائی سے روکتے ہوئے

میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا اور نہ ہی موضوع کی معین حدود کے پیش نظر
میں ایسا کر سکتا ہوں۔ بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ عموم بخت یعنی سب کے نام
پیغام کے کر آنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انفرادی نبوت زندگی کا ایسا تکمیلی نمونہ ہو
جن سے جماعتی بخت کا انسانیت کے اہتمام ہو سکے۔

وَالسَّلَامُ عَلَيكُمْ وَرَحْمَةُ اللَّهِ

بنام مولانا مکرم محمد عرصا صاحب کاندھلوی ٹرنک بازار سیالکوٹ

دشکرت جیل سیالکوٹ

۳۱ اکتوبر ۱۹۷۷ء

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا دوسرا نام اسلام ہے، اور اس کی قرآنی توجیہ، مسلمان زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کا قیدی ہے، آزادی کا اسلامی مفہوم، تخت حکومت سے اسلامی زندگی کا مطالبہ، شہری زندگی کا بگاڑ، خلافت راشدہ کو حضور انور کی تمکین زندگی کے قیام پر اصرار تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام حکومت کا منشور، خلافت راشدہ میں اسلام کا دستور اساسی، سیاسی زندگی میں اسلام کی پابندی، عرب کی اندرونی و بیرونی حالت اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا بقائے اسلام کیلئے اقدام، امر بالمعروف کے مدارج، حضرت خدیجہ کی پردیز سربراہ ایران کے دربار میں تقریر، ہرقل کے دربار میں حضور انور کا سفیر، حضرت عمرؓ کا تاجک دعوتی دور اور حکومت کا منشور —

بجی فی اللہ! وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاه

آپ یاد آئے اور آپ کے نقطہ نظر نے دماغ میں چٹکیاں لیں

بس اسی تقریب میں کچھ عرض کرتا ہوں۔

چند بنیادی مسائل میں ایک اہم مسئلہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہے اس کے مباحث کی گہرائیوں کو یہاں سمیٹنا مقصود نہیں یہ چند ضروری اشارات ہیں۔ اس مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ دوسرے فرائض کے ساتھ مسلمانوں پر ایک فرض یہ بھی ہے کہ المعروف کا دنیا کو حکم دیں اور المنکر سے لوگوں کو روکیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی زندگی پر لوگوں کو قائم رکھنا اور اس کی طرف دعوت دینا مسلمانوں کے ان فرائض میں سے ہے جن کا بار بار قرآن نے مطالبہ کیا ہے بلکہ اسلامی سوسائٹی کے بہترین سوسائٹی ہونے کا اسے ہی معیار قرار دیا ہے۔ الجصاص نے بتایا

ہے کہ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا قانون سمجھنے اور اس قانون کے استعمال کرنے کی راہیں معلوم کرنی ہوں تو نبوت اور صحابہ و تابعین کا طرز عمل دیکھئے کہ یہ قانون کیسے اور کہاں استعمال ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن کا بے قید و رستے سخن یہی ہے کہ اسلامی زندگی کے ہر شعبے میں اسے استعمال ہونا چاہئے۔ اسلامی زندگی دراصل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا دوسرا نام ہے اور وہی کا علم نہیں میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ قرآن میں قرآن والے نے جو نوز کا لفظ کبھی قرآن کے لئے اور کبھی حامل قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بولا ہے تو اس سے یہی سمجھنا چاہتا ہے کہ اسلامی زندگی دراصل محمد رسول اللہ کی زندگی ہے۔ محمد رسول اللہ سے الگ ہو کر اسلامی زندگی کا وجود نہیں۔ شاید حضرت عائشہؓ نے پوچھنے والے کو یہی سمجھایا تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا ہیں؟ بولیں کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ کہنے والے نے کہا جی ہاں۔ ام المؤمنین نے فرمایا: خَلَقَهُ الْقُرْآنُ۔ قرآن ہی ان کا اخلاق تھا۔ یعنی اگر تم ان کے اخلاق معلوم کرنا چاہتے ہو تو قرآن دیکھ لو۔ کون نہیں جانتا کہ اسلام مسلمانوں کی زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے۔ یہ مباغض نہیں واقعہ ہے۔ کہنے والوں نے جب حضرت سلمان فارسیؓ سے طنزاً کہا کہ تَارِقًا قَدْ عَلِمْتُمْ نَبِيَكُمْ حَتَّىٰ تَمُوتُوا تمہارے نبی نے تم کو قتل کی حاجت دیکھ لی۔ لہذا تم نے اسے قتل کر دیا۔ تب تک کی باتیں بکھلا دی ہیں۔ تو حضرت سلمان فارسیؓ نے بڑے جوش اور پورے حکیمانہ انداز سے کہا تھا کہ اچھل جان واقعی ہماری زندگی میں اس گوشے کے لئے بھی ہدایات موجود ہیں۔ کہنا یہ چاہتے تھے کہ زندگی کا کوئی شہید بھی اسلام کی قید سے آزاد نہیں ہے اور مسلمان ہونے کے بعد بے قیدی اور اباحت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے کہ:

الدُّنْيَا سَبْحًا الْمُؤْمِنِ
دنیا کی زندگی مومن کا جیل خانہ ہے

اور صحیح نہ ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے تو پھر اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ مومن کی زندگی چونکہ اپنی ساری شاخوں میں قانون کی پابند ہے اس لئے یہ قیدی کی زندگی ہے۔ آزاد کی زندگی نہیں۔ مسلمان کی آزادی کا مطلب یہی ہے۔ کہ حَقَّاءِ سَب سے کٹ جائے اور مَخْلَصِينَ لِمَا الدِّينِ اور صرف ایک کا ہو کر رہ جائے اور یہ حقیقت اور اخلاص زندگی کی ایک شاخ میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں ہو۔ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ اس سے کون ناواقف ہے کہ جس ذات پیغمبر کی زندگی کا نام اسلامی زندگی ہے جو مسلمانوں کے بالوں اور ناخنوں تک کی نگرانی کرتی ہے۔ انہوں نے ہی مدینہ میں اسلام کی ایک چھوٹی سی اسٹیٹ قائم کی تھی۔ اور دس برس تک اپنی اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور مختصر سی مدت میں ہر شعبہ حکومت کو اسلامی طرز پر چکائے کی پوری پوری مشق کرادی۔ جس میں اسلام کی انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی و جنگی اور بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح کیا۔ ہر شعبہ زندگی کے لئے اصول بنے ان اصولوں کو عمل کی زندگی پر منطبق کیا۔ اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم و تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کئے گئے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اسلام زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے۔ زندگی کے ان سب شعبوں میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا اور اسلام پر قائم رکھنا امر بالمعروف اور اسلام سے الگ زندگی کے کسی شعبہ میں راہ بتانے پر روکنا اور لوگناہی عن المنکر ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دائرہ استعمال کی قرآن نے کوئی تحدید نہیں کی ہے۔ اس لئے اس کے پیروں میں کوئی ایسی قید نہیں لگائی جاسکتی جو اس کی غیر محدود آزادی کو پامال کر دے۔ فرد ہو یا جماعت ایک ہو یا بہت سے امیر ہو یا غریب، حاکم ہو یا محکوم۔ اس کا استعمالی دائرہ سب کے لئے یکساں

ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ

أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةٌ

عَدْلٌ عِنْدَ سُلْطَانٍ

الْجَائِزِ۔

سب سے بہتر جہاد ظالم بادشاہ
کے سامنے انصاف کی بات ہے۔

یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے میں سب سے اونچی برکرمی
یہ ہے۔ کہ تخت حکومت سے اسلامی زندگی کا مطالبہ کیا جائے۔ عوامی زندگی سے
اسلام کا مطالبہ بھی امر بالمعروف ہے مگر اقتدار سے اس کا مطالبہ کرنا اسلام
کی نظر میں سب سے اونچا مقام ہے بظاہر اس کی وجہ یہی ہے کہ ایسا کرنے
سے اس پر مصائب کا ہجوم ہوگا۔ مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ صرف یہی
وجہ نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ عوامی زندگیاں اقتدار کے تابع ہوتی ہیں اقتدار
میں وابستگی عوامی وابستگی ہوتی ہے۔ اور شہرت بھی اسی کو ہے کہ

النَّاسُ عَلَى دِينِ مُلُوكِهِمْ

لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں

اس لئے تخت حکومت سے اسلامی زندگی کا مطالبہ سب سے بڑا جہاد ہے
اور جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی
ہے۔ اور سب ہی جانتے ہیں کہ زندگی میں حکومت کو کتنی اہمیت ہے، تہذیب
عمران، عوام کی معاشی اور مدنی زندگی کی بنیادی اصلاحیں تخت حکومت سے وابستہ
ہوتی ہیں اور ایسی بنیادی وابستگی کہ سمجھانے والوں نے یہاں تک سمجھا دیا ہے کہ

من مفسد المدن ان

شہری زندگی کا ایک بگاڑ یہ ہے کہ بالا

ترغب عظامہم فی دقائق

دست قوت عمدہ عمدہ زیور اچھے پوشاک

الحلی واللباس والبناء والمطام

بہترین مکان۔ لذیذ خوراک اور عودت

وعید النساء

کی نازک اندامیوں میں لگ جاتی ہے۔

اور تباہی والوں نے ہی اس کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ :-
 جب بالادست قوت یہ مشغلہ اختیار کرے گی۔ تو لوگوں میں معاشی
 بحران پیدا ہو جائے گا۔ اور اصلاح ناپید ہو جائے گی۔
 اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ

وذا لك حنرا بهذا
 المدینة يتعدى من عضو
 الی عضو حتى یعم الكل فیها و
 یجاری فیها كما یجاری الكلب
 فی بدن المكلوب۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

بالادستی کا یہ میلان سوسائٹی
 میں پھیل جائے گا اور اس طرح
 پھیلے گا۔ جیسے ہڑک پھیلا کرتی
 ہے۔

جب یہ واقعہ ہے کہ عظماء اور اقتدار کی عیش پرستیوں متعدد ہو کر ساری
 سوسائٹی کو خراب کر دیتی ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تخت پر بیٹھنے والے کی بدصوتی
 خود تخت کے تختوں کو باعیب بنا دیتی ہے تو پھر اس میں تعجب اور حیرت کی کونسی بات
 ہے کہ اگر تخت ہی سے اسلامی زندگی کا مطالبہ کر دیا جائے اگر جانتے ہو کہ مدنیت
 معشیت اور معاشرت کی اصلاح کے لئے تختہ نہیں۔ بلکہ تخت ہی ریڑھ کی ہڈی اور
 بس کی گانٹھ ہے۔ تو یہ کیوں نہیں مانتے کہ تخت سے اسلامی زندگی کا مطالبہ اسلام
 کے عائد کردہ فرض امر بالمعروف کا سب سے اونچا مقام ہے تم مانو یا نہ مانو
 میں ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی زندگی کا جو
 تکمیلی نمونہ پیش کیا تھا۔ اور قرآن نے ان لفظوں سے جس زندگی کے کمال
 کا اعلان کیا تھا کہ

الیوم اکملت لکم دینکم
 آج میں نے تمہارے لئے تمہارا
 دین مکمل کر دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خلفائے راشدین میں سے ہر ایک نے اپنے عملی نمونوں سے اس نظام پر عمل کر کے دکھایا ہے اور صرف عمل ہی نہیں بلکہ یہ کہ اسلام کو زندگی کے اسی تکمیلی نمونہ کے قائم کرنے پر اصرار ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے مسلمانوں کو ہر قیمت پر اس نظام کو قائم کرنے کی تک و دو میں آخر وقت تک منہمک رہنا چاہیے اسلام کے نظام سیاست میں خلفائے راشدین نے عمل کے جو نمونے چھوڑے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتے تو سمجھنے والے سمجھ جاتے اور نتیجہ نکالنے والے نتیجہ نکال لیتے کہ حکومت کا جو معیار مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کر کے دکھایا تھا۔ اور جسے بعد کو خلفائے قائم رکھا تھا۔ ہے تو وہ بہترین اسٹیٹ کا نمونہ لیکن اسٹیٹ کے اسی نمونہ پر اصرار کرنا اسلام کا مقصود نہیں ہے جیسے کہ کچھ منجملے کہتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہوئے خیال نہیں کرتے کہ اگر اسلام کو سیاسی زندگی میں اسٹیٹ کا وہ نمونہ مقصود نہ ہوتا۔ تو بلاشبہ عمل کی وہ سرگرمیاں نہ ہوتیں جو خلفائے راشدین نے قائم کی تھیں۔ آپ خود سوچیں کہ اسٹیٹ کے اس نمونہ کو جن جن راہوں سے ختم کرنا مقصود تھا۔ خلفاء ان سب راہوں سے دست و گریباں ہوئے اور اس سبب چاکی سے آنے والے مسلمانوں کے لئے یہ سبق چھوڑ گئے کہ اس راستہ کے ہر پتھر سے ٹکرا جاؤ۔ مسلمان واقعی بن کر رہو ورنہ زندگی کو خیر باد کہہ دو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوئے حق سبحانہ نے حضرت ابوبکرؓ کو امت کا امام بنایا اس دور میں حکومت کے قابلوں کے ساتھ ساتھ حکومت کی پالیسی کو واضح کرنے کے اطوار بھی بدلے ہیں۔ اب کچھ ہو پہلے یہی قاعدہ تھا کہ جو بھی امام ہوتا۔ جس کے ہاتھوں میں سیاسی قیادت آتی۔ قیادت چاہے انتخابی ہو یا استبدادی جیسی بھی ہو رواج یہی تھا کہ منتخب ہونے یا قابض ہونے کے بعد امام تقریر کرتا اس تقریر میں وہ اپنی حکومت کی پالیسی کو ظاہر کرتا یہی تقریر اس حکومت

کا منشور سمجھی جاتی۔ منشور کے کاغذی شکل میں مرتب کرنے کا ڈھنگ اس وقت نہ تھا مگر فتح ہوا فتح کے بعد اسلامی حکومت قائم ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تقریر کے ذریعے جدید حکومت کی پالیسی بیان کی بلاذری نے لکھا ہے کہ آپ نے اس تقریر میں بنیادی باتیں فرمائیں یہ تھیں۔

الف:- قتل کے پچھلے سبب و عوے ختم۔

ب:- جاہلیت کے سبب نشان ختم۔

ج:- بیت اللہ کی نگرانی کا فرض وہ ہی انجام دیں گے جو پہلے دیتے تھے۔

د:- حاجیوں کی دیکھ بھال کا کام وہ ہی لوگ کریں گے جو پہلے کرتے تھے۔

اسی رواج کے مطابق منتخب ہونے کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے تقریر کی اسی میں اپنی حکومت کی پالیسی بالفاظ دیگر دستور اساسی کا اعلان کیا تھا۔ ابن عبد ربہ نے العقد القریب میں پوری تقریر نقل کی ہے۔

خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔

لوگو! امانت کے لئے قرعہ فال میرے نام نکلا ہے۔ میں تم سے بہتر اور اچھا

نہیں ہوں سن لو اگر میں راستی پر ہوں تو میرا ہاتھ بٹاؤ راستی سے ہٹ جاؤں۔
تو مجھے ٹھیک کر دو سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے تمہارے نزدیک سوسائٹی

میں جو کمزور ہے میرے نزدیک حق لینے کی خاطر وہ قوی ہے۔ اور تمہارے نزدیک

جو ٹوٹا ہوا ہے میرے نزدیک حق کے معاملے میں وہ کمزور ہے۔ (یعنی سوسائٹی

میں جو قوت کے گھمنڈ پر حق دبائے گا وہ میرے نزدیک کمزور ہے۔ میں اس سے حق

ضرد لوں گا۔ اور جو سوسائٹی میں جرم ضعیفی کا شکار ہے۔ وہ میرے نزدیک حق لینے

کے لئے قوی ہے قوی کو قوت کے زور سے کچھ نہیں دیا جائے گا اور ضعیف کو ضعف

کی وجہ سے پائال نہ کیا جائے گا۔ تمہیں دین کی خاطر سرفروشی کو کسی حال میں نہ

چھوڑنا چاہئے۔ یاد رکھو جو قوم سرفروشی کے میدان سے ہٹ جاتی ہے فلتوں کا شکار ہوتی ہے۔

لوگوں کو سمجھ لو جب تک میں خدا اور اس کے رسول کا دامن اطاعت ہاتھ میں تھامے رہوں تو تم بھی میری اطاعت کرو۔ اور جہاں جس مرحلے پر میں خدا کی نافرمانی کروں تو نہ میری اطاعت ہے اور نہ کوئی ڈسپلن۔“

یہ اسلام کا پہلا امام ہے اور پہلے امام کا یہ پہلا خطبہ ہے۔ یہ گویا حکومت اسلامی کا دستور اساسی ہے اس میں کھول کر حکومت کے خط و خال بتا دیئے گئے ہیں۔ بنیادی باتیں یہ ہیں۔

الف:- صدر حکومت کی حیثیت عام شہری کی ہوگی اور صدر حکومت کو اپنے اعمال میں کوئی برتری نہ ہوگی۔

ب:- ہر شہری کا فرض ہوگا۔ کہ نیکی کی حد تک صدر حکومت کی مدد کرے۔ غلطی دیکھے تو روک دے اور ٹوک دے۔

ج:- زیر دستوں کو زیر دستوں پر ظلم کی اجازت نہ ہوگی۔

د:- ڈسپلن اس حد تک قائم رکھا جائے گا جب تک صدر حکومت خدا اور رسول کا فرماں بردار رہے۔

۴:- کسی ایسے قانون اور حکم کو ہرگز نہ مانا جائے گا۔ جس سے خدا کی نافرمانی کی بو آتی ہو۔

یہ پانچ دفعات پر مشتمل منشور ہے۔ اور شاید زندگی کی زلفوں کی کوئی بھی پیچیدگی نہیں جو نہ کھل گئی ہو۔ اس دستور میں قانون سازی کی بنیاد، عدالت کا دائرہ عمل، صدر ریاست کی حیثیت شہری زندگی کی آزادی اور حکومت کی داخلی اور خارجی پالیسی کو صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ امریکہ کا وہ مشہور آئین جو ۱۷۸۷ء میں بنایا گیا تھا۔ سات دفعات پر مشتمل تھا۔ ابھی ابوبکر صدیقؓ کی حکومت قائم ہوئی تھی کہ اسلامی زندگی کے تکمیلی نمونے کو ختم کرنے کے لئے عرب میں نبوت کا فتنہ کھڑا ہو گیا۔ قبیاد غطفان میں طلحہ بنو حنیفہ میں سلیمہ بن میں اسود اور بنی تمیم میں مشہور عورت سجاح نے نبوت کا دعویٰ کر دیا گویا منظم سازش یہ تھی۔ کہ سرکار مدینہ کے نقوش نبوت کو نبوت ہی کے ذریعے پامال کر دیا جائے۔ اور اس طرح زندگی کے اس تکمیلی نمونے کو تار تار کر دیا جائے۔ جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے نام سے پیش کیا تھا۔ یہ مقام کی بڑی ہی نزاکت ہے کہ ایک طبقہ نہ توحید اسلامی سے اختلاف رکھتا ہے نہ رسالت محمدیہ کا منکر ہے۔ بلکہ ان دونوں باتوں کے اقرار میں وہ دوسرے مسلمانوں کا شریک ہے۔ اس کا صرف یہ مطالبہ ہے کہ نبوت محمدیہ کے زیر اثر ایک نئی نبوت کو بھی تسلیم کر لیا جائے۔ حتیٰ کہ بعض اصحاب سیر نے لکھا ہے۔ کہ مسیلمہ کی مسجد کا مؤذن اذان میں توحید و رسالت کی شہادت اسی طرح دیتا تھا۔ جس طرح مسلمانوں کی مسجد کا مؤذن دیتا ہے۔

حالات یہ ہیں کہ دشمن باہر چاروں طرف سے تاک لگائے بیٹھا ہے۔ سیاسی شعور والے ایسے وقت میں مصلحت اور پالیسی کے پابند ہوتے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت صدیق اکبرؓ نے باہر کے عظیم الشان فتنوں کو دیکھتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ لوگ کلمہ گو اور پابند صوم و صلوات ہیں۔ مسلمانوں کا ذبیحہ کھاتے ہیں۔ ان کو دائرہ اسلام سے نکال کر مرتد قرار دے کر پورے جوش سے جو بات فرمائی تھی وہ سننے کے قابل ہے۔

تم الدین والنقطع الوحی
دین پورا ہو چکا ہے وحی بند ہو
اینقص وانا حی
گئی کیا میری توحیدگی میں دین کے اندر کمی ہوگی؟

کیا اس کا اس کے سوا اور کوئی مطلب ہو سکتا ہے کہ اسلامی زندگی کا تکمیلی نمونہ
 جو سرکارِ مدینہ نے پیش کر دیا ہے۔ اس کے لئے متبادل نمونہ تو بڑی چیز ہے بلکہ
 اس میں کوئی جزوی ترمیم بھی منظور نہیں کی جاسکتی۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت
 صدیق اکبرؓ کو زندگی کے ہر پہلو میں اس نمونے کے قائم کرنے پر کتنا اصرار ہے۔ کیا
 اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے کوئی عبرت نہیں ہے جو آئے دن مسلمانوں میں
 نبوت کے نام پر نئے نئے چراغ روشن کرتے رہتے ہیں۔ کیا صدیق اکبرؓ نے اپنے
 عمل سے یہ نہیں بتایا کہ ملک کے سیاسی تقاضے خواہ کچھ ہوں حالات کیسے ہی
 ناموافق ہوں مسلمانوں کا شمارہ کم ہونے کا کیسا ہی اندیشہ ہو۔ دشمن خواہ کیسا ہی
 تاک رہا ہو۔ لیکن زندگی کے اس نمونے کا ایک تار بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے گا
 جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا ہے گویا مسلمان گھٹتے ہیں تو گھٹ
 جائیں مگر اسلام کو نہ گھٹنے دیا جائے گا اور بھی سنئے۔ یہ سارے مسلمان جدید نبوت
 کے ماننے والے نہ تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو نبوت تو سرکارِ مدینہ کی ملتے تھے مگر اپنے
 مالیاتی مسائل کی حد تک اسلام میں جزوی ترمیم چاہتے تھے کہنا یہ چاہتے تھے کہ پرائیویٹ
 لائف کی حد تک ہم اسلام کے پابند ہیں۔ مگر سیاسی زندگی میں ہم پر اسلامی زندگی کی
 پابندی ضروری نہیں اور اس سارے مضمون کا عنوان زکوٰۃ کی عدم ادائیگی تھی۔
 غور فرمائیے کہ اگر آپ کے یہاں کوئی بستی مالیہ اور ٹیکس کی ادائیگی بند کر دے
 تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے کہ ہم تمہاری سیاسی بالادستی تسلیم
 نہیں کرتے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے عمل سے مسلمانوں کو بتا دیا کہ جو لوگ اپنی
 سیاسی زندگی میں اسلام سے آزادی کے خواہاں ہیں اور اپنی سیاسی خواہشات
 کو اسلام کے تابع کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے مقابلہ میں ہر قسم کی مصلحت اندیشوں
 سے بے پرواہ ہو کر ان کی نساہت اور ان کے روزوں سے بے نیاز ہو کر

آستینیں چڑھا کر سر تکف میدان میں کود جانا چاہئے۔ بلاذریؒ نے جو حضرت عبداللہ
بن مسعودؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ

لقد قمنا بعد رسول الله
مقامًا كدنا نهلك فيه
لولا ان الله من علينا
بأبي بكر -

ہم حضورؐ کے بعد ایسے مقام پر
پہنچ گئے کہ قریب تھا کہ ہمارا کام
تمام ہو جائے اگر اللہ نے ہم پر ابوبکر کے
ذریعے احسان نہ کیا ہوتا۔

تو یہ کوئی مباغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ کہنے والوں نے کہا تھا کہ سیاسی زندگی میں
اسلامی زندگی پر اصرار ضروری نہیں ہے بہر حال مسلمان تو ہیں۔۔۔ سیاسیات میں
اسلام کو مانیں یا نہ مانیں۔ مناسب نہیں کہ صرف زکوٰۃ کی عدم ادائیگی پر قتال کیا جائے
ہمیں خدا کو یاد کرنا چاہئے ان مشورہ شوں میں حصہ نہ لینا چاہئے۔ فتوح میں حضرت
عبداللہؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

اجتمع رأينا جميعا على ان
لا نقاتل على بنت خنساء
وان تأكل قري عربة و
نعبدا لله حتى ياتينا
اليتيين

ہم سب کی رائے یہی ہوئی کہ اونٹ کے
بچے اونٹ عربی دیہات کے پیچھے ہم نہ لڑیں
ہمیں تو موت تک اللہ کی عبادت
کرنی چاہئے۔

لیکن اللہ نے صدیق اکبرؓ کو امامت ہی اس لئے دی تھی کہ سیاسی زندگی میں
بہر حال اسلامی زندگی کو رکھا جائے اور اس پر اصرار کی حد یہ تھی کہ کوئی بات کوئی
حادثہ اور کوئی مصلحت ان کو بال برابر بھی اس سے نہ ہٹا سکی۔

من رہے ہر کہ اجتماع رأينا على ان لا نقاتل یعنی رائے یہی تھی کہ
خدا کی بندگی کی جائے اور یہ لوگ اسلام کو جس حد تک مانتے ہیں اسی پر قناعت

کر لی جائے۔ حضرت عمرؓ نے صاف صاف لفظوں میں کہا تھا کہ کیا آپ اس آبادی سے جنگ کریں گے جو لا اقر الا اللہ پڑھتی ہے۔ فتنہ کی ہمہ گیری کا یہ حال تھا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ

اس قتلت العرب کا فتنا سارا کا سارا عرب ارتداد کی گرد میں جا بیٹھا

اور دور اندیش نگاہیں اس بحران سے پریشان تھیں حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھ لیا کہ :-

با ابا بکر تقابل العرب کا فتنا لے ابو بکر کیا تم سارے عرب لو لو گے؟

حضرت ایک نہیں سارے عرب میں اگ لگی ہوئی ہے۔ لیکن صدیق اکبرؓ عزیز امت الہی

عزہم اللہ لابی بکر علی اللہ نے ابو بکر میں ان سے ٹکر لیے پر

قتالہم عزیمت پیدا فرمادی۔

کی روح سے سرشار تھے فرمایا

واللہ لو منحونی عقلا مما بخذا اگر معمول کے خلاف ایک نہی میں

کا لو ایطون فی زمن رسول بھی رکاوٹ ہوگی تو اس کے لئے بھی میں

اللہ لقاتلہم علیہ۔ ان سے لڑوں گا۔

کہنا یہی چاہتے ہیں کہ متبادل تجربہ تو بڑی بات ہے میں تو سیاسی زندگی میں

اسلام قائم کرنے میں ادنیٰ سے ادنیٰ کمی بھی برداشت نہ کروں گا اور بتانے والوں

نے یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت عمرؓ ہی کو مخاطب کر کے صدیق اکبرؓ نے وہ بات بھی

کہی تھی جو پہلے سن آئے ہو کہ

تم اللذین وانقطع الرحی دین پورا ہو چکا ہے اور رحمی بند ہو

اینقض وانما حتی۔ چکی کا پیر ہی موجودگی ہمیں دین میں

کئی کی بسے گی۔

اسلامی زندگی کا تکمیلی نمونہ موجود ہے وحی کا دروازہ بند ہے یہ ناممکن ہے کہ ابوبکر
 بعید حیات ہو اور اس تکمیلی نمونہ کی کسی شاخ میں کوئی کمی کر دی جائے۔ — عبرت کا
 مقام ہے کیا کسی نصب العین کے قائم کرنے پر اتنا بڑا اصرار اور اس کے حصول کی
 اتنی بڑی کوشش کوئی کر سکتا ہے جتنی حضرت ابوبکر نے کی ہے۔ کیا اس میں یہ نہیں
 بتا گیا ہے کہ جسم اسلام پر جدید نبوت کا دارغ اور ترمیم و تخفیف اور تحریف کا نشان
 جب بھی اور جہاں بھی نظر آئے اسے دور کر دینا اور مٹا دینا اسلامی زندگی کا اولین
 فریضہ ہے۔

قانون اور فقہی نقطہ نظر سے اسی کو الامر بالمعروف اور النهی عن المنکر کہتے ہیں۔
 یعنی لوگوں کو زندگی کی ہر شاخ میں اسلام پر قائم رکھنا قرآن کے نزدیک اسلامی حکومت
 کے واجبات میں سے ہے۔

الَّذِينَ اِنْ مَكَتَاهُمْ فِي الْاَرْضِ
 اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ
 وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَ
 نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ
 یعنی وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین میں
 فرمانروائی دینے تو نماز قائم کریں گے
 زکوٰۃ دیں گے معروف کا حکم دیں گے
 منکر سے روکیں گے۔

یہی اسی پر زور دیا گیا ہے کہ کسی حکومت کے ذراصل اسلامی ہونے کا معیار یہ ہے کہ
 وہ اقامت معلوۃ اور ایتاؤ زکوٰۃ کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام
 دے رہی ہو۔ — جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس فرض کو قرآن نے بے قید
 رکھا ہے اور اس فرض کی ادائیگی میں حاکم و محکوم یکساں۔ اسی بناء پر مسلم کی ابو سعید
 خدریؓ والی روایت نے اس فرض کے مدارج مقرر کیے ہیں۔ ارشاد ہے۔

من رأى منكم منكراً فليغيره
 بيده فان لم يستطع
 فليغيره بيده
 جو شخص تم میں سے کسی برائی کو دیکھے
 اسے چاہئے کہ ہاتھ سے ہٹا دے

فيلسا فدا فان لم يستطع
اگر ہاتھ میں پٹانا بس میں نہ ہو تو زبان

فبقليه وذلك اضعف
سے اگر یہ بھی بس میں نہ ہو تو دل سے

الایمان - برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے

حضرت صدیق اکبرؓ نے پہلی صورت پر عمل کیا اور ثابت کر دیا کہ صدیقین کی حکومت

امر بالمعروف اور نہا ہی عن المنکر ہے۔ شاید کچھ لوگوں کو انہی مدارج کی وجہ سے خیال پیدا

ہو کہ جب برائی دور کرنے اور لوگوں کو اسلام کی زندگی پر قائم رکھنے کے درجات ہیں تو

کیوں یہ کام زبان سے نہ کر لیا جائے یا صرف دل سے برا سمجھ لے۔ ایسا سوچنے

والوں کے لئے قرآن کی یہ مشہور آیت بھی شاید سہارا بن جاتی ہو یا بن گئی ہو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ
اے ایمان والو! پھٹ جاؤ اپنے آپ کو

أَنفُسِكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَن ضَلَّ
نہ ضرر دے گا وہ شخص جو گمراہ ہے اگر

إِذَا هتَدَيْتُمْ
جب تم ہدایت پر ہو گے

جس کا حاصل یہی ہے کہ لوگوں کو اپنی ذمہ داریوں ہی کا خیال کرنا چاہئے۔ یہی کہتے سنا

گیا ہے کہ ظالم ظلم کرو یا ہو خاموش رہنا چاہئے استدلال کرنے والوں نے اسی آیت

سے استدلال کیا ہے

شاید ابن ماجہ اور ترمذی کی وہ روایت اسی عقدہ کا اصل ہے جس میں اسی آیت

کے متعلق حضرت ابو بکرؓ کا ایک بیان نقل کیا گیا ہے

لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو یا ایُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسِكُمْ

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ

سومائٹی میں جب منکر رونما ہوا اور اس کے سر کلنے کا کوئی سامان نہ ہو

تو اندیشہ ہے کہ اس کے نتیجے میں جو الہی گرفت لگے وہ سب کو لپیٹ لے

(ابن ماجہ، ترمذی)

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس بیان نے ایک بڑی مشکل کو حل کر دیا ورنہ شاید سمجھنے والے آیت سے یہی سمجھتے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فرضیت نسخ ہے۔ ابو بکر الجصاص نے حضرت صدیق اکبر کا بیان نقل کرنے کے بعد جو قانونی اور فقہی نتیجہ اس سے نکالا ہے کہ

فاخبر ابو بکر ان هذه
الآية لا تخصنا فيها في
ترك الامر بالمعروف والنهي
عن المنكر وانما لا يضرنا
ضلال من ضل اذا اهتدى
هو بالقيام بغير من الله
من الامر بالمعروف والنهي
عن المنكر

حضرت ابو بکر نے بتایا کہ اس آیت میں
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑنے
کی رخصت نہیں ہے اور اس آیت میں
بھی ہے کہ گمراہ کی گمراہی ایمان والے
کو اس وقت نقصان نہیں دیتی جب
کہ وہ فرض الہی امر بالمعروف اور
نہی عن المنکر ادا کر رہا ہو۔

اس کا اس کے سوا اور کیا مطلب ہے کہ یہی آیت جسے اس فرض کی ادائیگی میں رخصت کا ہتھیار سمجھا جاتا ہے صدیق اکبر کی دور رس بصیرت نے اسی آیت سے اس فرض کی ذمہ داری کو اور بوجھل بنا دیا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زور سے یہ سمجھایا ہے کہ اگر ایک مسلمان غیر اسلامی ماحول میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض کو ادا کر رہا ہے تو اسے دنیا کی کوئی گمراہی نقصان نہیں پہنچا سکتی اور ایمان کی اصلی حفاظت یہی ہے اور اسی وقت یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ
الْفُسُكُ

اے ایمان والو! لازم پکڑ لو اپنے آپ کو

ایمان والوں سے خطاب ہے اور عَلَيْكُمْ کا مورد الَّذِينَ آمَنُوا ہے مطلب یہ ہے

کہ ایمان والا اپنی ایمانی زندگی کی خود نگرانی کرو۔ اگر تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرضاً
 سہرا انجام دیتے رہو گے تو کوئی ضلالت تمہاری ایمانی زندگی کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔
 میں کہہ رہا تھا کہ کسی حکومت کے اسلامی ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ
 امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے رہی ہو۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی حکومت
 اس اعتبار سے پوری پوری قرآن کی کسوٹی پر اترتی تھی۔ دراصل قرآن عزیز نے جو کام
 نبوت کے سپرد کیا تھا یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جسے انجام دینے کے
 لئے اللہ کا پیغمبر آیا تھا اور قرآن نے یا مَوْحَّدًا بِالْمَعْرُوفِ وَيُنْهَاهُمْ عَنِ
 الْمُنْكَرِ کہہ کر پیغمبر کا یہی کام بتایا بھی ہے تو اب اصولاً جو اقتدار دنیا میں اقامت صلوة
 اور ایثار و زکوٰۃ کے ساتھ اس فرض کو انجام دے گا وہ ہی اسلامی زندگی کے نمونہ
 والا اقتدار ہوگا۔ یعنی اس کے اقتدار کو خلافت کہیں گے اور جسی سوسائٹی میں اس فرض
 کو انجام دینے والے عناصر موجود ہوں گے وہ خیر امت کہیں گے۔
 مَا يَذُكُّكُمْ أَنْفُسِكُمْ كِ آیت سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ
 سے سبکدوشی کی راہ سوچنا دراصل کار نبوت سے نراہ کی راہ سوچنے کے مترادف
 ہے اور درحقیقت اس تصور سے خود اپنی امت کے خیر امت ہونے کی نفی کرنا ہے
 شاید خدا نے ابو بکر کو اسی راہ کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے منتخب کیا تھا اور سائے
 تاب کا ارتحالی حادثہ صحابہ کے لئے کیسا ہوش و باعادتہ تھا۔ بڑوں کے پھلے پھری
 گئے مگر اللہ اکبر! آنسو ڈبڈبا رہے ہیں آواز بھڑائی ہوئی ہے حضرت ابو بکرؓ منبر پر تشریف
 لے جاتے ہیں۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ اللَّهَ فَإِنَّ
 مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ
 يَعْبُدُ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ حَيٌّ

جو شخص تم میں سے آنحضرت کی پر جا
 کرتا تھا تو آنحضرت کا وصال ہو گیا اور
 جو شخص تم میں سے اللہ بجانہ کی پر جا کرتا ہے

خط جا چکے ہیں۔ فارسی حکومت درفش کاویانی کے سایہ میں نہ صرف ایران پر قابض تھی بلکہ ایک طرف ہندوستان تک اور دوسری طرف عراق و عجم کے آگے پاؤں پھیلانے بیٹھی تھی۔ فارس کی حکومت کا دبدر ایشیا اور یورپ دونوں پر قائم تھا۔ عرب کے اکثر اہم حصے بحرین، عمان، یمن اس کے زیر نگیں تھے جس طرح حکومت کا اقتدار تھا اسی طرح کچھلاہ ایران خسرو پوریز کے زمانے میں دربار کی شان بھی بڑھی ہوئی تھی۔ آداب شاہی، درباری لباس اور شاہی باڈی گارڈ کی ہیبت و سجاوٹ دیکھ کر اچھے اچھے انسانوں کے چھکے چھوٹتے تھے۔

شہدہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن حذیفہ کو خط دے کر بحرین روانہ کیا اور ہدایت کی کہ حاکم بحرین کی وساطت سے خسرو پوریز حاکم فارس تک خط پہنچائیں۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

يَا أَيُّهَا سَيِّدُ الْمُرْسَلِينَ اللَّهُ إِلَى النَّاسِ فِيهِ الْإِسْلَامُ سَائِبِ النَّاسِ فِي كُلِّ سَوْرَةٍ

کائناتاً لِيُنذِرَ مَنْ كَانَتْ فِيهِ سَمُورَةٌ مِنْ أَسْمَاءِ مَا يَكُونُ

حَيَاتًا إِسْلَامًا تَسْلَمُ فَمَا نَكَّرَ زَنْدُونَ كَوَيْسَلَانَ هُوَ جَانِحٌ

فِي رِابِعِ ابْنِ بَيْتِ فَحَلِيكَ أَمَّ الْجِيوسِ جَاءَ كَا أَرْتُونَ انْكَارِيَا تَوْجُورِيَا

سَائِبِ النَّاسِ فِي كُلِّ سَوْرَةٍ كَا بُوَجِبَ بِي تَجْهِي بُوَكَا

خط پہنچا اور پڑھا کیا۔ امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالے سے بتایا

ہے کہ خسرو پوریز نے نامہ مبارک کو پورے پورے کر دیا۔

فَلَمَّا قَرَأَ كَثِيرِي ضَرْقَمَا كَسْرِي فِي خَطِّ بَرْتَهَا أَوْرِيَا بَرْتَهَا كَرِيَا

حضرت عبداللہ بن حذیفہ نے دربار نبوت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ اس خط کو پڑھ کر میں نے کہا کہ اس خط کو پڑھ کر میں نے

فِي عَا عَلِيٍّ مَرَّ سَوْرَتِ اللَّهِ حَضْرَتِ صَالِيٍّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيْ أَنْ كَيْلِيَّ بَارِيَا

ان یحزقوا کل مہشرق ہونے کی بددعا فرمائی۔
 علامہ سویل نے الروض الاف میں واقعہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے
 کہ خسرو پرویز نامہ مبارک پر چین چین ہوا۔ تو حضرت عذیقہؓ نے دربار میں
 گھڑے ہو کر دو بار یوں کے اور بادشاہ کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا
 فرض اس طرح انجام دیا۔۔۔ بولے

اے اہل فادس عرصہ دراز سے تمہاری زندگی نادانی میں بسر ہو رہی ہے۔
 تمہاری زندگیاں الف سے یاتک کتاب اور ہدایات نبوت سے نا آشنا ہیں
 جس اقتدار پر تم کو ناز ہے وہ بہت ہی تھوڑی سی زمین کا اقتدار ہے زمین پر اس سے
 بڑی بڑی حکومتیں رہ چکی ہیں۔ اے فارس کے فرمانروا تجھ سے پہلے بہت سے بادشا
 گذر چکے ہیں ان میں سے جس نے معاد کو منزل مقصود سمجھا وہ اس دنیا سے کامیاب
 گیا اور جس کی تگ و دو اور پیش نہاد صرف یہ دنیا رہی اس نے آخرت کو ضائع
 کر دیا۔ اس دنیا کی دوڑ دھوپ میں ہر شخص مختلف النیال ہے لیکن آخرت کا انصاف
 سب کے لئے یکساں ہے۔ افسوس میں جس پیغام کو لے کر تیرے پاس آیا۔
 تو نے لے سے حقارت سے دیکھا حالانکہ تجھے معلوم ہے کہ یہ پیغام ایسی جگہ سے
 آیا ہے جس سے خود تیرا دل کانپ رہا ہے۔ یاد رکھ حق کا یہ آوازہ تیری تھیر
 سے دب نہیں سکتا اور تیری تکذیب تجھے حق کی زد سے بچا نہیں سکتی۔ واقعہ
 ذی قار اس کا گواہ ہے۔"

کہتے ہیں کہ خسرو پرویز کا پارہ حرارت چڑھ گیا اور اس نے حضرت عبداللہؓ
 سے کہا کہ ایران ہے شام نہیں ہے۔

عدیق اکبرؓ نے اپنے زمانہ میں یکم محرم الحرام ۳۱ھ میں اس ہم کو پھرتی
 کیا اور اس مقصد کے لئے حضرت خالد بن ولیدؓ کو مدینہ لے کر روانہ ہوئے

دوسری طرف شام میں رومی حکومت تھی جس کے ذمہ اثر نہ صرف یورپ
تھا۔ بلکہ تمام شام اور عرب و عجم کے بعض حصے تھی۔ قوانین و ضوابط اور نظم
حکومت کے لحاظ سے روم کو وہ مقام حاصل تھا کہ یورپ کی موجودہ حکومتیں
آج تک رومن لاو کاراگ الایتی ہیں۔ اس زمانے میں روم کی حدود یہ تھیں
شمال مشرق میں ترکستان اور روس۔ جنوب میں شام و مصر۔ مغرب میں بحر
روم اور اندلس، تخت حکومت پر ہرقل براجمان تھا۔ اور قیصر کے لفظ سے پکارا
تھا۔ عملی طور پر ہرقل کی شخصیت عہد جدید و قدیم میں خاص امتیاز رکھتی تھی
ہرقل کا کوئی شاہی روم سے ایک سنت پوری کرنے کی خاطر فلسطین جا رہا تھا
ادھر دتبار رسالت سے حضرت وحیہ کو امر بالعروف کانفرنس انجام دینے کے
خط دے کر ہرقل کی طرف روانہ کیا جا رہا ہے۔ وحیہ کو ہدایت تھی کہ بصری کے حاکم
کی وساطت سے خط کو ہرقل تک پہنچانا۔ حضرت وحیہ کو راستہ ہی میں معلوم ہوا
حاکم بصری نہیں بلکہ حمص میں ہے وحیہ نے ادھر کا رخ کر لیا
حسقلانی نے مشہور محدث ابن السکین کے حوالہ سے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ
رسالت سے وحیہ کے بعد فوراً ہی حضرت عدی بن حاتم کو بھی حضرت وحیہ
امانت کے لئے روانہ کیا گیا حضرت وحیہ نے حمص میں پہنچ کر دلا نامہ حارت
کو دیا۔ حارت نے خط اور واحد دونوں کو تھا ہی دبار میں بھیج دیا۔ پہنچے خط
ہرقل کو جب خط ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرف کا کوئی شخص یہاں مقیم ہو تو لے آؤ
قریش کا ایک تجارتی قافلہ قریب ہی غرہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ امیر قافلہ ابو سفیان
جوا بھی مسلمان نہ ہوئے تھے۔ اس دعوتی وفد کے ساتھ گیا ہوا اس کی تفصیلات مشہور
ہیں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسند میں اس دعوت کی تکمیل کے لئے تیار
کی۔ وفات والے سال ابامہ کی قیادت میں ایک دستہ روانہ کرنے والے تھے

بات ہو گئی۔ صدیق اکبرؓ نے حضرت اسامہؓ کو روانہ کیا۔ اسامہؓ کو روانہ کرتے
وقت ایک عجیب شاعر ہوا گیا۔ اسامہؓ عمر میں چھوٹے تھے صحابہ کا کہنا تھا کہ کسی
مرد سیدہ کو قیادت دیکھے۔ بولے۔

يُولِيْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَيُضْرِبُ
اللّٰهَ كَاطْيَعِيْرَاتٍ مِّنْ حَاكِمِ بَنِيْ اَدْرِ

ابو بکر۔ ابو بکر معزول کرے۔

دیکھا آپ نے زندگی کا جو نمونہ رسالت مآب چھوڑ کر جا چکے تھے۔ ابو بکر اس
نمونے سے بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ بلکہ لکھتے والوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ اس
دنیا میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان اس درجہ تشریح کھائی ہو گئی
حضرت عمرؓ ان انصار کے ساتھ رائے دے رہے تھے جن کا خیال تھا کہ اسامہؓ عمر
کو چھوٹے ہیں کسی بڑے کو روانہ کیا جائے۔ کسی معمولی سی بات ہے۔ لیکن صدیق
اکبرؓ نے ہو گئے حضرت عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی۔ اور بولے۔

عَدِمْتُكَ اُمَّتُكَ يَا اَبْنُ

الخطابِ اسْتَحْلَمَهُ رَسُوْلُ

اللّٰهِ وَتَا صُرِّحَ اَنْ اَنْزَعَهُ۔

اس کے ہٹا دینے کا حکم دیتا ہے۔

دیکھا آپ نے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کو اس نمونہ کے قائم کرنے اور رکھنے پر کتنا

صلو ہے۔ کہ معمولی سی تبدیلی بھی گوارا نہیں کرتے۔ اسی دستہ میں جانے والوں میں

رسالت آگے نے حضرت عمرؓ کا نام بھی رکھا تھا۔ صدیق اکبرؓ نے عمرؓ کو روکنا چاہتے تھے

مگر اختیار ناطق کو استعمال نہیں کیا۔ نہایت لجاجت سے اسامہؓ کو کہتے ہیں۔

اِنِّي رَاَيْتُ اَنْ تَعِيْنِي بَعْمَا

میرا خیال ہے کہ عمرؓ کو چھوڑ کر اگر تم میرا

درد کر سکتے ہو تو کرو۔

حضرت اسامہؓ نے حضرت عمرؓ کو مدینہ ٹھہرنے کی اجازت دیدی۔ اللہ اکبرؓ

اس نمونہ سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کتنا پیار ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
 پیش فرمایا تھا۔ کہ کسی درجہ میں کوئی ترمیم بھی منظور نہیں۔ نہ جانے لوگ کس کس
 طرح سوچتے ہیں مگر میں تو سمجھتا ہوں کہ حضرت ابو بکرؓ کو رسالت کی اسلامی نمونے
 کی زندگی کو قائم رکھنے پر اتنا اصرار تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے مگر زندگی کا صرف
 عبادات ہی میں نہیں بلکہ سیاسیات میں جو نمونہ چھوڑ گئے اسے ہی قائم رکھا
 جائے اس راہ میں ادنیٰ اسی چشم پوشی اور مصالحت بھی گزارنا تھی۔ اسامہؓ کی سر
 گرمی ایک جزوی سرگرمی ہے اس کے پورے صدیق اکبر نے اس فرض کی تکمیل کے
 لئے ایک بہت بڑی مہم چھیڑ دی۔ ابو عبیدہ، عمرو بن العاص، شریک، یزید بن ابی سفیان
 رضی اللہ عنہم کی گمان بین قوتوں کو روانہ کیا۔ یرموک کا مشہور معرکہ یادگار ہے۔ صدیق
 اکبرؓ بدرجادی الآخر سلسلہ کو دنیا سے رخصت ہو گئے۔

زمانہ قیادت حضرت عمر فاروقؓ کے ہاتھ میں آئی۔ حضرت عمرؓ کا دور
 بھی وہ تابناک دعوتی دور ہے جس میں نظم و امر قرآن کے مطالبے الامر بالمعروف اور
 انہی عن المنکر کو اسلام کے مزاج کے مطابق سرانجام دیا جا رہا ہے۔ سرآمد رسالت
 نے فاروقؓ سے فرمایا تھا اور جو کچھ فرمایا تھا۔ حرف بحرف مستقبل نے تصدیق کر
 دی۔ فرمایا:-

ما لقیك الشيطان سالكا

فحافظ الا سلك فجا غير

فجك۔

نہیں ملے گا چلتے ہوئے کسی ہی راستہ میں

تجھ سے شیطان گردہ راستہ چھوڑ کر دہرا رہا

شیطان چلے گا یعنی تو اور شیطان کسی ایک

راستہ پر نہ ہوں گے

دنیا والوں نے دیکھ لیا۔ کایسا ہی ہوا۔ عمرؓ نے نہ حرف نہ کہا اور وہ خدا ہی سے

کا مرض انجام دیا بلکہ خود توبائی کو ہی اسے بھاری پر نہ پایا

دستور یہی تھا کہ امام امامت کی کرسی پر بیٹھتے ہی لوگوں کے سامنے تقریر کرے۔
 جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ کہ یہ تقریر درحقیقت مستقبل میں حکومت کی پالیسی کا
 منشور ہوتی تھی۔ عمر فاروق نے زمام قیادت ہاتھ میں لیتے ہی جو تقریر کی وہ
 الفاظ کی سطح کی حد تک اگرچہ بہت ہی مختصر ہے۔ لیکن معانی کا سمندر اس میں پہاں
 ہے۔ الفاظ پڑھنے سے معانی پر غور کیجئے:-

انما مثل العرب مثل الجمل عرب اس مد ہوائے ہوئے اونٹ کی طرح
 الا نفا تتبع قائدا فلا ينظر میں جس کا ہانکنے والا پیچھے آ رہا ہوں۔
 قائدہ ابن يقودہ امانا انا یہ ہانکنے والے کو دیکھنا چاہئے کہ ہانک
 فوريب الكعبۃ لا حملتكم کہ کہاں سے جا رہا ہے۔ میں بخدا اس
 علی الطريق۔ مقرر اون معین راہ پر ڈالوں گا اور لیجاؤنگا

اس تقریر چلتی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے
 الف: اصلاح کی حدود میں ذمہ داری عوام پر نہیں قیادت پر ہے۔
 ب: امیر ریاست، ریاست میں عوامی اصلاح کا ذمہ دار ہے۔
 ج: الطریق یعنی وہ راستہ جو اسلامی زندگی میں جانا اور پہچانا ہوا ہے لوگوں
 کو اس پر چلانا امیر ریاست کا کام ہے۔

د: شہری زندگی میں امیر یہ ضرور دیکھے گا کہ عوامی زندگی کہاں جا رہی ہے۔
 اس منشور کا لب و لہجہ آنے والی زندگی میں خط و خال کی نشان دہی کر رہا ہے
 ۔ چونکہ خلافت کے واجبات میں سے اسلامی زندگی کے اس نمونے کو تمام دور
 اندیشیوں اور مصلحت گیشیوں سے بالا ہو کر بہر حال قائم رکھنا تھا جسے سرآمد
 رسالت دنیا میں چھوڑ گئے۔ اس لئے منشور میں صاف طور پر عمر فاروق نے
 نے کہا کہ لا حملتکم علی الطريق۔ یہ الطریق وہی زندگی ہے۔

دینا نے دیکھ لیا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ کام کس خوبی سے سرانجام دیا۔ اپنوں کو
جانے دیجئے غیر بھی اقرار کر گئے۔

انہما ہی خلافتا دینیتا۔ یہی دینی خلافت ہے۔ کچھ ناصتہ الوجہ
توقفت الی رجال یندرس۔ لوگوں کے اجتماع کے سہارے قائم
اجتماعہم فی عصر۔ ہوتی تھی۔

(التمدن الاسلامی)

اور یہاں تک کہہ گئے:

هذا هو العصر الاسلامی۔ یہی اسلام کا ستہرا زمانہ ہے۔ عدل
الذہبی عصر العدل والتقویٰ اور تقویٰ کا زمانہ۔

(التمدن الاسلامی)

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پیام جناب سلیم حبیب احمد صاحب پرنسپل طبیعہ کالج لاہور

دسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۰ اکتوبر ۱۹۵۳ء

مصائب میں نبوت کی جانب سے روحانی دست گیری، عقل خود پرستی اور ایمان خدا پرستی کا نام ہے۔ مقام رسالت کے بارے میں ایمان کی تین ترین ایان میں حاصل چیز محبت ہے اور محبت کی نشانی اتباع ہے۔ اتباع اور اطاعت میں بنیادی فرق، قانون سازی میں خلافت راشدہ کا مقام نبوت سے نیچے اور اجتہاد سے اوپر ہے، ہاں کی گود سے لے کر قبر تک زندگی کا خاکہ، اتباع کی حدود میں ہماری سرور مہری۔

جس فی اللہ وبقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاه اسلام علیکم! سنائیے جو کچھ آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا ٹھیک ہوا کہ نہیں خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا میرا ہاتھ پکڑنا پیش پا افتادہ مصائب کی نشاندہی تھی اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی دستگیری ہے کہ ان مصائب کو راجتوں اور دل کی لذتوں میں تبدیل کر دیا۔ میرا ہاتھ پکڑنے سے میری کمزوریوں کی طرف اشارہ تھا اور ساتھ ہی ان کمزوریوں کا مداوا بھی۔ الحمد للہ۔

میں نے اسی روز ایام سے کہہ دیا تھا کہ اگرچہ مصائب آرہے ہیں مگر مطمئن ہونا کہ جناب رسالت مآب نے ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ جب تاریخ نگہ اس حادثہ سے دوچار ہونے والے تھے جسے مسند خلق قرآن کہتے ہیں تو امام شافعیؒ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں "احمد بن حنبلؒ کو ہمارا سلام کہہ دو" صبح ہوئی امام شافعیؒ نے مجلس میں خواب بیان کیا اور پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام امام احمد بن حنبلؒ تک کون پہنچائے گا تو امام ابو حنیفہؒ کے مشہور شاگرد ابن بمانہ نے آگے بڑھ کر کہا کہ بندہ حاضر ہے ابن بمانہ

پیغام لے کر پہنچے اور امام احمدؒ کو سنایا۔ کہتے ہیں کہ امام احمدؒ روپڑے اور فرمایا کہ
 قَدْ سَرَّأَيْ رَسُولُ اللَّهِ فِي حَضْرَةِ أَنُورِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَبْهَمِي
 ضَعْفًا۔ کوئی کمزوری دیکھی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذور رس نگاہ نے مجھ میں کوئی کمزوری دیکھی ہے
 اور سلام سے اس کا علاج کیا ہے۔ اللہ اکبر کیا کہتے ہیں اس تعلق کے کہ غلاموں کی
 کس کس انداز سے مدد فرماتے ہیں۔

أَلَا يَا رَسُولَ اللَّهِ كُنْتُ رِحَانًا وَكُنْتُ بِنَابِئًا وَلَمْ تَكْ جَانِيًا

اے اللہ کے پیغمبر! آپ ہی ہمارا آسرا ہیں آپ ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا تو اچھے نہ کہ برا
 فدای لہ رسول اللہ اُمّی وخالقی عمتی وخالقی ثم نفسی وہ الیہ

اللہ کے رسول پر میری ماں، خالہ، چچا، ماموں، میری ذات اور میرا مال قربان ہو
 یہ نتیجہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا اور ان کے دین کی خاطر
 تکلیفیں برداشت کرنے کا۔ لیکن آہ میں

چو بید بر سر ایماں خویشی لزم
 ہر وقت، ہر آن، ہر لمحہ، ہر لحظہ، ہر پہل، اور ہر گھڑی گناہوں کے انبار لگا
 رہا ہوں اور زندگی کی کوئی کل بھی نافرمانی سے خالی نہیں۔ محبت کا حق تو یہ ہے کہ
 اتباع کامل ہو اور زندگی کے کسی گوشے میں بھی سر مو انحراف نہ ہو کیونکہ
 المحب لمن یحب مطیع عاشق اپنے محبوب کا فرمانبردار ہوتا ہے

اقبال نے کیا خوب کہا ہے:
 عشق مے گوید کہ اے محکوم غیب
 سینہ تو از بتاں مانند دیر
 تاندرسی از محمد رنگ و بو
 از درود خود میالا نام او
 عقل کہتی ہے کہ اسلام وہ ہے جو اسے بھلا معلوم ہو۔ ایمان کہتا ہے کہ یہ خدا پرست

نہیں بلکہ خود پرستی ہے۔ اسلام اتباع و اطاعت پیسہ۔ اطاعت میں اپنی عقل چلانا سرکشی اور تمرد ہے۔ یہ درست ہے کہ دانا حاکم کو کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ مگر محکوم اور غلام کا کام یہ ہے کہ عقل پر نہیں بلکہ حکم حاکم پر اعتماد کرے۔ یہی بات قرآن میں مقام رسالت کے بارے میں فرمائی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ
حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ
بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا
فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا
تَسْلِيمًا۔

قسم ہے تیرے پروردگار کی ایمان والے نہ ہوں گے تا آنکہ حاکم نہ بنا لیں تم کو اپنے باہم جھگڑوں میں اور پھر اپنے اندر آپ کے فیصلہ کے خلاف کوئی تنگی نہ محسوس کریں اور اپنے کو پورا پورا سپرد کر دیں۔

دیکھئے اس آیت میں مقام رسالت پر ایمان کو تین شرطوں سے مقید کیا ہے الف۔ زندگی کا تقاضا ویز شوں میں نبوت کی حکمرانی ہو۔

ب۔ نبوت جو بھی فیصلہ کرے اس کے خلاف دل گرفتگی نہ ہو۔

ج۔ نبوت کے سامنے زندگی ساری کی ساری تسلیم و رضا کی ہونہ کہ جبر و قہر کی

یاد پڑتا ہے کہ بخاری میں بحوالہ ہشام روایت آئی ہے کہ ایک روز جناب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ مسجد میں ٹہل رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کا

ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھا کہ زبان نبوت سے یہ ارشاد ہوا

وَالَّذِي نَفْسِي فُحْمًا بِيَدِي
لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ

قسم ہے تم میں سے کوئی اس وقت تک مؤمن کامل نہ ہوگا۔

آکون أحب اليه من

نفسه وولديه والناس

جب تک میری ذات اس کے لئے خود اسکی ذات اور ساری

اجْمَعِينَ (او کہا قال) انسانیت سے زیادہ محبوب نہ ہو جائے
 حضرت عمر رضی اللہ عنہ ٹھہر گئے اور بولے یا رسول اللہ ذرا مجھے اپنا محاسب
 کرنے دیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ حضرت عمر بولے
 اِلَّا نَفْسِي يَا رَسُولَ اللَّهِ مگر میری ذات اے اللہ کے پیغمبر
 آپ نے پھر وہی بات ارشاد فرمائی۔ حضرت عمر نے کہا۔
 اَلَا اِنَّ اَنْتَ اَحْبَبُ اِلَيَّ مِنْ ابِ اَبِي جَبَّةٍ اِنِّي ذَاتُ سَعْدِ بْنِ
 نَفْسِي يَا رَسُولَ اللَّهِ زیادہ محبوب ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
 اَلَا اِنَّ تَمَّ اِيْمَانُكَ يَا عُمَرُ اب تیرا ایمان پورا ہو گیا۔
 اصل چیز آپ کی محبت ہے اور محبت کی محسوس نشانی آپ کی پوری پوری
 ایسی ہر فرشتانہ اور والہانہ اطاعت کہ دنیا دیکھ کر مجنوں کہے۔ یہ آپ ہی کی اطاعت
 ہے جس سے ایک مسلمان کو درجہ محبوبیت ملتا ہے قرآن میں ہے۔
 اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ اِذَا تَمَّ اللّٰهُ مِنْكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ
 فَاتَّبِعُوْنِي يُحِبُّكُمْ اللّٰهُ اِتِّبَاعُ اللّٰهِ مِنْكُمْ اِتِّبَاعُ اللّٰهِ مِنْكُمْ
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن نے بیک وقت دو باتیں کہی ہیں
 اطاعت اور اتباع۔ اطاعت کے معنی ہیں کہا ماننا۔ مگر اتباع اس سے آگے ہے
 اس کا تعلق سرتاسر محبت ذات سے ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی کے سیکھ
 تاکے بانٹنا، ہو بہو وہ کچھ کرنا جو کہا اور کیا جا رہا ہے۔ وظیفہ بندگی کی پابجائی
 اور اللہ جل شانہ کی طرف ہر وقت متوجہ رہنے کا حق صرف اسی وقت ادا ہو سکتا
 ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ظاہر و باطن ہر طرح سے پوری پوری
 اتباع کی جائے۔ اخروی نجات اور ابدی فلاح صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی اتباع سے وابستہ ہے

رشتہ درگزر و نم افگندہ دوست ہر جا کہ سے برد خاطر خواہ دوست
لوگ سمجھتے ہیں کہ نواہی سے بچنا اور اوامر پر چلنا ہی اتباع ہے حالانکہ یہ صرف
اطاعت ہے۔ اتباع جس سے مقام محبوبیت حاصل ہوتا ہے۔ اس سے کہیں آگے
ہے۔ اوامر پر عمل پیرا ہونے والا اور نواہی سے بچکر چلنے والا مطیع تو ضرور ہے مگر
مطیع نہیں ہے۔ اتباع یہ ہے کہ زندگی کے ہر پہلو کو اس سانچے میں فعال دے جو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے سامنے چھوڑا ہے عمل کا یہی سانچہ قرآن
کی اصطلاحی زبان میں اسوۂ حسنہ کہلاتا ہے قرآن میں ہے۔

لَقَدْ كَانَتْ لَكُمْ فِي رَسُولِ
اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ
رسول اللہ تمہارے لئے بہترین
نمونہ ہیں۔

اسی معنی کے لحاظ سے خداوند قدوس الجلال نے قرآن اور آپ کی ذات گرامی
دونوں کے لئے نور استعمال کیا ہے

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا
مُبِينًا
ہم نے تمہاری طرف واضح
روشنی اتاری ہے۔

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ
وَكِتَابٌ مُبِينٌ
تمہارے پاس اللہ کی جانب سے
روشنی اور واضح کتاب آئی ہے

پہلی آیت میں نور سے قرآن حکیم اور دوسری میں نور سے خود رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے، اور کیوں نہ ہو جب کہ دونوں میں
فعل والفعال کا تعلق ہے اسی لئے حضرت عائشہ نے اس شخص کے جواب میں
جس نے آپ سے رسالت کتاب کے اخلاق کریمانہ کے بارے میں پوچھا تھا فرمایا

أَمَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ

کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا

جواب دیا کہ ہاں! آپ نے فرمایا

فَذَلِكَ خُلِقَ رَسُولِ اللَّهِ

یہی تو رسول اللہ کا خلق ہے۔

شاید لوگ تو روایتی نقطہ نظر سے اس واقعہ کی صحت کو شک کی نگاہوں سے

دیکھتے ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے اس مطالبے پر کہ

يُنْتَكُمُ كِتَابُ اللَّهِ يَدْعُوِي كَرْدِيَا تَهَا كَرْدِيَا

انا القرآن الناطق

میں ہی بولتا قرآن ہوں۔

مگر میں کہتا ہوں کہ اگر حضرت علی کی زندگی کے سارے گوشے براہ راست

رسالت کے اسوہ حسنہ سے منور تھے اور یقیناً منور تھے تو یہ دعویٰ کوئی

بڑا دعویٰ نہیں تھا۔ اور بالکل صحیح تھا پچھلے اس کی روایتی حیثیت کچھ ہو یہی

وہی ہے کہ حکومت اور فرمان روائی کے بارے میں ہر حاکم کی اطاعت کا جب

تک وہ معصیت کا آمر نہ ہو حکم دیا ہے۔ بر خلاف خلافت راشدہ کے کہ اس کی

اطاعت کے ساتھ اتباع کا ہم ہمکرم ہے۔ اسی وجہ سے ابن کے کردار کو سنت

قرار دیا ہے۔

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ

میری سنت اور باہدایت

الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ

خلفائے راشدین کی سنت

الْمُهْدِيِّينَ مِنْ بَعْدِي

سے چمٹ جاؤ۔

اوروں کا پتہ نہیں لیکن اسلام کے مشہور مفکر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

نے شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی زلدیہ بیان سے متاثر ہو کر

ازالۃ الخلفاء میں قانون سازی کے مخارج بیان کرتے ہوئے خلفائے راشدین

کا منصب یا دون التشریح اور یا فوق الاجتہاد قرار دیا ہے اور اس کو بے شائبہ

مثالوں سے ثابت کیا ہے۔ بہر حال اتباع کا مقام اطاعت سے بہت اونچا ہے اور اتباع کا دائرہ صرف انفرادی زندگی یعنی تزکیہ نفس، اصلاح اخلاق اور دینی اعمال تک نہیں بلکہ اجتماعی اور سیاسی زندگی میں بھی اس کا مطالبہ ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ حضرت علی نے خود مسلمانوں کے خلاف تلوار کیوں اٹھائی تھی؟ اوروں کا پتہ نہیں میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اجتماعی اور سیاسی زندگی کا جو نمونہ سرکارِ مدینہ نے چھوڑا تھا۔ وہ اس میں بال برابر تبدیلی کے بھی مخالف تھے نہیں چاہتے تھے کہ اذاھلک کسری فلا کسری بعدہ کے ماننے والے نبوت کی روحانی سادگی سے ہٹ کر کسری مادیت کو اپنالیں اور حکیم ستائی کی زبان سے وقت کو پکاڑنا پڑے۔

مسلمانان مسلمانان مسلمانان
 آئین بیدیناں پشیمانی پشیمانی
 یہی جذبہ امام حسین کو کربلا میں لایا

سر داد و نہ داد دست در دست یزید

حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

اتباع زندگی کے سارے گوشوں میں ہونی چاہئے۔ اور جب تک نہیں ہوتی اس کے لئے جانے، دلے، قدمے، اور قلمے جدوجہد جاری رکھنی چاہئے لیکن انفرادی زندگی کے وہ حدود جن پر خود ہماری حکومت ہے۔ پہلے ہمیں اسے اسوہ حسنہ کے سانچوں میں ڈھالنا چاہئے۔ اجتماعیات میں ہماری اس وقت تک کامیابی نہ ہوگی جب تک ہماری انفرادی زندگی اجتماع کی آئینہ دار نہ ہوگی۔ آٹے دن اسلام کے نام پر اٹھی ہوئی تحریکوں کی ناکامی کا اصل باعث یہی ہے کہ اجتماعی اور سیاسی زندگی کے لئے جس چیز کے ہم مدعی بن کر کھڑے ہوتے ہیں خود اس کا نام و نشان تک ہماری انفرادی زندگی میں موجود

نہیں ہوتا۔ ماں کی گود سے لیکر قبر کی آغوش تک ساری زندگی خلاف سنت چل رہی ہے گھر کا کوئی کام، غمی کی کوئی رسم، شادی کا کوئی معاملہ بھی منہاج نبوت پر نہیں ہے۔ کسی بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہیں ہے، سونے، سوکر اٹھنے، کھانا کھانے، گھر میں جانے اور آنے، کپڑے پہننے، بیت الخلاء جانے مسجد میں جانے اور آنے میں اتباع سنت کا خیال تک نہیں آتا۔

عادات کو چھوڑ کر عبادات ہی پر ذرا ایک چلتی نظر ڈال لو اول تو مساجد ہی اپنی بربادی اور شاہد کی آباد کاری کو دیکھ کر سینہ چاک ہیں۔ اور اگر ان میں کچھ آباد کاری ہے تو ان اعمال پر سینہ کوب ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مساجد میں رسول اللہ کا نام لیکر کر رہی ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے لئے ورثہ میں نہیں چھوڑا ہے بن گھڑت اور ادراہ و مخالف، احزاب اور اشغال کے وہ سارے ہنگامے جو ہم اپنی پسند کے دباؤ سے کرتے ہیں میزان اتباع میں پرکھ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے اور اس باب میں آج ہماری سرد مہری کا یہ حال ہے کہ ہم اپنے مولوی سے یہ بھی پوچھنا گوارا نہیں کرتے کہ آیا اس کا بتایا ہوا یہ عمل رسول اللہ نے کیا یا نہیں۔ بازار و طیفوں کی جو کتاب ہاتھ لگ جائے اس پر عمل شروع کر دیتے ہیں۔ وظیفوں کی کتنی کتابیں آج بازاروں میں تاجروں نے خدا سے بے خوف ہو کر صرف تجارتی نقطہ نظر سے پھیل رکھی ہیں۔ فَاِنَّا لِلّٰهِ وَاِلٰی اللّٰهِ الْمُنْتَقٰی

بہر حال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ضرورت ایسے انقلابی عمل کی ہے جس سے اتباع کی شادابیاں منظر عام پر آجائیں! افرادی سے لیکر اجتماعی اور سیاسی زندگی تک۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

بنام جناب ڈاکٹر فیروز الدین صاحب۔ سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۲ اکتوبر ۱۹۵۳ء

ہو موضوع تراویح پر روایت ابن عباس کی تحقیق، روایت کے خارج، حدیث نے ضعیف ہوتے کی وجہ سے ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان کا چہرہ، تہذیب کے راویوں کی ثقاہت، امام شیبہ کی تکذیب کی کہانی، صرف تراویح کا ضعیف ہونا روایت کے ضعیف ہونے کا معیار نہیں ہے، حدیث کا صحیح اور ہے مقبول ہونا اور ہے، حدیث مقبول کی حقیقت، ممکن یا مقبول کی وضاحت اور اسکی قسمیں صحیح نہ ہونے کے باوجود مقبول ہیں۔ سائب بن یزید کی ۲۰ تراویح کی روایت روایتی نقطہ نظر سے بخاری کی روایت کے لگ بھگ ہے، حدیث مقبول تو اتر کا مقام حاصل کر لیتی ہے۔

خیر فی اللہ وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ نے موضوع تراویح پر حدیث ابن عباس کے متعلق جو بات پوچھی ہے اس سے ذہنی افتاد کا پتہ چلتا ہے، مسرت ہے کہ آپ میں حق کے لئے طلب و جستجو ہے۔ دراصل کچھ غلط فہمیاں ہیں اگر وہ درمیان سے ہٹ جائیں تو پھر کوئی سغش نہیں ہے۔

پہلے پوری روایت سن لیجئے۔

۱۔ بیہقی نے السنن الکبریٰ میں یہ روایت اس طرح درج کی ہے۔

حدثنا ابو احمد ابن عدی الحافظ ثنا عبد اللہ بن محمد

ابن عبد العزیز ثنا منصور بن ابی مزاحم ثنا ابو شیبہ
عن الحكم عن مقسم عن ابن عباس كان النبي صلى الله
عليه وسلم يصلي في شهر رمضان في غير جماعة بعشرين
ركعة والوتر -

ابن عباس کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان
میں بغیر جماعت کے ۲۰ رکعت اور وتر پڑھتے تھے۔

۲- مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ روایت اس طرح ہے۔

حدثنا يزيد ابي ابراهيم بن عثمان عن الحكم عن مقسم
عن ابن عباس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان
يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں ۲۰ رکعت اور
وتر پڑھتے تھے۔

۳- مسند عبد بن حمید میں یہ روایت یوں ہے۔

حدثنا ابو نعیم حدثنا ابو شیبہ عن الحكم عن مقسم
عن ابن عباس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم
كان يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں ۲۰ رکعت
اور وتر پڑھتے تھے۔

۴- طبرانی میں اس طرح ہے۔

حدثنا البغوي حدثنا منصور بن ابی مزاحم حدثنا
ابو شیبہ عن الحكم عن مقسم عن ابن ان رسول الله

صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی رمضان عشرين رکعة والوتر
حضور انور رمضان میں ۲۰ رکعت اور
وتر پڑھتے تھے۔

۵۔ حافظ ذہبی نے معجم بغوی کے حوالہ سے اس طرح درج کی ہے

انباؤنا منصور بن ابی مزاحم انباؤنا ابو شیبہ عن الحكم
عن مقسم عن ابن عباس كان رسول الله صلى الله وسلم
یصلی فی رمضان فی غیر جماعت بعشرين رکعة والوتر۔
حضور انور رمضان میں بغیر جماعت کے ۲۰ رکعت اور وتر پڑھتے تھے۔

آپ نے دیکھا کہ اس روایت کی تخریج کرنے والے یہ آئمہ حدیث ہیں۔

امام ابوبکر احمد بن الحسین المتوفی ۲۵۸ھ۔ ابوبکر عبد اللہ بن محمد ابن ابی شیبہ
المتوفی ۲۳۵ھ۔ عبد بن حمید المتوفی ۳۲۹ھ۔ ابوالقاسم سلیمان بن احمد بن ایوب
الطبرانی المتوفی ۳۲۰ھ اور ابو محمد الحسین بن مسعود البغوی ۳۵۰ھ۔

حفاظ حدیث کا فیصد ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ حافظ جلال الدین

سیوطی فرماتے ہیں یہ حدیث ضعیف ہے اس میں دلیل بننے کی صلاحیت نہیں
ہے۔ حافظ بن حجر عسقلانی لکھتے ہیں اس کی سند ضعیف ہے۔ فتح الباری
۳۱۴/۸۶

علامہ زیلعی فرماتے ہیں حدیث معلول ہے۔ نصب الرایہ ۱۵۳/۲

علماء نے اس حدیث کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ان میں
ایک لاوی نامی ابراہیم بن عثمان کوفی ہے۔ امام احمد، ابن معین، بخاری
نسائی، ابو حاتم الرازی، ابن عدی، ابو داؤد، اور احوص نے اس کو ضعیف
بتایا ہے۔ امام ترمذی نے منکر الحدیث اور جوزجانی نے سابقہ کہا ہے۔ ابو علی
نیشاپوری کا فتویٰ ہے کہ قوی نہیں ہے۔ نسائی اور دولابی نے متروک الحدیث

بتایا ہے۔ یحییٰ بن معین نے یزید بن ہارون کی طرف نسبت کر کے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ابراہیم سے زیادہ اپنے زمانہ میں عادل کوئی نہ تھا۔ یزید کو خود پاس سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ حاقظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ یزید ابراہیم کے اس وقت منشی رہے ہیں جبکہ واسط کے محکمہ قضا میں مقرر تھے ابن عدی کہتے ہیں کہ ان کی حدیثیں اچھی ہیں۔ تہذیب ص ۱۲۱۔ اور یہ ابراہیم بن ابی جبہ سے بہتر ہیں ص ۱۲۵۔ یہ شاگرد ہیں اپنے ماموں حکم بن علی بن ابواسحاق البیعی ولید بن مسلم، زید بن الجباب، یزید بن ہارون اور علی بن الجعد کے ۷۲۵ھ ان کی تاریخ وفات ہے۔

ائمہ نقد و رجال نے ان کو خواہ کچھ کہا ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ ہیں یہ ابو ماجہ اور ترمذی کے راویوں میں سے شاید اسی بنا پر حاقظ عسقلانی نے ان کو تذکرہ لسان المیزان میں نہیں کیا خود فرماتے ہیں۔

فرا بیت ان احدث منہ اسماء من اخرج لہ الاثمة السند
میری رائے ہوئی کہ کتاب سے ان لوگوں کے نام ہٹا
دوں جن کا ائمہ ستہ نے روایات لی ہیں۔

بلکہ ان کا ذکر تہذیب التہذیب ص ۲۵۷ نمبر پر کیا ہے اور خود حاقظ عسقلانی کا دعویٰ ہے کہ تہذیب میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے وہ

اما ائمة موثوقون واما ثقات مقبولون واما قوم
ساء حفظهم ولم یطرحوا واما قوم ترکوا وجرحوا
قابل اعتماد امام ہیں، یا اچھے مقبول ہیں یا پھر

وہ ہیں جن کے حافظہ پر حرف گیری ہوئی ہے۔ مگر ان کو نظر
انداز نہیں کیا گیا یا وہ ہیں جو متروک اور مجروح ہیں۔ ص ۱۲۱

حافظ صاحب نے ان کو تقریب میں متروک الحدیث کہا کہ طبقہ سابقہ میں شمار کیا ہے اور معلوم ہے کہ متروک حافظ صاحب اسے کہتے ہیں

من لم يوثق البتة وضعف مع ذلك بقادح ص ۳

اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم بن عثمان حافظ عسقلانی کے نزدیک اس لئے ضعیف نہیں ہیں کہ ان پر جھوٹ کی تہمت ہے اور یا ان کو جھوٹا قرار دیا گیا ہے اسی بنا پر شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں

ابوشیبہ جد ابوبکر بن ابی شیبہ . ابوشیبہ اتنا ضعیف نہیں
 آن قدر ضعف ندارد روایت ہے کہ اسکی روایت کو پھینک
 اورا مطروح مطلق ساخته شود دیا جائے

۱۲۶

شاید آپ کو شبہ ہوا کہ المصاییح میں حافظ جلال الدین سیوطی کا دعویٰ ہے

ومن يكذب به مثل شعبة فلا يلتفت الى حديثه ص ۳

جس کو شعبہ جھوٹا کہے اسکی حدیث قابل التفات نہیں ہے

ٹھیک ہے مگر امام شعبہ کی تکذیب کی کہانی بڑی عجیب ہے اور شاید نقد و رجال کے سارے دفتروں میں کسی کو جھوٹا کہنے کی اس سے زیادہ مزید کہانی کوئی نہ ہو۔ یہ دعویٰ کہ ابراہیم کو شعبہ نے جھوٹا قرار دیا۔ آئیے ذرا اس کا پوسٹ مارٹم کر لیجئے۔ تہذیب میں حافظ عسقلانی نے لکھا ہے۔

كذب شعبة في قصة ص ۱۲۵

ایک واقعہ میں شعبہ نے ان کی تکذیب کی ہے۔

یعنی مطلق روایت حدیث میں دروغ گو نہیں ہیں۔

بلکہ امام شعبہ نے ان کو ایک واقعہ میں جھوٹا کہا ہے۔ وہ واقعہ کیا ہے۔ کیا

کوئی ایسا واقعہ ہے جس میں خود ابراہیم موجود تھے اور انہوں نے اسے جانتے پہچانتے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ نہیں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے۔ اسکی کہانی حافظ ذہبی کی زبانی سنئے۔

حافظ صاحب میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں کہ ابراہیم بن عثمان نے بحوالہ حکم عن ابن ابی لیلیٰ یہ تاریخی انکشاف کیا ہے کہ صفین کی جنگ جو حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان ہوئی اس میں شرکت کرنے والوں میں ستر اہل بدر تھے۔

شہد صفین من اهل بدر سبعون ۲۳

امام شعبہ فرماتے ہیں کہ ابراہیم کا یہ کہنا غلط ہے اور جھوٹ ہے کیونکہ میں خود ابراہیم کے استاد حکم سے ملا ہوں میں نے اس موضوع پر مذاکرہ کیا ہے میرے سے انہوں نے خود بتایا کہ صفین میں بدر والوں میں سے سوائے حضرت خزیمہ کے کوئی نہ تھا۔ سن لیا آپ نے کہ امام شعبہ نے ابراہیم کو کس واقعہ میں جھوٹا کہا ہے صرف اس میں کہ صفین میں ستر بدری شریک سے یہ جھوٹ ہے سچ کیا ہے کہ حضرت خزیمہ سے سوائے سوا کوئی تھا حافظ ذہبی فرماتے ہیں سبحان اللہ! یعنی دوسرے کو جھوٹا کہہ کر خود کیا عجیب انکشاف فرمایا کیا یہ سچ ہے کہ حضرت خزیمہ کے سوا جنگ صفین میں کوئی بدری نہ تھا۔ کیا حضرت علی بدری نہیں ہیں؟ عمار بن یاسر بدری نہیں ہیں؟ ذہبی لکھتے ہیں

اما شهد علی اما شهد ہا کیا حضرت علی موجود نہ تھے

عمار؟ کیا حضرت عمار نہ تھے؟

انصاف فرمائیے اگر جھوٹا ہونے کا معیار یہی ہے تو یہ دھبہ تو بقول امام ذہبی خود شعبہ کے دامن پر بھی لگا ہوا ہے۔ اس بنیاد پر اگر ابراہیم کو جھوٹا قرار دیتے ہیں تو شعبہ خود بھی نہیں بچتے۔ اس لئے ابراہیم کے جھوٹا ہونے کی کہانی صرف ایک افسانہ ہے جس کی تاریخ کے بازار میں کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ بات اپنی جگہ با

درست ہے کہ ابراہیم کے متعلق علماء رجال کا فیصلہ ہے ہو متفق علی
ضعفہ اس کے ضعف پر سب ہی متفق ہیں۔ نسب الراۃ ص ۱۰۳ امام بیہقی فرماتے
ہیں تصرد بہ الوشیبة وهو ضعیف ۲۹۶/۲ اس حدیث کا بیان کرنے
والا صرف ابو شیبہ ہے اور وہ ضعیف ہے نووی فرماتے ہیں متفق علی
ضعفہ ۸۷/۱

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حدیث کی صحت کی رواۃ سے الگ ہو کر کوئی بیرونی
فہانت نہیں ہے کیا یہ واقعہ ہے کہ ہر ایسی حدیث جس کے راوی پر نقد و رجال
کے ائمہ نے بالاتفاق ضعیف ہونے کی مہر لگا دی ہو ضعیف ہے؛ اگر یہ واقعہ ہے
تو پھر کیا وجہ ہے کہ حسن بن عمارہ کے حوالہ سے خود بخاری کی کتاب المناقب میں
حدیث موجود ہے۔ حالانکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ اطبقوا علیٰ ترکہا
ان کے متروک ہونے پر علماء کا اتفاق ہے یعنی صرف متروک الحدیث نہیں ہیں
بلکہ اس پر آئمہ کا اتفاق ہے ایک اور راوی اسید بن الجمال ہیں ان سے امام بخاری
نے کتاب الرقاق میں ایک حدیث روایت کی ہے۔ مگر ان کا حال یہ ہے کہ ان
متروک کہتے ہیں۔ ابن معین نے جھوٹی حدیثیں گھڑنے کا ان پر الزام لگایا ہے ابن حبان
کا دعویٰ ہے کہ یہ نہ صرف مناکیر لاتا ہے بلکہ احادیث کی چوری بھی کرتا ہے۔
حتیٰ کہ مقدمہ میں حافظ عسقلانی نے صاف لکھ دیا کہ لہذا احد فیہ تو ثیقاً میرے
علم میں اسے کسی نے نہیں سراہا معلوم ہوا کہ ارباب فن کے یہاں صرف راوی کا ضعیف
ہونا ہی روایت کے ضعیف ہونے کا معیار نہیں ہے۔ روایت کا سند کے لحاظ
سے صحیح ہونا اور بات ہے اور مقبول ہونا اور چیز ہے بخاری کی روایتیں اپنے راویوں
پر جرح کی وجہ سے خواہ کیسی ضعیف ہوں مگر مقبول ہیں کیونکہ ان کی پشت پر تلقی امت
بالقبول کی مہر ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے نظم الایاد میں ہمیں مقبول کی تعریف

یہ بتائی ہے

القبول ما تلقاه العلماء بالقبول وان لم یکن له اسناد صحیح
او اشتھر عند ائمة الحدیث بغیر نکیہ منہما ووافق
آیة من القران او بعض اصول الشریعة حیث لم یکن
فی سندہ کذاب۔۔ (التحفة المرضیہ ص ۱۶۲)

یہ مقبول وہ ہے جسے علماء نے اپنا لیا ہو چاہے اس کی سند
صحیح نہ ہو یا بلا نکیہ حدیث کے یہاں مشہور ہو گئی۔ کسی قرآنی آیت
یا اصول شریعت کے موافق ہو بشرطیکہ سند میں کذاب نہ ہو۔
علامہ سخاوی شرح الایضہ میں فرماتے ہیں۔

اذا تلقت الائمة الضعیف بالقبول بعمل له علی الصحیح (التحفة ص ۲۹۲)
جب امام ضعیف کو اپنا لیں تو اس پر عمل کیا جائے گا۔

علامہ الشیرازی مالکی نے الاربعین النوویة کی شرح میں لکھا ہے۔
ومحل کونه لا یعمل بالضعیف فی الاحکام ما لم یکن تلقتہ
الناس بالقبول (شرح الاربعین)

ضعیف پر احکام میں عمل نہ کرنے کا محل اس وقت ہے جب
کہ اسے تلقی بالقبول کا مقام حاصل نہ ہو۔
الافصاح علی نکت ابن الصلاح میں لکھا ہے۔

ومن جملة صفات القبول التي لم یعرض شیخنا الحافظ العراقی
ان یتفق العلماء علی العمل بمدلول حدیث فانه یقبل
حتی یجب العمل به وقد صرح به جماعة من ائمة
الاصول (ص ۲۴۲)

مقبول کی ان تمام صنتوں میں سے جن کا حافظ عراقی نے ذکر نہیں کیا ہے ایک یہ ہے کہ کسی حدیث کے عمل پر علماء متفق ہو جائیں یہ ہی مقبول ہے اس پر عمل واجب ہے۔ اس کی ائمہ اصول نے تصریح کی ہے۔

جو اصول کسی بھی حدیث کے مقبول ہونے کا محدثین نے بتایا ہے اس کی بنیاد پر بے شمار حدیثوں کو خود محدثین نے باوجود سند ضعیف ہونے کے مقبول بتایا ہے۔ میں چند مثالیں عرض کرتا ہوں۔

ابو داؤد، بیہقی اور مسند احمد میں ہے

لا زکوٰۃ فی مال حتی یحول علیہ الحول

حولان حول کے بغیر زکوٰۃ نہیں ہے

تلخیص میں حافظ صاحب فرماتے ہیں اس میں حسان بن حسان لاوی ضعیف ہے یمانی التحفة المرضیہ میں لکھتے ہیں۔

من هذا الباب ای من الضعیف المتلقى بالقبول حدیث

لا زکوٰۃ فی مال الخ (ص ۲۶۵)

: ان ضعیف حدیثوں میں سے جن کو درجہ قبول حاصل ہے

یہ حدیث لا زکوٰۃ الخ ہے۔

مشہور حدیث ہے۔

لا وصیۃ لوارث وارث کیلئے کوئی وصیت نہیں ہے

فتح الباری میں حافظ عسقلانی کہتے ہیں لا یخلوا سناد کل منہا من مقال

اس کی ہر سند میں کلام ہے علامہ یمانی فرماتے ہیں لیس لہ اسناد ثابت

۲۶۵ اس کی کوئی سند ثابت ہی نہیں ہے مگر امام شافعی فرماتے ہیں۔

حدیث لا وصیة لوارث لا یثبتہ اهل العلم بالحدیث

ولکن العامة تلقته بالقبول و عملوا به۔

یہ حدیث اہل علم کے یہاں ثابت نہیں لیکن عوام میں

اسے درجہ قبول حاصل ہے۔

دارقطنی میں حدیث ہے۔

الماء لا ینجسہ بشیء الا ما غلب علی ریحہ او طعمہ اولونہ

اس کی سند میں رشد بن سعد متروک ہے نووی کہتے ہیں اتفاق

المحدثون علی تضعیفہ محدثین کا اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے لیکن

قاضی شوکانی مضمیہ میں فرماتے ہیں

قد صارت ما اجمع علی معناها وتلقى بالقبول ص ۲۶۷

یہ وہ حدیث ہے جس کے معنی صحیح ہیں اور اسے ترف

قبول حاصل ہے۔

فتح میں حافظ صاحب نے بخاری کی تاریخ کبیر کے حوالہ سے ابو ہریرہ کی

یہ حدیث لکھی ہے

من زرعہ القیئ و هو صائم فلیس علیہ القضاء وان استقل

فلیقض

روزے کی حالت میں اگر قے آجائے قضا نہیں ہے اور

اگر قے کئے تو قضا ہے۔

امام بخاری فرماتے ہیں حدیث صحیح نہیں ہے عبد اللہ قطعاً ضعیف ہے ابوداؤد

وامام احمد کے حوالہ سے کہتے ہیں قطعاً کچھ نہیں ہے ترمذی کہتے ہیں ہمیں پتہ نہیں

ہے لیکن حافظ عسقلانی اس کے باوجود فرماتے ہیں لکن العمل علیہ عند

هل العلم - اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ وعلیہ العمل عند اہل العلم

ترندی میں حدیث ہے سراقہ کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم بقید الاب من

ابنہ ولا یقید الابن من

سے بیٹے کا نہیں لیتے کھتے۔

ابیہ

امام ترندی لکھتے ہیں۔ لیس اسناداً بصحیح مگر اس کے باوجود العمل

لہذا عند اکثر اہل العلم

یہ اور اس قسم کی اور بھی مثالیں ہیں جہاں خود محدثین اور ائمہ نقد و رجال نے

جو سند ضعیف ہونے کے حدیث کے مقبول ہونے کا فتوے دیا ہے۔ اب

انصاف سے کام لیجئے۔ وہ حدیث ضعیف جسے علماء اپنالیں ائمہ قبول

ہیں وہ تو حدیث مقبول ہو جائے۔ مگر جسے وہ قبول کر لیں جن کا عمل بھی

بنام حجت ہے اور جن کی خاطر پوری آبادی کے عمل کو قابل دلیل قرار دیا گیا

ہے۔ یعنی خلفاء راشدین زاد المعاد میں حافظ ابن القیم فرماتے ہیں۔

و عمل اهل المدينة الذی

یحتج بہ ما کان فی زمن

الخلفاء الراشدين ص ۶۸

وہ مقبول نہ ہو۔ فاننا لله والى الله المشتكى۔ کیونکہ زمانہ حضرت عمر

میں تراویح کا ہونا تو سب ہی مانتے ہیں دوسری روایات کے علاوہ حافظ

مقلانی نے فتح الباری میں جو بحوالہ امام مالک یہ روایت لکھی ہے۔

روى مالك من طريق يزيد بن خصيفة عن السائب بن

یزید عشرین رکعتہ

امام مالک نے بحوالہ یزید بن خصیفہ بیس رکعت روایت

کی ہیں

اس کی تاریخی حیثیت تو بالکل بخاری کی روایات کی ہے۔ خود امام بخاری

اپنے استاد عبد اللہ بن یوسف کے حوالہ سے اپنی صحیح میں باب اقتناء
الکلب میں اسی سند پر مشتمل حدیث لائے ہیں۔ حدیث یہ ہے۔

أخبرنا مالك عن يزيد بن خصيفة ان السائب بن يزيد

حدثه انه سمع سفيان بن ابی زهير رجلا من اشدشنوة

وكان من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم الخ ص ۲۵

امام بیہقی نے السنن الکبریٰ میں جو روایت درج فرمائی ہے وہ بھی اسی
کے لگ بھگ ہے جسے حافظ سیوطی نے بھی المصابیح میں باسناد صحیح کہا
ہے۔ حافظ محمد بن نصر مروزی نے قیام رمضان میں بحوالہ امام اعظم سلیمان بن
مہران عن زید بن وہب کوفہ کے گورنر عبد اللہ بن مسعود کے متعلق بھی یہ
انکشاف کیا ہے۔

كان يصلي عشريں ركعت و يوتر بثلاث

تراويح بيس ركعت اور وتر تين ركعت پڑھتے تھے۔

تہذیب صفحہ ۲۲۱ میں حافظ عسقلانی نے محمد بن کعب القرظی کے

بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ حضرت علی کے زمانہ خلافت میں

پیدا ہوئے تھے اور پڑھتے بھی اپنے وقت میں قرآن کی تفسیر کے بڑے

عالم۔ حافظ محمد بن نصر مروزی نے ان کا بیان لکھا ہے کہ :-

كان الناس يصلون في زمانه عمر بن الخطاب في رمضان

اوگ زمانہ عمر میں رمضان میں بسیں تراویح پڑھتے تھے۔
 روایت اگرچہ مرسل ہے اور مرسلات کے بارے میں اگرچہ امام ابوحنیفہ
 مالک اور احمد کا مسلک قبول کر لینا ہے مگر امام شافعی کے متعلق الامدی
 نے نقل کیا ہے کہ ایسے مرسلات - ان یكون المرسل قد عرف من
 حاله انه لا يرسل عن فيه علة من جهالة او غيرهما كمل سید ابن
 المسیب فهو مقبول - احکام ص ۱۴۸

جن بزرگوں کی عدالت مسلم ہو یقیناً ان سے غلط انتساب کی توقع نہیں ہو سکتی
 یہ کھلا ہوا ایک عقلی قانون ہے۔ الامدی لکھتے ہیں۔ واختار قبول مراسیل العدل
 مطلقاً ص ۱۴۸

یہ تاریخی شواہد کہہ رہے ہیں کہ ابن عباس کی روایت کو سب سے پہلے تلقی الخلفاء
 بالقبول کی قوت حاصل ہے۔ اسی تلقی کو امام ترمذی نے اپنی سنن میں اس طرح بیان
 کیا ہے۔

واكثر اهل العلم على ما روي عن علي وعمر وغيرهما من اصحاب

النبي صلى الله عليه وسلم عشرین رکعتہ ص ۹۹

اہل علم کی اکثریت میں ہی پر ہے جو حضرت علی، حضرت عمر اور

دیگر اصحاب نبی صلعم سے ثابت ہے۔

یہ تو تلقی الخلفاء بالقبول ہے۔ اصول میں بتایا گیا ہے کہ ایسی حدیث ضعیف

جس کے مدلول کو

تلقته الائمة بالقبول

ائمہ نے اپنایا ہو

تلقته العلماء بالقبول

علماء نے اپنایا ہو

امت نے اپنا لیا ہو تلقته الزامة بالقبول

حدیث مقبول کا درجہ حاصل کر لیتی ہے بلکہ حافظ سخاوی تو یہاں تک فرم گئے

انه ينزل منزلة المتواتر

اور امام شافعی اسے نقل عامہ عن عامہ کے نام سے پکارتے ہیں اور اس

کے متعلق ان کا دعویٰ ہے۔

كان اقوى في بعض الامور من نقل واحد عن واحد وكذا

وحدنا اهل العلم عليه مجتمعين (رسالة ۲۲)

جسے امام شافعی نقل عامہ عن عامہ فرماتے ہیں اسی کا نام تواتر عملی اور تواتر

ہے۔ بلکہ حافظ ابن حزم ظاہری کے حوالہ سے علامہ طاہر جزائری نے یہاں تک لکھ

دیا کہ کبھی خبر مرسل کی پشت پر نقل کی اجماعی طاقت ہونے کی وجہ سے سند کی حاجت

نہیں رہتی۔ اور اس بنا پر حدیث مرسل پر عمل کرنا متواتر کی طرح واجب ہو جاتا ہے۔ اور

مصنفین صحاح سے ہم جو ان کی کتابیں روایت کرتے ہیں۔ یہ بھی تو مراسیل ہی ہیں۔ جیسے

کہ حافظ ابراہیم الوندی نے الروض الباسم کے اندر لکھا ہے۔ کیونکہ جس معیار کی سند پر

خود ان کتابوں میں موجود ہیں۔ یلا ریب ہماری سندیں جن کے ذریعے ہم ان کتابوں کے

مصنفین تک پہنچتے ہیں۔ اس قسم کی نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود محدثین نے ان مراسیل

کو قول مراسیل قرار دے کر قابل پذیرائی بتایا ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مولانا عبد الرحمن صاحب فاضل دیوبند مولوی فاضل استاذ العربیہ گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ

۴ اکتوبر ۱۹۵۳ء

اللہ کی صفت اور اس کی قسمیں، مسلک تاویل یا تفویض، کلام کی اور علم کلام کی
 بیچارگی، صاحب روح المعانی کی کلام نفسی پر تقریر، شاہ ولی اللہ کا استعجاب
 اور الجوبنی کی حیرت، معتقدات میں اطمینان کی راہ کلام نہیں بلکہ قرآن ہے
 علم کلام انہوں کے لئے نہیں بلکہ غیروں سے مقابلہ کے لئے ہے، امام غزالی کا اعتراف
 قرآن میں غیبی حقائق کے ماننے کا مطالبہ نہ کہ جاننے کا، قرآن میں حقائق کی
 طرح مطالب وحی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ وحی عقل کی درماندگیوں کو دور کرنے کیلئے
 ہے۔ عقل سے آگے نبوت ہے، مجدد الف ثانی، علامہ ابن خلدون کے تاثرات
 انسان کی فکری گمراہی کی داستان، فلاسفہ کے انکار کا حافظ ابن تیمیہ نے تجزیہ
 کیا ہے، شیخ اکبر کا امام رازی کے نام خط۔ الحجام العوام میں امام غزالی کا اقرار۔

مکرم! السلام علیکم

دوسرے مسائل کی طرح کلام بھی متکلمین کی دیرنیہ دل چسپیوں کا سامان ہے۔
 جو لوگ تنزیہ کے بہانے تاویل کرنے کے خوگر ہیں ان کا کہنا ہے کہ کلام خدا کی
 صفت فعلی ہے صفت ذاتی نہیں۔ اشاعرہ نے ذرا فراخ حوصلگی سے کام لیا ہے
 اور گویا بخیال خویش عقل و نقل میں تطبیق کی مفید اور کارآمد تدبیر بھی یہی ہے کہتے
 ہیں کلام کی دو قسمیں ہیں۔ نفسی اور لفظی۔ نفسی صرف مدلول لفظ اور لفظی حروف
 و صورت کے مرکب کو کہتے ہیں۔ نفسی خدا کی صفت ذاتی ہے لفظی صفت نہیں
 ہے۔ نفسی مخلوق نہیں لفظی مخلوق ہے۔ قرآن کی صورت میں جو کچھ موجود ہے کلام
 نفسی نہیں بلکہ کلام لفظی ہے مگر قرآن مخلوق نہیں کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے
 بایں معنی کہ یہ خدا کی صفت کلام کے لئے نشان راہ ہے نشان راہ کو مخلوق

کہنے سے گریز ناگزیر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی مخلوق کہتے کہتے خدا کے اس کلام کو جو اس کے لئے صفت قدیم ہے مخلوق کہہ دے۔ بالفاظ دیگر ہے تو مخلوق مگر سدا للذریعہ نہ کہنا چاہئے کیسا غلط اور کس قدر پوچ خیال ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ قرآن میں خود قرآن کے لئے جہاں کلام اللہ بولا گیا ہے اس سے قطعاً اور یقیناً کلام لفظی مراد ہے نہ کہ نفسی۔

قد کان فرفیق منهم یسمعون
ایک فریق ان میں سے اللہ کا کلام
علامہ اللہ
سننا ہے

میں خدا کی صفت قدیم کو سننے کا ذکر ہو رہا ہے اور کہا۔

یریدون ان یریدوا کلام اللہ
یہ لوگ اللہ کے کلام کو بدلنا چاہتے ہیں

میں یہودی خدا کی صفت قدیم کو بدلنا چاہتے تھے۔ بات چونکہ بڑے لوگوں

کے منہ سے نکل رہی ہے اس لئے مانتے ہیں ورنہ جہاں تک عقل کا تقاضا ہے

بات سمجھ میں نہیں آتی یہی وجہ ہے کہ جن اشخاص سے شخصیتوں کی گرفت

ڈھیلی ہوئی ہے اور قدرت نے جن کو آزاد ماحول میں سوچنے کی نعمت ارزاں

فرمائی ہے انہوں نے تنزیہ کی بنیادوں پر بناٹے ہوئے تاویل کے اس

گھروندے کو ڈھا کر تفویض کے محل میں پناہ لی۔

تین مسئلے صفات الہی، فوقیت اور کلام ان کو کلامی نقطہ نگاہ سے سمجھنے کی

منہ میں نے جس قدر بھی کہہ دکاوش کی اسی قدر سکون کی جگہ اضطراب اور اطمینان

کی جگہ بے قراری کا نشانہ بنا۔ صفات میں تاویل ہو یا توقف ان کو بلا

تاویل مانا جائے یا تشبیہ اور تمثیل کے تیشے سے ان کی مرمت کی جائے۔

خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی تشریحات تو کھلم کھلا صفات کو حقائق کے

ذبحے میں پیش کرتی ہیں۔ لیکن متکلمین کو امرار ہے کہ کلام کو واقعہ اور حقیقت کے

طور پر نہیں بلکہ صرف ایک نظریہ کے درجے میں مانا جائے اور نظریاتی طور پر ماننا بھی تاویل و توجیہ کا ماننا ہو۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ کلام اللہ کا مفہوم معنی تام بالذات بلا حرف و صوت کے سوا کچھ نہیں۔ آخری دور میں علامہ محمود آلوسی ان لوگوں میں سے ہیں جن کی علمیت کی شہرت ہے اور نہ صرف یہ کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں ان مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی ہے بلکہ خود ان کو اپنے بارے میں دعوٰی ہے۔

اور دہا فی هذا الكتاب

باسلوب عجیب و تحقیق غریب

میں ان مسائل کو ایسے انوکھے طریق پر

بیان کروں گا کہ اس انداز پر تم نے کبھی

نہ سنا ہوگا۔

لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بات سلجھنے کی جگہ اور الجھ گئی پہلے کلام کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے دو گروہوں کو کھولنا پڑتا تھا اور اب دو کی جگہ چھ کو کھولنا پڑتا ہے۔

بیچارے متکلمین نے بڑی رد و کد، تنگ و دو اور کوشش کے بعد یہ راہ نکالی تھی کہ کلام کو دو قسموں نفسی اور لفظی میں تقسیم کیا۔ مؤخر الذکر کو اول کے لئے نشان بتایا۔ نفسی کو صفت قدیم اور لفظی کو حادث اور اس کا وجود خدا کے ساتھ ممتنع بتایا۔ شرح عقائد میں ہے۔

و یمتنع قیام اللفظی

بذاتہ تعریفین النفسی

القدیم

کلام نفسی حادث کا اللہ کی ذات کے

ساتھ قیام ناممکن ہے صرف کلام نفسی

قدیم ہے اور یہی اللہ سبحانہ کی صفت ہے

لیکن بے چارے نہ بتا سکے اور انگلی رکھ کر یہ متعین نہ کر سکے کہ نفسی کیا ہے۔ اس کا کوئی وجود بھی ہے یا نہیں۔ علامہ محمود آلوسی نے یہ کہہ کر اسے اور

چستان بنا دیا کہ

کلام نفسی حق تعالیٰ شانہ کی صفت قدیم ہے اور لفظی کے خدا کے لئے
ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کلمات غیبیہ جن میں کسی طرح کا مادہ نہ ہونہ لسی
نہ خیالی اور نہ روحانی اور یہ کلمات ازلیہ ہوں قرآن اسی معنی کے لحاظ سے
کلام اللہ ہے کہ وہ کلمات غیبیہ ہیں جو مجرد عن المواد ہیں قرآن کے نزول
کا مطلب یہ ہے کہ کلمات غیبیہ نے روحانی، خیالی اور حسی مواد میں ہوتوں
کا لباس پہن لیا ہے۔

یہ ہے تحقیق۔ فرمائیے آپ کیا سمجھے۔ کسی کا پتہ نہیں میں تو اپنی کہتا
ہوں کہ میں کچھ نہیں سمجھا۔ شاید میری کوتاہ علمی اس میں حاصل ہو مگر جو
اپنے تئیں سمجھا ہوا سمجھتے ہیں وہ بھی حیران ہیں اور ہیں بھی فن کے امام شاہ ولی اللہ حکیم
الامت ہیں اور اس قسم کے مسائل میں ان کی طرف نگاہی بھی مشہور ہے۔ خواتم ہیں۔

لا ادري ما الذي ليمونه
كلامًا نفسيًا

مجھے پتہ نہیں کہ وہ کس چیز کو کلام
نفسی کہتے ہیں۔

امام ابو محمد عبد اللہ الجویونی امام الحرمین کے والد کہتے ہیں :-

انتی کنت برهة من الدهر

میں ایک زمانے تک تین مسئلوں

متحیرا فی ثلاث مسائل

میں حیران رہا۔ مسئلہ صفات مسئلہ

مسئلة الصفات مسئلة الفوقية

فوقیت اور مسئلہ حرف و

ومسئلة الحرف والصوت

صوت

تکے سنئے :-

وکنت متحیرا فی الاقوال

اور میں کتابوں میں موجود مختلف

المختلفة الموجودة

باتوں پر حیران تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ اس چہستان کے سہارے کم از کم کلام اللہ کی حقیقت کو سمجھنا ناممکن ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر دین اور دینی حقائق کے بارے میں خود مصلحتوں سے اور دوسروں کو مصلحتوں کرنے کے لئے طبعی راہ وہی ہے جو قرآن نے پیش کی ہے تو پھر علم کلام کا کیا فائدہ ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میں تو وہی کچھ کہوں گا جو المجامع میں امام غزالی، اور نصیحتہ المسلمین میں امام ابو محمد جوینی نے کہ دیا ہے۔

قرآن کے دلائل غذا کے درجے میں ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کلامی موشگافیاں دو اکی حیثیت میں ہیں کچھ کے لئے سود مند ہیں مگر بہتوں کو اس کے استعمال سے نقصان ہو رہا ہے۔ قرآنی تصریحات پانی کی طرح ہیں دودھ پیتا بچہ بھی پی سکتا ہے لیکن کلامی رچن کے روغنی کھانے صرف طاقت ور ہی کھا سکتے ہیں اور وہ بھی زیادہ استعمال سے گاہ گاہ بیمار ہو جاتے ہیں۔

کلامی بازاروں میں شور مچاٹا ہے کہ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں بدعتوں کا بھوم نہ تھا۔ عقلیت کا قریب نہ تھا۔ آنے والے دور نے کروٹ لی اس لئے متاخرین کو بدعت اور عقلیت کے مریضوں کا علاج علم کلام کی راہ سے کرنا پڑا۔

علم کلام کا مقصد مریضان بدعت کا علاج کرنا ہے۔
المرضى بالبدع
علم کلام کا مقصد مریضان بدعت کا علاج کرنا ہے۔

المجامع ہی میں امام غزالی نے اس کا جواب دیا ہے اور خوب دیا ہے۔

صحابہ اور تابعین کو اپنی دینی زندگی کے لئے یہود و نصاریٰ سے مقابلہ کرنا پڑا۔ رسالت کے اثبات اور قیامت کے وجود پر ان سے بحث و مباحثہ ہوتے

لیکن اس کے باوجود عہد رسالت، صحابہ اور تابعین میں ان دلائل سے ہٹ کر جو قرآن نے پیش کر دیئے تھے کبھی بھی کسی دوسرے میگزین سے امداد کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ان کو یقین کامل تھا۔

من لا یقنہ اذلة القرآن جسے قرآنی دلائل سے اطمینان نہیں ہوتا

لا یقنہ الا السیف والسنان اسکا منہ بند کر نیوالی چیز تلوار کے سوا اور کیا

فما بعد بیان اللہ بیان ہے اللہ کے بیان کے بعد کوئی بیان نہیں ہے

واقعہ یہ ہے کہ کلامی بازاروں میں اولتہ القرآن والسنۃ سے ہٹ کر جو دلائل بھی

پیش کئے گئے اس سے صحت کی جگہ بیماری پیدا ہوئی۔ سکون کی جگہ اضطراب اور پریشانی
نے لے لی۔

میں سمجھتا ہوں کہ علم الکلام کا اساسی مقصد اسلامی سوسائٹی کے لئے عقائد

کی فراہمی کا کوئی خاص عقلی پنج پر سلیبس تیار کرنا نہ تھا بلکہ اس کی اصلی غایت یہ اور صرف

یہ تھی کہ جن لوگوں کی طبیعتوں نے کفر کی گود میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اپنے اس

فیصلے پر رتنے ہوئے اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے اور اسلام پر حملہ کے لئے یونانی

فلسفہ کے میگزین سے ہتھیار لے کر آئے تھے اور چاہتے تھے کہ اس طرح اسلام کی

عمارت گرا دیں۔ اصول جنگ کے مطابق یہ تو سب ہی کرتے ہیں کہ اپنے ہتھیاروں

سے دوسروں کا مقابلہ کریں۔ اپنی قوت دوسروں کے مقابلہ پر صرف کریں صحیح ہے

کہ مد مقابل کی طاقت کم ہو تو شکست کھا جاتا ہے مگر خود اپنا بھی کچھ نکل جاتا ہے۔

اسے دقت کی سیاسی مہارت سمجھیے کہ گھر سے نکلے ہیں مقابلہ کے لئے مگر خالی ہاتھ

ہیں ارادہ ہے کہ اپنی دولت اور اپنے سرمائے کو آج نہ آٹے دوسروں کے سرمائے

سے کھیلیں۔ ایسا ہی ہوا۔ قرآنی دلائل اپنی جگہ رہے، سنت کی پکار اپنے مقام

پر رہی۔ انہیں کے میگزین سے دلائل کا اسلحہ لے کر ان سے مقابلہ کیا جسے جودی

نے المہدی کے بارے میں جو یہ لکھا ہے۔

كان المہدی اول من امر الجہد
لمین من اهل البعث من
المتكلمین بتصنیف الكتاب علی الملونین
مہدی نے ملاحظہ کے خلاف متکلمین
میں سے اہل جہد کو کتاب لکھنے کا
حکم دیا۔

تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ خود ملاحظہ ہی کی مرمت ملاحظہ ہی
کے اسلحہ خانے سے کی جائے۔ کہتے ہیں کہ سندھ کے راجہ نے ہارون الرشید سے ایک
خط میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ اگر اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ دلائل و براہین کی
قوت سے پھیلا ہے تو میرے پاس ایک عالم کو بھیجئے۔ اگر وہ دلائل سے مجھے
سمجھا دے گا تو میں اسلام قبول کر لوں گا۔ ہارون نے ایک عالم کو بھیجا۔ دربار یوں
میں سے ایک شخص مناظرہ کیلئے سامنے آیا اور بولا آپ کا خدا قادر ہے یا نہیں
عالم بولے کہ ہاں قادر ہے۔ اس نے کہا اپنے جیسا پیدا کر سکتا ہے یا نہیں
عالم نے کہا کہ اس قسم کی لالی یعنی باتیں کلام سے تعلق رکھتی ہیں میں اسے اچھا
نہیں سمجھتا۔ راجہ نے ہارون کو لکھ دیا کہ پہلے میرا صرف خیال ہی خیال تھا۔ اب
یقین ہو گیا کہ اسلام دلائل سے نہیں بلکہ تلوار سے پھیلا ہے۔ ہارون نے
متکلمین کو بلایا۔ متکلمین دربار میں آئے تو ان میں سے ایک لڑکے نے اس
مشبہ کو حل کر دیا کہ یہ ایسا سوال ہے جیسے کوئی کہے کہ خدا جاہل بننے پر قادر ہے یا
نہیں۔ خدا ایسی شے پیدا کر سکتا ہے جو حادث اور ممکن نہ ہو۔ ہارون نے اس
واقعہ کے بعد معمر بن عباد کو راجہ کے پاس بھیجا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ
علم کلام کا مقصد یہ اور صرف یہ تھا کہ جن راہوں سے اسلام پر حملہ کیا جائے۔
انہیں راہوں سے مخاطبوں کو جواب دیکر چپ کرادیا جائے۔ امام غزالی نے
المنقذ من الضلال میں بڑی صفائی سے یہ بتایا کہ۔

ثم القى الشيطان في وساوس
 المبتدعة اموراً مخالفة
 للسنة فاجتوبها وكادوا
 يشويشون عقيدة الحق على
 اهلها فانشا الله طائفة
 المتكلمين فمنه نشأ علم الكلام
 واهله

پھر شیطان نے مبتدعہ کے وساوس میں
 مخالف سنت باتوں کا اور اضافہ کر دیا
 مبتدعہ اسی کے مور ہے اور اسی کو
 عقیدہ بنا کر اہل حق کے خلاف نبرد آزما
 ہو گئے۔ اللہ نے ان کے لئے متکلمین
 پیدا فرمائے۔ بس یہی علم کلام اور متکلمین
 کی نشاۃ اولی ہے۔

متکلمین کی مدافعت کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ طریق مدافعت

ولکنهم اعتمدوا في ذلك
 على ما تساموا من خصومهم

مگر انہوں نے ان ہی کے مسلمات
 پر اعتماد کر لیا۔

اور

وكان اكثر خوضهم في استخراج
 مناقشات الخصوم وهو اخذهم
 للوازم مسلما لهم

ان کے غور و فکر کی جولانگاہ مخالفین
 کی تردید اور ان کے مسلمات پر گرفت
 بنی۔

کا تذکرہ کیا ہے تو اس سے مقصود یہی جتان ہے کہ علم الکلام کا مقصد اصلی
 اپنوں کو مطمئن کرنا نہیں بلکہ دوسروں کو چپ کرنا ہے کیسی نے کیسی اچھی
 بات کہی ہے۔

نہ سب کی مخالفت میں جو کچھ کہا جاتا ہے علم کلام کا طالب علم اپنے اندر یہ دور
 محسوس کرتا ہے کہ نہ سب کی تائید میں اس سے زیادہ بڑھ چڑھ کر کیا کہا
 جاسکتا ہے۔

میرا مقصد علم کلام کی وقعت کو گرانا نہیں ہے بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ

فن بڑا اچھا ہے اور بہت ہی لطیف، مگر اس لئے نہیں کہ اس راہ سے ایمان ہاتھ آتا ہے اور انسانی فطرت اس کے آگے جھکتی ہے بلکہ اس لئے کہ بوالہوسوں کا ایسا غوغا کہ مذہبی ہونا، دنیادار ہونا، احمق و بیوقوف ہونے کے ہم معنی ہے، ہارون کی طرح اس علم کے ذریعے تردید کی جائے اور ایمان تو صرف پیغمبر کی شخصیت پر اعتماد کر لینا اور اعتماد کے ساتھ جو کچھ کہا جاتا ہے اسے بغیر دلیل کے ماننے کا نام ہے جیسا کہ پہلے کہہ آیا ہوں کہ علم انکلام مسافر کو عقل کی روشنی اور مشعل دکھا کر ایمان کا راستہ دکھانا چاہتا ہے حالانکہ ایمان کی لستی عقل سے آگے ہے کیونکہ ایمان نام سے ماننے کا اور جن کوائف، احوال، اشیاء کے ماننے کا ہم سے مطالبہ ہے قرآن و سنت نے بتایا ہے کہ ہم ان کی حقیقت کا اس دنیا میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔

فلا تعلم نفس ما أخفى لهم من قرة أعين

ایک حدیث میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔

كأعين رأيت ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر (مسلم)

قرآن میں علم کی نفی تھی حدیث میں علمی ذرائع کی نفی ہے۔ انسان کے پاس علم کے تین ہی ذریعے ہیں آنکھ، کان اور عقل۔

ان السمع والبصر والفؤاد كل أولئك كان عنه مستورا۔

یعنی دماغ کی باتیں ہمارے محسوسات اور ادراک کی گرفت میں نہیں آسکتیں اس لئے میں ہماری عقل و کاوش کے معلوم نہیں کر سکتی کیونکہ ہم مادی زندگی کے احساسات کی زنجیروں میں کچھ اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ان سے آزاد ہو کر حقیقت حال کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لہذا اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ اس عالم کو مانیں

اور یقین کر لیں اور جو کچھ نہیں پاسکتے اس کی کاوش میں سرگرداں نہ ہوں۔ اگر سرگرداں
 ہونگے تو حقیقت کا سراغ تو نہیں ملے گا۔ البتہ نئے نئے دعووں اور گمانوں میں
 مبتلا ہو جائیں گے۔ اسی بنا پر قرآن نے جس طرح حقائق کی دو قسمیں کر دی ہیں۔
 اسی طرح اس نے مطلب وحی کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ محکّمات اور متشابہات۔ وہ
 حقائق جو عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں وہ متشابہات ہیں ان کی نسبت
 فرمایا ہے۔

لَا يَعْلَمُ تَاوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ

یہ بات کہ جب ان مسائل پر عقل کچھ سوچ نہیں سکتی تو پھر اس راہ کی معلومات
 ہم پہنچانے کا ذریعہ کیا ہے۔ اس راہ کی معلومات اور اس عالم کے حقائق معلوم کرنے
 کا ہمارے پاس صرف ایک ذریعہ ہے اور یہی عالم غیب کے کوائف معلوم کرنے کی ایک
 واقعی اور فطری راہ ہے۔ علم کے اس ذریعہ کا نام "وحی و نبوت" ہے۔

ہم اس ذریعہ پر کیوں یقین کریں۔ اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ پیدا ہوتے
 ہی غذا کے لئے رونے لگتا ہے۔ اور پھر بغیر اس کے کہ اسے باہر سے کوئی رہنمائی
 ملے ماں کی چھاتی منہ میں لیتے ہی اسے چوستا اور اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔ یہ وجدان
 کی پکار ہے جو طلب و سعی کا جوش پیدا کرتی ہے۔ لیکن ہمارے وجود سے باہر جو
 کچھ ہے اس کا ادراک نہیں کر سکتی ہے۔ اس مرحلہ پر وجدان کے لئے حواس کی
 دستگیری نمایاں ہوتی ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے۔ کان سنتا ہے زبان چکھتی ہے
 ہاتھ چھوتا ہے ناک سونگھتی ہے اور اس طرح اپنے وجود سے باہر کی تمام محسوس
 اشیاء کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن حواس کی دستگیری خاص خاص حدود میں
 کام دے سکتی ہے اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی حواس صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں
 کہ اشیاء کا احساس پیدا کر دیں لیکن صرف احساس ناکافی ہے۔ زندگی کو یہاں

استنباط کی ضرورت ہے۔ احکام کی ضرورت سے کلیات کی ضرورت ہے یہ کام عقل لرتی ہے۔ وہ ان تمام مدرکات کو جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں ترتیب دیتی ہے اور ان سے احکام و کلیات کا استخراج کرتی ہے۔

جس طرح وجدان کی نگرانی کے لئے تو اس کی ضرورت تھی۔ اسی طرح حواس کی تصحیح کے لئے عقل کی ضرورت ہوئی وہ حواس کی درماندگیوں میں رہنمائی کرتی ہے وہ بتلاتی ہے کہ سورج ایک عظیم الشان کرہ ہے۔ اگرچہ آنکھ اسے ایک سنہری تھال سے زیادہ محسوس نہیں کرتی لیکن جس طرح وجدان کی حواس نے دستگیری کی۔ کیونکہ وجدان ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور جس طرح حواس کی راہنمائی کے لئے عقل نمودار ہوئی کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص دائرے سے آگے نہ بڑھتی تھی ٹھیک اسی طرح عقل کی درماندگیوں میں بھی ایک دستگیری کی ضرورت ہے کیوں کہ عقل بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی عقل کی فرمانروائی جو کچھ اور جتنی کچھ اور جیسی کچھ بھی ہے وہ محسوسات کے دائرے میں محدود ہے یعنی وہ صرف اسی حد تک کام دیتی ہے جس حد تک ہلکے حواس خمسہ معلومات ہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ لیکن محسوسات کی سرحد سے آگے کیا ہے اس پرے کے پچھے کیا ہے۔ یہاں پہنچ کر عقل درماندہ ہو جاتی ہے۔ عقل کی انہی درماندگیوں کو دور کرنے کے لئے جو ہدایت اور دستگیری نمایاں ہوئی اسی کا نام وحی و نبوت ہے۔

حضرت شیخ احمد سرسندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس علمی ذریعہ اسی ہدایت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

چنانچہ طور عقل و رائے طور حواس کہ آنچہ جس مدرک نمی شود عقل
ادراک آن مے نماید ہم چنین طور نبوت و رائے طور عقل است آنچہ

بعقل مذکر نشود بتوسل نبوت و رک سے آید و سرکہ و رائے طور
عقل طریقے از برائے معرفت اثبات یعنی نماید فی الحقیقت منکر نبوت

است ص ۲۰
۳۳

علامہ ابن خلدون مجدد و صاحب کے پورے پورے ہم زبان ہیں۔ مجدد و صاحب
سے ذرا زیادہ تشریح کے ساتھ اپنے مقدمہ تاریخ میں لکھتے ہیں۔

فاتھم ادراکک و مدراکک
اپنی دانش و بینش کو بالائے طاق رکھ

فی الحصر و اتبع ما ادرکک بالتشاع
اور شارع کے حکم پر چل چاہے عقیدہ

من اعتقادک و عملک فهو
ہو یا عمل یا درکھ ذات نبوت نہ صرف

احرص علی سعادتك و اجمل
تیرے سعید ہونے کی حرص ہے بلکہ تیری

بما ینفعک لا نہ من طور ذوق
منافع سے بھی باخبر ہے کیونکہ اس کا

ادراکک۔
علمی مقام تیری علم سے بالا ہے۔

انسان کی ساری فکری گمراہیوں کی داستان یہ ہے کہ وہ یا تو عالم شہادت میں

بھی عقل و دانش سے اس قدر گورا ہو جاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے بوجھے مانتا جاتا
ہے اور سر راہ میں آنکھیں بند کئے چلتا ہے یا پھر عقل و بینش کا اتنا غلط استعمال

کرتا ہے کہ عالم غیب کی باتوں کو عقل کی ترازو میں تولتا ہے اور عقل سے اوپر

کسی علمی ذریعہ کو تسلیم ہی نہیں کرتا اور جہاں کوئی حقیقت اس کی سمجھ سے بالا تر

ہوئی اس نے فوراً رد کر دیا۔ بلاشبہ علم و انکشافات کے ہر عہد میں ایسی جلد باز

طبیعتیں بھی ہوئیں جنہوں نے صرف عدم ادراک کی بنا پر عالم غیب کے مسائل کا

انکار کر دیا۔ لیکن ان کے انکار سے حقیقت نہیں بدلی۔ انبیوات میں حافظ

ابن تیمیہ نے ان فلاسفہ کے بارے میں جو عالم غیب کی گرسوں کو عقل کے ناخنوں

سے کھولنا چاہتے ہیں اور جب گریں کھلنے میں نہیں آتیں تو انکار کر دیتے ہیں کیسیا

اچھا فقرہ لکھا ہے۔

بِنَكْرِهِمْ لَعْنَةُ الْعَالَمِ بِالْعَدَمِ ۲۲

معلومات کی بنیاد عقل و حواس کی جگہ جہاں اس ذریعے یعنی وحی و نبوت پر ہوئی اس کا اصطلاحی نام دین اور مذہب ہے اور جن شخصیتوں میں قدرت کی جانب سے اس خاص ذریعے سے معلومات حاصل کرنے کی صلاحیت و قوت فراہم کی جاتی ہے ان کو مذہبی زبان میں نبی اور رسول کہا جاتا ہے۔ پیغمبر کے سامنے یہ عالم عالم شہادت ہوتا ہے اور وہ براہ راست سنب کچھ ہوتا ہوا آنکھوں سے دیکھتا ہے اور جانتا ہے۔

افتخار و نہ علی مایری

ہم آنکھوں سے نہیں دیکھتے مگر پیغمبر کی زبان سے سن کر مانتے ہیں۔ اسی کا نام قرآن کی زبان میں ایمان بالغیب ہے۔ ہم اس موضوع پر جو کچھ، جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی باتیں پیش کریں گے ان کا براہ راست ماخذ یہی ہوگا یعنی وحی و نبوت۔ معلومات ہی کی بنیاد جہاں عقل اور صرف عقل پر ہے یعنی محسوسات کی چارہ دیواری کو بچاند کر محسوس قوانین کے دائرے سے باہر نکل کر عقل سے ان امور کا بھی پتہ لگایا جاتا ہے جو احساسات کی گرفت سے باہر ہیں۔ وہ فلسفہ کا شعبہ الہیات اور ما بعد الطبیعیات ہے۔ دین ہی کی باتوں کو جہاں عقل کی ترازو پر تول جاتا ہے اور منہ زوری کے ساتھ اپنے مخاطب کو مطمئن نہیں بلکہ ساکت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس کا نام علم الکلام ہے۔ بتانے والوں نے یہی بتایا ہے کہ یہ راہ یعنی غیبی امور کو عقل کی ترازو سے تول کر جاننے کی راہ ماننے کی راہ سے زیادہ خطرناک ہے۔ تجربہ کاروں کا کہنا ہے کہ ماننا آسان ہے اور جاننا مشکل ہے۔ جاننے والے حیرانی کا شکار ہوتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ نے اپنی تصنیفات میں جگہ جگہ امام رازی کی متکلمین کے نام پر لکھی ہوئی جو کھلی چٹھی نقل کی ہے اسے دیکھ کر عبرت ہوتی ہے۔

لقد تأملت الطرق الكلامية والمنهج الفلسفية فما رأيتها
تتشبه عليلاً وتروى غليلاً ووجدت اقرب الطرق طريقة القرآن.

حالانکہ امام رازی کا علم الکلام کے متعلق سب سے بڑا کارنامہ ہی فلسفہ کا رد ہے سب سے پہلے امام صاحب ہی نے علم کلام فلسفہ کے انداز پر لکھا ہے جس شخص نے امام موصوف کی بلند پایہ تصنیفات ہنایتہ العقول، اربعین، محصل البیان اور تفسیر کبیر میں کلامی مباحث کا مطالعہ کیا ہے اسے امام رازی کے اس اقرار کو ماننے میں تامل نہ کرے گا شاید شیخ اکبر کی نصیحت کا اثر نہ ہو۔ کشکول میں شیخ اکبر کا ایک خط نقل کیا ہے۔ خط امام رازی کی جانب ہے۔ خط میں سب سے زیادہ نمایاں نصیحت یہ ہے۔

فاذن ينبغي للعاقل ان يتعرض
عقل مند کلام یہ ہے کہ فیضان الہی
لنفعات الجود ولا يبقى ما سورا
حاصل کرنے کے لئے تیار ہو اور فکر و
فی قید نظرہ او کسبہ
نظر کا قیدی بن کر نہ رہے۔

اسی نصیحت کا اثر ہے جو امام رازی کی زبان پر یہ بات ہے۔

من جرب مثل تجربتی عرف مثل
جو بھی میری طرح تجربہ کرے گا اسے
معرفتی
میری طرح پتہ لگ جائے گا۔

امام غزالی نے ابتداء میں علم کلام میں اشاعرہ کی حمایت کی لیکن بالآخر ان کی رائے بدل گئی اور الحجام الحوام میں کلامی دلائل کو وہی اور ظنی کہنا ہی پڑا۔ کتنی کھلی بات ہے کہ کلامی دلائل وہی ہیں۔ انہیں لوگ مان رہے ہیں کہ علماء میں مشہور ہیں اور آج اس سے انکار معیوب سمجھا جاتا ہے۔ الحجام میں اس عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے۔

الباب الاول فی شرح اعتقادات السلف

اور پھر آغاز ہی میں یہ بات کہی ہے۔

اعلم ان الحق الصریح الذی
کھرا اور صاف جس میں اہل بصیرت کو کوئی
لامراء فیہ عند اهل البصائر
شہ نہیں وہ صرف مذہب سلف

هو مذہب السلف اعنی مذہب
یعنی صحابہ اور تابعین کا مذہب

الصحابۃ والتابعین
ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ امام صاحب نے بتایا ہے کہ عوامی رائے غیب کے معاملات کے
ساتھ کس کس طرح جھک سکتی ہے اور اس راہ میں نبوت کی بتائی ہوئی باتوں کو کیسے مان
سکتی ہے

علیکم
والسلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہما

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۲ اکتوبر ۱۹۵۳ء

حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے نزدیک معاش کی حقیقت، اس کے عناصر، عزت میں انسان کا مقام، سوسائٹی میں درمیانہ درجہ، بہت بڑی سرمایہ داری اللہ کو ناپسند ہے، نمونہ کی معتدل زندگی، زمین کی اکتساب میں حیثیت، اخلاقت میں رفاہ عام کی خاطر اصلاحی اقدام، رفاہیت بالغہ، تجارتی فتنے، کنٹرول اور اسلام میں اس کا مقام —

تلمیذی العزیز! السلام علیکم

تم نے مجھ سے بار بار پوچھا ہے کہ میں شاہ صاحب کو کیسے پڑھتا ہوں۔ جی میں آیا کہ لاؤ تمہیں بتا دوں۔ مگر تانے سے پہلے یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں جس موضوع پر شاہ صاحب کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ میرا ذہن اس کے متعلق بیرونی معلومات سے خالی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ سوشلزم اور کمیونزم کا واضح نقطہ نظر کیا ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ جمہوری نظام کے نکتہ فکر کے آدمی اس پر کیسے غور کرتے ہیں۔ اور نہ مجھے یہ پتہ ہے کہ ایک خاص شاہی مزاج انسان خواہ دستوری ہو یا غیر دستوری، اس موضوع پر اپنے مقام پر کیا دلائل رکھتا ہے۔ اس سے میں ضرور واقف ہوں کہ اس نقطہ پر ان میں باہم اختلاف ہے۔ لیکن اس اختلاف کے تفصیلاً کوالف سے میں نا آشنا ہوں۔ اس لئے شاہ صاحب کے متعلق اس موضوع پر جو کچھ بھی پیش کروں گا وہ کسی اثر کا نتیجہ نہیں بلکہ بغیر کسی بیرونی تاثر کے شاہ صاحب کے متعلق یہ میری ذاتی معلومات ہیں اور بس۔

سب سے پہلے شاہ صاحب کی زبان سے یہ بتانا ضروری ہے کہ معاشیات کیا ہیں۔ البتہ درالبازغہ میں ہے۔ معاشیات یہ ہیں کہ اخلاق فاضلہ، تجربی

علوم، اور رائے کلی کے موافق تمہاری ضروریات کی تکمیل ہو۔ ضروریات کئی طرح کی ہیں مثلاً کھانا، پینا، صفائی، آرائش، لباس، مکان، رفتار، گفتار، خواب، ازدواجی زندگی بیماری اور تکلیف۔ یہ معاشیات کے میٹے موٹے اصول ہیں۔

گویا بالفاظ دیگر شاہ صاحب کی اصطلاح میں حیوانی اور انسانی ضروریات کی پابجائی کا نام حکمت معاشی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں معظم مسائل معاش بتاتے ہوئے جو تفصیل دی ہے اسے دیکھ کر تو اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی میں پھیلی ہوئی وہ ساری ضروریات جن کا ہر شخص زندگی کے ہر موڑ پر ضرورت مند ہے معاشیات میں — معاشیات کی گاڑی چلنے کے لئے جس سڑک اور جس پٹرول کی قوت کی ضرورت ہے۔ شاہ صاحب کی اصطلاح میں اس کا نام اکتساب، تعاون، تعامل ہے۔ شاہ صاحب کی زبان میں اکتساب کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی صلاحیت کے موافق عادی اسباب کی ہم نوائی میں کوئی کام کرے۔ (بدور)

تعاون یہ ہے کہ ان میں آزادانہ لین دین اور تجارت ہو۔

تعاون یہ کہ ان میں باہم کفالت، مضاربت، شرکت و وکالت اور استجار کی

سپرٹ ہو (بدور بازرغ)

اکتساب کا دوسرا نام مکاسب ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں اصول مکاسب کی تشریح کی ہے۔ فرماتے ہیں

زراعت، شہانی، معاون، نباتات اور حیوانات کی فراہمی، صنعت، نجاری، حدادی، چاکت، تجارت اور ملازمت، اصول مکاسب ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ

چونکہ انسان مدنی الطبع ہے۔ اس کی معاشی زندگی کی گاڑی باہمی تعاون کے بغیر چل نہیں سکتی۔ اس لئے باہمی تعاون واجب ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی ان

ضروریات سے محروم نہ رہے جنکی مدنیّت کیلئے ضرورت ہے (ص ۳۱)
 مکاسب کے موضوع پر اگرچہ تفصیلات بہت کچھ فراہم ہو سکتی ہیں مگر حقیقت
 اصولی طور پر سارے مکاسب زراعت، تجارت، صناعت اور ملازمت میں سمیٹے
 ہوئے ہیں۔

جب بھی اور جہاں بھی تمدن رونما ہوتا ہے۔ خواہ اس تمدن کو اپنانے والی
 برادری صرف ہزار ہو۔ شاہ صاحب کے خیال میں سیاست مدینہ کا اولین کام ہے
 کہ ان لوگوں کے مکاسب کو دیکھے۔ اس کے بعد تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مکاسب خواہ کچھ
 ہوں مگر واقعہ یہ ہے کہ انہیں کی قوت سے انسانی معیشت میں طبقاتی بحران پیدا
 ہو جاتا ہے۔ امیر اور غریب کی آویزش اس کا ناگزیر نتیجہ ہے البدور البازغہ میں صاف
 لکھا ہے کہ

آدمی چند حصوں میں تقسیم ہیں۔ بہت زیادہ سرمایہ دار۔ درمیانے درجے
 والے اور بہت زیادہ غریب مٹیوں کے متعلق ان کا تاثر خود ان کی زبان ہی
 سے سن لیجئے، فرماتے ہیں :-

لا یتوفی حوائجہ الا قریباً

ان کی ضروریات زندگی صرف چوپایوں

من استیفاء البھاشم

کی طرح پوری ہوتی ہیں۔

اللہ اکبر! انسانوں میں ایسے انسان بھی ہیں جن کی زندگی کی ضروریات کی تکمیل

کا مقام انسانی نہیں بلکہ حیوانی ہے انا للہ والی اللہ المشتکی۔ بدوز بازغہ میں سرمایہ
 دار اور غریب کا ذکر کر کے اپنا پیش ہادیہ بتایا ہے۔ ضروری اور واجب یہ ہے کہ
 معاشی طور پر سوسائٹی میں صرف ماڈرن یعنی زیادہ طبقہ ہونہ بہت غریب اور تہ بڑے

بڑے سرمایہ دار (ص ۳۱)

حجۃ اللہ البالغہ میں جہاں سود کی حرمت کا ذکر ہے اس کی حکمت بیان کرتے

ہوئے لکھا ہے کہ بہت بڑی سرمایہ داری اللہ جل شانہ کو ناگوار ہے اور بتایا کہ مزاجوں اور عادات کے اختلاف کی وجہ سے زندگی میں تفاوتِ مراتب تو ناگزیر ہے اور یہ تفاوت قدرتی ہے۔ اس آیت میں اسی تفاوت کا ذکر ہے۔

نحن قسمنا بیتهم معیشتهم
فی الحیوة الدنیا و فی الآخرة
فوق بعض درجات لیتخذ بعضهم
بعضاً سخیراً
ہم نے بانٹ دی ہے ان میں روزی
ان کی دنیا کی زندگی میں اور بلند کر دیئے
درجے بعض کے بعض پر کہ ٹھہراتا ہے
ایک دوسرے کو خدمتگار

لیکن اس تفاوت کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک چاول اور گہوں کھا رہا ہے تو دوسرا جو اور مکی سے مزہ لے رہا ہے اور کچھ ان میں چاندی پہنتے ہیں اور بس۔ ایک دوسرا تفاوت اور زندگی میں وہ امتیاز کہ جو گہوں اور چاول کی قسموں سے بنتا ہے اور سونے کی باریک صنعتوں کے ذریعے ترتیب پاتا ہے یہ مسرفین اور مترین کی عادات سے متعلق ہے۔ اس میں غور و فکر ذہنی تعمقات ہیں اسے نشوونما نہ دینا چاہیے۔ شاہ صاحب کا تاثر اس تفاوتِ مراتب کے متعلق یہ ہے۔

فالمصاحبة حاکمة بسد
اجتماعی اور معاشی مصلحت یہی ہے کہ
هذا الباب
اس دروازے کو بند کیا جائے۔

نظری طور پر شاہ صاحب نے بد در بازغہ میں سرمایہ داری پر بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

سرمایہ داری کے موضوع پر دو نظریے موجود ہیں اور دونوں باہم متعارض ہیں۔ ایک یہ کہ سرمایہ داری اچھی چیز ہے۔ اس سے قلب و دماغ اور مزاج میں صحت رہتی ہے۔ اخلاق و علوم درست ہوتے ہیں، غبادت اور بد خلقی سرمایہ سے نہیں بلکہ اس کے غلط استعمال سے پیدا ہوتی ہے

ذکا اور حسن خلق سرمایہ سے نہیں بلکہ اس کے صحیح استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ سرمایہ داری بری ہے کیونکہ اس کا ناگزیر نتیجہ منازعات، مشایرات، کد و لعب کے ساتھ اللہ کی ذات سے اعراض اور آخرت سے روگردانی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سرمایہ داری بذات خود نہ اچھی ہے نہ بُری۔ بلکہ بری ہے جب یہ برائیوں کا ذریعہ ہو اور اچھی ہے جب برائیوں کی آمیزش کے بغیر صرف خوبیوں کا ذریعہ ہو۔ دونوں پہلوؤں میں جا نہیں کی رعایت صرف درمیانی حالت میں ہو سکتی ہے۔
(بدور بازغہ ص ۵۶)

اس سے شاہ صاحب کا نظریہ صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ داری اور غربت دونوں کے لئے سوسائٹی میں ایک ماڈریٹ اور درمیانی حالت شاہ صاحب کا پیش نہاد ہے۔ بدور بازغہ میں سرمایہ داری کے بارے میں نظریہ بیان کرنے کے بعد ایک شخص کی معاشی زندگی کا جو نمونہ پیش کیا ہے اور جسے خود انہوں نے *انموذج من الحکمة العاشیة* بتایا ہے۔ انہوں نے اس نمونہ میں بھی درمیانی درجے کی رعایت رکھی ہے۔ خوراک، لباس، نظافت، زیبائش، آرائش، رفتار، گفتار، ازدواجی رفاقت اور ابتدائی حالت پر ایک مختصر سا نوٹ دیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کس قسم کی معیشت کو درمیانی معیشت کہتے ہیں۔ سوسائٹی کے ہر فرد کو اس درمیانی معیشت میں کس طرح رہنا چاہیے۔ یہ فرد گویا شاہ صاحب کی درمیانی معیشت کا نمونہ ہے۔

بدن اور کپڑے بے داغ اور صاف ہوں۔ میل کھیل نہ ہو بلکہ اچھے ہوں۔ پیشاب اور پاخانے کی حاجت کے وقت ڈھیلے سے استنجا کرنا ادنیٰ درجہ ہے پانی بھی استعمال کیا جائے تو بہت عمدہ ہے۔ بدن پر کسی قسم کا کوئی میل نہ ہو۔ ہر ہفتہ کم از کم بدن کو

مل کر ضرور صاف کرنا چاہیے۔ مسواک کرنا، ناک صاف کرنا، بغل اور زیر ناف کے بال لینا، اور معنوی نجاستوں سے دامن آلودہ نہ ہو۔ لباس ایسا چوس سے تمام بدن ڈھک جائے۔ ایسا نہ ہو جس سے طرب، خلعت اور مجنوں ٹپکے۔ ایسا ہو کہ جس سے لوگوں میں باوقار اور شہامت محسوس ہو۔ کھانا کھانے کے لئے ہاتھ منہ دھو کر اطمینان سے بیٹھے۔ دسترخوان پر کھانا رکھا جائے نہ زمین پر نہ ٹیل پر، کھانا اپنے آگے سے کھائے تیزی اور بے چینی نہ ہو، لقمہ بڑا نہ ہو، بھوک پیاس ہو تو کھائے پیے۔ سب سے اچھا کھانا جس کا ملنا آسان ہو، مضم لپورا اور معدے میں ضرر رساں نہ ہو۔ نہ زمین پر کھانا رکھا جائے اور نہ سونے اور چاندی کے برتنوں میں بلکہ مٹی کے برتنوں میں کھانا رکھنا چاہیے۔ ہائشی مکان کے لئے ضروری ہے کہ سردی اور گرمی کی مضرتوں سے بچانے والا ہو، چور و ڈاکو سے محفوظ اور مکین اور سامان کی اس میں صحیح معنی میں حفاظت ہو سکے۔

مومنہ کی اس زندگی کو پیدا کرنے کیلئے کس قسم کی آمد درکار ہے اور زندگی کو اس طرز پر گزارنے کیلئے ایک شخص کو کیا کام کرنا چاہیے اور وہ رفاہیت کس طرح کسب و اکتساب کے ذریعے ہاتھ آئے۔ جس کے بغیر زندگی پریشانیوں کا گہوارہ بن جاتی ہے زندگی سالنوں کی آمد و رفت کا نام نہیں ہے بلکہ زندگی دراصل نام ہے انسانی ضروریات کی تکمیل کا۔ اکتساب کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اکتساب یہ ہے کہ تم اپنی زندگی میں رفاہیت اور ظرافت کی رعایت سے کسی ایسے کام کو اپناؤ جس کے ذریعے زندگی کی گاڑی بہترین طریقے اور شاندار دھنگ پر چل سکے۔ یہ جو اکتساب میں زندگی کی گاڑی کے لئے احسن وجہ اور اہم وضع کی شرط لگائی ہے تو اس کا منشا اس کے سوا اور کیا ہے کہ شاہ صاحب عوامی زندگی کے ہر فرد کو احسن وجہ اور ارفہ وضع میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ آخر وہ ہی تو تبار ہے جس کے۔

اگر ایسا نہ ہوگا تو تم مشتقتوں اور محنتوں سے دوچار ہو گے۔ ضروریات کا
تم پر ہجوم ہوگا اور تم رفاہیت کے طریق پر کسی بھی ضرورت کو پورا نہ کر سکو گے۔

(بدور)

سور اٹھی کو دیکھئے کہ کتنے گھرانے اور کس قدر خاندان از دو حام حاجات کا نشانہ ہیں
مختیں کر رہے ہیں، مشتقتیں ہو رہی ہیں مگر حاجات کے ہجوم میں سب کا درجہ صفر کے
برابر ہے۔ شادی ہونے کے بعد زندگی ایک نئے دور سے گزرتی ہے، اولاد ہوتی
ہے۔ کون ہے جو اپنی اولاد کی تعلیم نہیں چاہتا۔ کون ہے جو بیمار ہو تو دوا نہیں چاہتا
یہ تو انسان کے تقاضے ہیں۔ حیوانیت کے درجے میں آکر اپنے دل سے پوچھیں کہ
کون زندہ کھانے کے لئے غذا، پہننے کے لئے کپڑا، رہنے کے لئے مکان،
اور بقاء نسل کے لئے رفیقہ حیات نہیں چاہتا۔ یہ حیوانی ضروریات ہیں یہاں
آبادیوں کی آبادیاں اس سے محروم ہیں۔ زندگی کے انسانی تقاضوں کا سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا۔ اس ماحول میں حسن وجہ اور ارفہ وضع کو دیا لے کر تلاش کرنا
ایک بے محل بات ہے۔

بتانا تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ شاہ صاحب کی نگاہ ارفہ وضع اور حسن وجہ
والی زندگی پر ہے۔ یہ زندگی اس وقت رونما ہو سکتی ہے جبکہ مکاسب کی راہیں
پر شخص کے لئے کھلی ہوں اور ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے موافق اپنی پسند سے
کام کا انتخاب کرے۔ اس راہ سے فراجمتیں ختم ہو جائیں۔ مکاسب میں بنیادی
چیز زراعت ہے۔ زراعت میں بنیادی چیز زمین ہے۔ زمین کے متعلق شاہ صاحب
کا نظریہ یہ ہے :-

الأرض كلها في الحقيقة بمنزلة مسجد اور باط جعل وقفاً علی بناء

السبب و هم شركاء فيه - (حجۃ اللہ البالغہ ص ۳)

سوال پڑھتا ہے کہ اگر زمین کی حیثیت واقعی بمنزلہ مسجد کی ہے تو اس میں ملکیت اور مالکیت کی حیثیت کیا ہے۔ مسجد تو ملکیت اور مالکیت دونوں سے برتر ہوتی ہے۔ زمین میں ملکیت کا مطلب بھی شاہ صاحب ہی کی زبان سے سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:-

و معنی الملك في الحق الا ان كونه
 احق بالانتفاع من غيرك ^{معا} رحمة الله
 مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ
 اسے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

میں تو اس سے یہی سمجھتا ہوں کہ رقبۃ الارض کی مالک رائے عامہ ہوتی ہے۔ افراد کی ملکیت اس میں صرف انتفاعی ہے اور شاہ صاحب نے زراعت کے متعلق یہ جو لکھا ہے کہ:-

ويشترط في ذلك ان لا يضيع بعضهم على بعض بحيث يفضي الى
 فساد التمدن رحمة الله

تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ صورت حال ایسی نہ ہونے پائے جو عوامی زندگی کی پریشانیوں کا سامان بن جائے۔

ہم جسے مزارعت کہتے ہیں۔ عرب سوسائٹی میں یہ لفظ ان معنی میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ ہم تو زمین کی راہوں سے تلاشِ رزق کی مخصوص صورت کھیتی باڑی کو مزارعت بولتے ہیں اور عرب تمدن میں زراعت کو نہیں بلکہ اس کی ایک مخصوص معاملاتی صورت کو مزارعت کہتے تھے۔ زمین کی راہ سے رزق جیسے بھی آرہا ہے اس کی انکے پہلے متعدد معاملاتی صورتیں رائج تھیں۔ مثلاً ایک معاملاتی صورت یہ تھی کہ باغ لگا پاؤا حمید کا ہے اس پر محنت رشیدی کی ہے۔ پھل دونوں میں تقسیم ہے۔ خواہ تقسیم کی کوئی صورت ہو اسے مساقات کہتے تھے۔ سفیدہ زمین اور بیج ایک کا ہے۔ محنت او جانور دوسرے کے ہیں اسے مزارعت کہتے تھے۔ سفیدہ ایک شخص کا ہے۔ بیج جانور

اور محنت دوسرے کی ہے۔ اسے مجاہدہ کہتے تھے۔ محنت ایک شخص کی ہے، سفیدہ زہیر
 بیچ اور جانور دوسرے شخص کا ہے اسے محافلہ کہتے تھے۔ یہ سب صورتیں زمین کی پیداوار
 سے متعلق تھیں۔ ایک صورت یہ کہ سب کچھ ایک شخص کا اور محنت دوسرے کی، مگر
 اجرت بصورت نقدی مقرر۔ اسے اجارہ کہتے ہیں۔
 مزارعت کے موضوع پر احادیث دو قسم کی ہیں:-

ایک طرف نافع کی وہ احادیث جن میں مزارعت کی نہیں ہے۔ لیکن اس میں روایت
 کا بہت بڑا اختلاف ہے۔ دوسری طرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیر والہ
 سے بٹائی کا معاملہ ہے جو قطعاً مزارعت ہے۔ اور اس کے ساتھ سربراہ آوردہ تابعین
 کا عمل ہے۔۔۔ نہی کی روایات میں چاہے کیسا ہی اختلاف ہو اور اختلاف بھی
 چلے اختلاف فاحش ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ نہی ہے اور خیر کے معاملے میں
 ایک گنجائش نکلتی ہے۔ گنجائش سے مراد وہ ہی ہے جو عام احناف نکالا کرتے
 ہیں۔ جو کہتے ہیں اور یہ معاملہ کرتے ہیں۔ وہ تو اس کی اباحت کے قائل ہیں۔
 شاہ صاحب نے بھی جو باقی علی اباحت، لکن اسی طرف اشارہ کیا ہے۔
 یہ تو سب مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت سے منع فرمایا ہے
 لیکن اس کے پس منظر میں مختلف ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ ممانعت کا تعلق اس معاملہ
 سے ہے جس میں زمیندار کی طرف سے قطعاً ارضی کی تعیین ہو جائے یا لوگوں پر
 پیداوار سے معاملہ متعلق ہو۔ رافع کہتے ہیں کہ یہ معاملہ منع ہے۔ کچھ کہتے ہیں
 کہ ممانعت صرف تنزیہیہ و تادیب کے درجے کی ہے۔ یہ ابن عباس کی رائے ہے
 بعض کی رائے میں وقتی حالات کے ماتحت مزارعت میں منافات کے رونما ہونے
 کی وجہ سے ممانعت ہے۔ یہ زید بن ثابت کی رائے ہے۔ گویا نہی پر سب ہی متفق
 ہیں مگر اس کی نوعیت میں مختلف ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بقول شاہ صاحب

بڑھوتری کی خواہش اموال مباحہ کی امدادی قوتوں کے بل بوتے پر انسانی معیشت کا
 مایہ خمیر ہے۔ یہ استثنا اور بڑھوتری جن جن راہوں سے ہوتی ہے ان میں زراعت
 بھی ہے۔ زراعت کا ایک مخصوص معاملاتی پیمانہ فراغت ہے۔ اس کی اہانت
 کو صرف اس وقت ہی برقرار رکھا جانا چاہیے جبکہ فراغت یہ بنیادی شرط پوری کر
 رہی ہو۔

ویشنزط فی ذالک ان لا یضیق ضروری شرط یہ ہے کہ یا ہم ایک دوسرے
 بعضهم علی بعض بحیث یفنی کی تنگی کا سامان نہ ہو جو شہری زندگی
 الی فساد التمدن رحمة اللہ کو بگاڑ کر رکھ دے۔

ذہنیت میں اس سے بڑا فساد اور کون سا ہوگا جو زراعت پیشہ لوگوں میں آج برپا
 ہو رہا ہے۔ نان شبینہ سے محتاج زندگی کی لذتوں اور امنگیوں سے محروم انسانی ضرورتوں
 کی پابجائی کے لئے بے چین ہیں۔ ان کی انسانی زندگی کے کسی رخ کو دیکھو اور معاشی
 حکمت کے ایک ایک پاب کو ان میں ٹٹولو۔

سب سے پہلے ایک انسان کی حیثیت سے ان کے کھانے کو دیکھو۔ نہ
 ماتھہ دھلے نہ منہ دھلا ہے۔ کھیتی کے کنارے بیٹھے ہیں۔ ایک موٹی سی باجے
 کی روٹی ماتھہ میں لئے ہوئے فرط غم سے بڑے بڑے نوالے منہ میں دے رہے
 ہیں۔ مرجوں کی چٹنی ہے یا پیاز۔ لقمہ سختی سے گلے کا ہار بنتا ہے تو چھا چھ کے
 ایک گھونٹ سے نوالہ نیچے اتارتے ہیں۔ نہ دسترخوان ہے نہ پلیٹ ہے نہ ماتھہ
 دھونے کی بالٹی ہے نہ پانی پینے کے لئے جگ اور گلاس ہے۔

وہ اس کی نظافت کو دیکھئے میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ ناخنوں
 اور بدن کے دوسرے حصوں میں مٹی گھسی ہوئی ہے جس سے ایک مسکین اور
 مفلوک الحال نظر آتا ہے۔ اس کا مکان جانوروں کے پیشاب کی جھیلوں سے اٹا ہوا ہے

زندہ پہنی پیشانی کا گیس ساری رات ہنس کے دماغ کا مکین بنا رہتا ہے۔ کھر کی ساری زندگی
 کوٹے اور کرکٹ کی زندگی ہے۔ بیمار ہوتا ہے تو دوا نہیں ہے۔ بچے موتے ہیں تو تڑپتی
 اور تعلیمی سامان نہیں۔ سفر کرتا ہے تو سواری کے لئے دام نہیں گفٹو سوتو وحشت
 صورت دیکھو تو خوف۔ اس سے بڑا فساد تمدن اور کیا ہوگا۔ کیا تمدن کا فساد اس وقت
 ہوگا جب زمیندار کے مکان میں گارے کے لئے اس کا خون اور اینٹوں کے لئے
 اس کی ہڈیاں کام آئیں گی۔ آہ انسانیت پر یہ ظلم عظیم ہے۔

اللہ اکبر! کیا اس کعبے میں زمیندار کی صورت میں جو انسان نما حیوان پھرتے
 ہیں۔ کیا وہ رفاہیت بالغہ کی تصویر نہیں ہیں۔ کیا وہاں معیشت کی تدقیقات اور
 تعمقات نہیں ہیں۔ اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو کیا شاہ ولی اللہ کی روح ہم سے پکار
 کر یہ نہیں کہہ رہی کہ

المصلحة حاکمة بسد هذا - المصلحة كالتفاضل ہے کہ اس
 الباب دہا
 دروازے کو بند کیا جائے۔

آخر شاہ صاحب ہی نے فسادِ تمدن کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ
 تمدن اور مدنییت کا فساد یہ ہے کہ بڑے بڑے لوگ زیورات،
 پوشاک، مکانات، کھانوں اور نسوانی آرائش کی باریکیوں میں بے
 جاہیں اور اس کے نتیجے میں لوگوں کی اکتسابی زندگی کا رخ انکی خواہشات
 کی پابجائی کی طرف ہو جائے۔ کچھ گانے اور ناچ کیلئے لڑکیوں کو
 تعلیم دیں اور کپڑوں میں رنگارنگ کے پیل بوتے۔ حیوانوں اور درختوں
 کی تصویریں بنائیں۔ کچھ سونے اور چاندی کی باریک صنعتوں میں لگ
 جائیں کچھ بلند بلند عمارتی تراکیب کا کام کریں۔ جب پبلک میں ان
 کاموں کا رجحان بڑھے گا تو زراعت اور تجارت پامال ہو جائے گی اور ان

بڑے لوگوں کے اموال خرچ کرنے کا ناگزیر نتیجہ مصالحت تمدن کی خرابی ہوگا
 بالآخر اکتسابی میدان تنگ سے تنگ تر ہو جائے گا ٹیکسوں کی
 بھرمار ہوگی۔ یہ ایک ایسا نقصان ہوگا جو تمام تمدن کے ایک ایک
 عضو میں پھیل کر مدینیت میں فساد پیدا کر دے گا۔ حجۃ اللہ البالغہ ص ۶۷
 تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمدن میں فساد کو جن راہوں
 سے آنے کا موقع ملتا ہے ان میں بنیادی چیز ہی رفاہیت بالغہ ہے اور آج رفاہیت
 بالغہ ہماری زندگی میں جس انداز سے بلا ارادہ آرہی ہے، وہ صرف مزارعت ہے۔ یہ

تو شاہ صاحب کی زبان سے سن چکے ہو کہ

ان الله تعالى سكرة الرفاهية

خدا سے زیادہ سرمایہ داری اللہ کو ناپسند

البانحة رمكنا

ہے

اور یہ بھی تم سن چکے ہو کہ

ان انواجب ان يجعل ميزان

معاشی میزانہ کے لئے ضروری

الحكمة العاشية ذالمرتبة الوسطی

ہے کہ درمیان ہو۔

لاغیر۔ (البدور البالغہ ص ۵۵)

اصول مکاسب میں سے تجارت بھی ہے۔ اصولی طور پر تجارت، تشریف ترین پیشہ ہے۔ مدینت

میں اس کی اصل یہ ہے کہ انفرادی مکاسب کی موجودگی میں ہر کسب ہر شخص کی زندگی کی
 حاجت برابری نہیں کر سکتا کیونکہ زندگی خواہشات کے مختلف ہونے اور ذراہوں کے تنوع
 ہونے کی وجہ سے چند در چند حاجات کا گہوارہ ہے۔ انہیں حاجات کی پابجالی مبادلہ سے
 کی جاتی ہے۔ اسی مبادلہ کا نام تجارت ہے۔ اور اسی کے زور پر سائے معاملات رونما
 ہوتے ہیں۔

تغہیات الہیہ میں شاہ صاحب نے جہاں مختلف فنون کو بیان کیا ہے۔ ان میں

اكتسابي فتنہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسی تذکرے میں جو یہ بات لکھی ہے۔

وينسب الاكساب الشرفية

لتوقفها على التلقى من

السلطان۔

تمام اچھے کاموں کی راہیں لوگوں پر اس

لئے بند ہو جائیں گی کہ ان کی پابجائی

سکاری ذرائع پر موقوف ہوگی۔

حالات کی کیسی اچھی تصویر ہے۔ جسے آج تجارت کہتے ہیں کو نسا شعبہ ہے جس

میں لائسنس کے بغیر شخص آزادانہ کام کر رہا ہے۔ کیا یہ لتوقفها على التلقى من السلطان

ہیں اور پھر صرف اتنا نہیں کہ کام میں تلقی من السلطان ہو اور آگے چھیٹو۔ بلکہ

تلقى من السلطان تک راہوں میں جس قدر دامنوں میں الجھنے والے کانٹے اور

جس قدر آؤزیشیں ہیں اسے وہ لوگ جانتے ہیں جنہیں آج کی تجارت سے کوئی تعلق

ہے۔ اگر شاہ صاحب نے اب سے ڈیڑھ صدی پہلے تمدن کی نقاب کشائی کرتے

ہوئے تلقی من السلطان کے بعد حالات اور مذہبیت کا ان لفظوں میں ماتم کیا ہے

کہ۔

و دون هذا التلقى مسابقات و مخاطفات و احتیالات

تو تعجب کا کون سا مقام ہے؟ آج بھی تو تاجروں کی زندگیاں مسابقات (بھاگ

دوڑ)، مخاطفات (لوٹ کھسوٹ) اور احتیالات (مکرو فریب) کی جلتی پھرتی تصویریں

ہیں۔ کن کن دفتروں میں دن دن مائے مائے پھرتے ہیں۔ سرمایہ اپنا، جان اپنی، نعمت اپنی مگر حساب

دوسروں کو دے رہے ہیں۔ قدم قدم پر ٹکیں سے۔ بکری ٹکیں سے لے کر بولتے جائیے آپ

تھکت جائیں گے، بھول جائیں گے مگر ٹکیں ختم نہ ہونگے۔ شاہ ولی اللہ نے فساد مذہبیت

کے جو دو سبب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ

ضرب الضرائب الثقيلة على

کسانوں، تاجروں اور کاریگروں پر

بھاری پھیر کم ٹکیں کا بوجھ ہوگا۔

الذرائع والتجارب والمتحرفات

کوئی مانے یا نہ مانے وہ بتا تو گئے ہیں کہ

شہری زندگی تو معمولی ٹیکس ہی سے

انما تصلم المدنیۃ بالجباۃ

ٹھیک رہتی ہے۔

السیرۃ

مگر آج کی زندگی جباہت یہ سے کیسے چلے۔ اگر ٹیکس نہ ہوں تو اوپر والوں کے مرفق
معیشت کیسے چلیں۔ مگر شاہ صاحب کے لفظوں میں قصر شامخ، آبنائے، حمام، پساتین
و دواب فارم، علمائے حسبان، توسیع مطاعم اور تخیل مالبر کے بغیر کام نہیں چلتا۔ شاد صاحب
تو اس زمانے کی بات کر رہے ہیں جب تمدن سواری کے لئے جانور رکھتا ہے۔ یہ جانور
کا نہیں ہوائی جہاز کا زمانہ ہے۔ وہ بالادستی ہی کیا ہے جہاں رہنے کے لئے شاندار
باغیچہ اور کوٹھی نہ ہو، خدمت کے لئے بیرے اور سواری کے لئے یو۔ ایس۔ اے کے
کارخانوں سے نکلی ہوئی کار نہ ہو۔ یہ چیزیں آسمان سے نہیں برستی ہیں بلکہ

لم تکن لتصلہ الا ببدل

بڑی سے بڑی رقم خرچ کئے بغیر

حاصل نہیں ہوتی ہیں۔

اموال خطرہ

اور اموال دولت الدین کا چراغ نہیں ہیں۔ ان کے آنے کی راہ اس کے سوا

اور کیا ہے۔

اور یہ رستم خطرہ کسانوں اور

لا تحصل تلك الا بموال الا

تاجروں پر ڈبل ٹیکسوں کے

بتصنیف الضرائب علی الفلاحین

بغیر حاصل نہیں ہو سکتی

والتجاری

ٹیکسوں کو چھوڑ کر ذرا ایک قدم بڑھائیے۔ ایک اور چیز کھیانک شکل میں سامنے

آتی ہے۔ یہ کنٹرول کا بت ہے۔ اس کا پس منظر جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اوپر والوں

کے مرفق معیشت کے غلط انداز اور ٹیکسوں کی ناروا بھربار نے ہر شخص کو نفع اندوز

بنارکھا ہے۔ اسی نفع اندوزی کا شکار تاجر بھی ہے۔ ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ عوام

کی خاطر ہو رہا ہے مگر پوتا ہی ہے کہ جس چیز پر کنٹرول کی نظر عنایت ہوئی وہ ایک عام بازار سے ختم ہوئی۔ سرمایہ داروں کو مایہ بنانے کا موقع مل جاتا ہے۔ غریب دانے دانے کو ترستا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ قیمتیں چڑھ گئیں۔ قیمتوں کا کنٹرول فرما دیجئے۔ جواب میں جو بات ارشاد فرمائی وہی سنانا چاہتا ہوں۔ فرمایا۔

ان الله هو المسحر القابض

الباسط اليراقق واني لا احوان

القي الله وليس احد يظلمني

بمظلمة

اللہ ہی نرخ مقرر کرنے والا، بند

کرنے والا، کھولنے والا اور روزی

رساں ہے۔ میں امیدوار ہوں کہ

اللہ سے ایسے حلال میں ملوں کہ

میرے ذمہ کسی حق کا مطالبہ نہ ہو

یعنی آپ نے کنٹرول کو اس لئے قائم نہیں کیا کہ اس سے آپ کو ظلم کی بوائی تھی۔ یاد پڑتا ہے کہ حافظ ابن القیم نے الطرق الحکمیہ میں لکھا ہے کہ کنٹرول کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت حرام اور ظلم ہے اور دوسری صورت جائز بلکہ کبھی کبھار واجب ہو جاتی ہے پہلی صورت یہ ہے کہ دوکانداروں کو خواہ مخواہ کسی ناپسندیدہ قیمت پر فروخت کرنے کے لئے مجبور کیا جائے یہ صورت حرام اور ظلم ہے۔ دوسری یہ کہ کنٹرول کا مقصد لوگوں سے عدل و انصاف کرنا ہو مثلاً یہ کہ راج الوقت قیمتوں پر فروخت کرنے کے لئے ان کو مجبور کیا جائے اور اس سے زائد قیمت پر بیچنا ان کے لئے ممنوع قرار دیا جائے۔ تو حکومت کی جانب سے یہ اقدام نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے پہلی صورت کے متعلق حضور کا یہ ارشاد ہے کہ ان الله هو المسحر القابض۔ ہاں اگر تاجر ذخیرہ اندوزی کر کے مصنوعی قحط کی صورت پیدا کر دیں اور عوامی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر ضروریات زندگی کی قیمتیں چڑھانا شروع کر دیں تو عدل و انصاف کا تقاضا ہی ہے کہ تشعیر کا قانون نافذ کر دیا جائے تاکہ ذخیرہ اندوز مرد جبہ اور بنا سبب نرخوں

سے زیادہ نہ وصول کر سکیں۔

شاہ صاحب نے بھی حجۃ اللہ البالغۃ میں یہ فرمایا کہ
فات سرودی منہم جوہر ظاہر

اگر کھلم کھلا ظلم معلوم ہو تو پھر

لا یشک فیہ جاز تغیرہ

کنٹرول درست ہے۔

دوسری صورت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور نہ صرف فتویٰ باہر کے بچنے کو مملکت

میں فساد قرار دیا ہے۔ فانہ من الافساد فی الارض۔ اور سوچنے کی بات ہے، کہ

ارشاد میں تسعیر سے حضور کی کنارہ کشی کا منشا دراصل اندیشہ ظلم ہے اور اگر تسعیر
نہ کرنے میں پورا معاشرہ ظلم کا یقینی طور پر شکار ہو رہا ہے تو پھر قواعد شرعیہ کی رو
سے اسے واجب ہونا چاہیے۔

علکم
والسلام یم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بنگلہ پروفیسر عبدالجبار حسنین ایم۔ اے۔ جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۵ اکتوبر ۱۹۵۳ء

اخلاق کا ہر شے، غضب اور شہوت کی پیرنگیاں، دونوں قوتوں کیلئے

تمثیلی رہبانیت ان کا ازالہ چاہتی ہے، اسلام ان کا ازالہ نہیں امانہ چاہتا

ہے، اخلاق کی کیفیات میں سے ایک کیفیت کا نام عبادت،

عبادت کے موصوع پر ارباب مذاہب میں فکر و نظر کا اختلاف،

عبادت کے عبادت ہونے کی شرطیں، اخلاص اور اتباع، عبادت

کی فضیلت پر تبصرہ، نشاء عبادت کی تعیین، ارباب فکر کے چار

اسکول، الہیت ایک صفت ہے جو خدا کے سوا کہیں نہیں پائی

جاتی، عبادت اپنی نیاز مندی اور منعم کی عظمت کا ایک معجون مرکب

ہے۔ مدعیان محبت کیلئے محبت کی نشانی، ختم نبوت رائے نہیں

بلکہ ایمان کی اساس ہے۔

عزیز العزیز!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔۔۔ پڑھ تو لیا شکر تم نے کبھی سوچا ہے کہ علم

کاشا کیا ہے؟ سنو!

انسانی طبیعت درحقیقت ایک سواری ہے اس پر سوار دو ہیں۔ غضب اور

شہوت۔ اخلاق جہافت کی جو پیرنگی اور تیس قدر بستہ تھی ہے وہ ابھی وہ سواروں

کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ شہوت نام سے جالب منافع والی قوت کا۔ اور غضب کہتے

ہیں دفع مفسد کی طاقت کو۔۔۔ اخلاق اچھے ہوں یا برے، سب کا ہر شے

یہی ہیں جیسے ضروریات میں شہوت کے استعمال کا نام عرمی سے لیسے ہی دانہ

سے دفع مضریت میں غضب کا استعمال عزت نفس ہے اگر دفع مضریت نہ ہو سکے

تو یہی حقد بنتا ہے اور شہوی قوت ضروریات کی پابجائی میں ناکام ہو تو اس سے حسد رونما ہو جاتا ہے۔ نجل ہو یا ظلم، کبر ہو یا فخر، سب ان دو قوتوں کی اولاد ہیں۔

ایک مثال سمجھ لو۔ پہاڑوں سے نکلی ہوئی ندی لپٹی کی طرف آرہی ہے منہ پر مکانات بنے ہوئے ہیں اور مکان والوں کو پتہ ہے کہ سیلاب بہا کر لے جائیگا۔ قوت غضب اور شہوت نہریں ہیں طبیعت کی گوکوں سے ہو کر دل کی آبادیوں سے گذرتی ہیں۔ نہریں پانی ضرور آتا ہے اور سیلاب بن کر آتا ہے حفاظتی تدابیر ضروری ہیں۔ حفاظتی تدابیر میں اختلاف ہے۔

عقل والوں کی ایک جماعت اس کوشش میں ہے کہ خود رو نہر کو دبانے سے جا کر بند کر دیا جائے۔ یہ طبقہ اپنے مکانات اور اپنی آباد کھیتوں سے ہٹ کر نہر کے بند کرنے کی فکر میں لگ گیا ہے۔

ایک دوسرا طبقہ نہر کے متعلق کچھ نہیں سوچتا بلکہ اپنی آبادیوں کی نچتہ کاری میں مشغول ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مکان اور اس کی بنیادیں اگر مضبوط ہوں تو نہر کا بہاؤ خواہ کیسا تیز ہو مکان محفوظ رہیں گے۔ نہر مکانات کے پاس آئے گی مگر اس کا رخ دائیں اور بائیں ہوگا۔ یہ طبقہ نہر کا رخ بدلنے کا فکر مند ہے۔ دونوں میں فرق ہے اور فرق بھی بہت صاف۔ پہلا طبقہ ازالہ کا خواہاں ہے اور دوسرا ازالہ چاہتا ہے۔

ربانییت نے تھلائی یا خدا شناسی کے لئے دنیا کو ازالہ کی راہ بتائی ہے اور نبوت نے ازالہ کی نہیں بلکہ ازالہ کی راہ بتائی ہے۔ قرآن کو غور سے پڑھو تو معلوم ہو جائے گا کہ طریق نبوت میں نیز سبکہ ازالہ کی روح کا رُخ پاس ہے۔ اسلام زندگی کے قدم روکنا نہیں چاہتا بلکہ قدموں میں رفتار باقی رکھتے ہوئے ازالہ کا رخ بدلنا چاہتا ہے۔ لوگ اسلام کا نام سنتے ہیں تو بگم جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسمعنا

ہے بنے ہوئے کو توڑ دینے کا اور بس۔ حالانکہ

عالم آب و خاک میں تیسے ظہور سے فرغ
ذرہ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب

اخلاق جن جن کیفیات کا نام ہے۔ ان میں ایک کیفیت وہ ہے جسے عبادت کہتے ہیں۔ عبادت کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ منعم سے محبت ہو اور ولی نعمت کے سامنے ضرورت مندانہ حالت میں عجز و بیچارگی کا مظاہرہ ہو۔ قوموں کے صدہا اختلافوں کے باوجود اس مرکزی نقطہ پر اتفاق ہے۔ اگر اختلاف ہے تو ولی نعمت کی تعیین اور اظہار محبت کے پیمانوں میں ہے طبعی نعمتوں کا سرچشمہ عناصر کو سمجھتے ہیں۔ صائبین کو اکب کی حرکتوں سے اس کا جوڑ لگاتے ہیں اور شرکانہ ذہن نعمتوں کے اس گرداب میں سب کو نہیں مگر کچھ اپنے من گھڑت اور خانہ ساز شریکیوں کا اثر قرار دیتے ہیں۔ نبوت کا نظریہ یہاں بالکل صاف اور واضح ہے کہ — ہاشمی کی گود میں جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہو رہا ہے وہ بلا شرکت غیر اللہ جل شانہ کی کار فرمائی ہے۔ مولیٰ سے مولیٰ بات یہ ہے۔ کہ اللہ جل شانہ نہیں مخلوقی صفات کا پیر تو یا مخلوق میں داعی اوصاف کی جھلک سمجھنا تمام برائیوں کی جڑ اور سارے غلط عقیدوں کا سرچشمہ ہے۔ اور دلوں کا پتہ نہیں مگر اسلام کی حد تک جو کچھ میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلام میں عبادت کے عبادت ہونے کے لئے دو بنیادی شرطیں ہیں۔ اول اجلاض، دوم اتباع سنت۔ اس وقت مسلمانوں کو غور سے دیکھو چار طبقوں میں تقسیم ہیں۔ بھڑکی مقدار اور مٹھی بھر وہ لوگ ہیں جو عبادات میں مخلص بھی ہیں اور متبع بھی۔ ورنہ کچھ مخلص تو ہیں مگر متبع نہیں اور کچھ متبع تو ہیں مگر مخلص نہیں۔ اور سب سے زیادہ گرا ہوا وہ طبقہ ہے جو نہ مخلص ہے اور نہ متبع — قرآن میں یہ دونوں شرطیں مذکور ہیں بلکہ اپنی دونوں کو قرآن حکیم نے موت و حیات کی کش مکش کا پس منظر قرار دیا

الذی خلق الموت والحیاة لیبوکم ایکم احسن عملاً۔

مشہور تابعی حضرت فضیل ابن عیاض سے احسن عملاً کی اخلص واصوب سے تفسیر منقول ہے جب ایک بار ان سے اخلص واصوب کی حقیقت دریافت کی گئی تو جواباً فرمایا کہ اگر عمل میں خلوص ہو مگر صواب نہ ہو تو ناقابل پذیرائی ہے اور ایسے ہی اگر صواب ہو اور خلوص نہ ہو — مقبول صرف وہ عمل ہوتا ہے جس میں خلوص اور صواب دونوں ہوں۔ خلوص یہ کہ عمل نرا دہار صرف اللہ جل شانہ کے لئے ہو۔ اور صواب کہ طریق سنت کے موافق ہو۔ یہ بات کھلم کھلا علی رؤس الاشہاد واضح ہو چکی ہے

کل عمل لیس علیہ امرنا فرہوسر۔

بتاؤ اب کون سی بات ہے جو سمجھائی نہیں گئی۔ اسے کاش مسلمان حقیقت شناسی کے کام لیتے مگر۔

ہوئی نہ زانغ میں پیدا بلند پروازی

خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زانغ

عارف رومی نے کیا خوب کہا ہے

ہر ملک بامت پیشین کہ بود

زانکہ بر جنبد گمان بردند عود

بات لمبی ہو جائے گی مگر ذرا کھٹہر جاؤ لگے ہاتھ احسن عملاً کے متعلق

دستے جاؤ۔ یوں فرمایا کہ ایک احسن عملاً یوں نہیں فرمایا کہ ایک بحسن

عملہ۔ دونوں میں فرق ہے۔ احسن اسم تفضیل ہے یہ فاعل معنی میں زیادتی بتا ہے۔ معنی یہ ہیں اچھے سے اچھا عمل اور بحسن کے معنی صرف اچھا

عمل کرتا ہے، ہیں۔ احسن عملاً چاہتا ہے کہ پہلے عمل کا کوئی اچھا نمونہ موجود ہو۔ اور پھر اس کے مطابق کام ہو اس طرح احسن دو بالا ہوگا۔ اچھا نمونہ قرآن ہی کا بتایا ہوا ہے کہ

لَقَدْ كَانَتْ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

انسوس کہ، لوگ عبادت کے نام پر اعمال خود بخود کرنے لگے حالانکہ ان کو نمونہ کے مطابق کرنے کو کہا گیا تھا۔ جنید بغدادی نے کیا اچھی بات فرمائی ہے۔

الطریق کاہا مسند و دة علی الخلق اکامنت اقتفی اثر رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم

خبر نہیں کہ یہ نظام عبادت میں من مانی کارروائیاں کرنے والے کس منہ سے کہتے ہیں کہ نبوت ختم ہے حالانکہ بالفعل اپنے کردار سے ان میں شخص منصب نبوت پر چھاپہ مار رہا ہے۔ بتاؤ تو سہی جو کچھ یہ کر رہے ہیں نبوت اس کے سوا اور کیا کرتی ہے اگر عبادت کے پیمانے بنانے میں یہ آزاد ہیں تو پھر اور کیا باقی ہے۔

یہ تو ہوئی عبادت کی بنیادی شرطیں۔ اب یہ بھی معلوم کر لو کہ سب سے نافع اور افضل عبادت کون سی ہے۔ اس میں بھی چار راہیں ہیں۔

۱۔ ایک طبقے خیال کے مطابق عبادت میں جس قدر زیادہ صعوبت، مشقت اور تکلیف سے سامنا ہوگا۔ اسی قدر اس کا فائدہ زیادہ ہوگا۔ ان کا کہنا ہے کہ اجرت بقدر مشقت ملتی ہے۔

۲۔ دوسرے فریق کی رائے میں ترک دنیا، بے تعلق، بے رغبتی، بے اعتنائی ہی سب سے اونچی عبادت ہے۔ یہ خیال رکھنے والے پھر دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک عوام، ان کے تصور کے مطابق زندگی کا مقصد ہی ترک دنیا ہے۔ دوسرے خواص ان کے نزدیک مقصود تو اعس میں دلی میں اللہ جل شانہ کی محبت، انابت

اور توکل ہے۔ مگر دنیا سے بے رغبتی اس مقصود تک پہنچنے کے لئے زینہ ہے۔ ان کی رائے میں افضل عبادت یہ ہے کہ ہم وقت، ہمہ آن قلب و لسان یاد الہی میں مشغول ہوں۔ اس کی نماظر مراقبات اور اشتغال ہیں۔ ان کی بھی پھر دستہیں ہیں۔ کچھ وہ جو نوائے متبعین ہیں کہ اوامر و نواہی کیلئے ہم وقت تیار رہتے ہیں خواہ اس کی خاطر ان کو اپنی جمعیتوں اور مراقبوں سے دست کش ہونا پڑے۔ اور ایک طبقہ ان میں وہ ہے جو صرف قلبی جمعیتوں ہی میں مگن رہتا ہے۔ یہ دوسرا حصہ پھر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ان میں کچھ وہ ہیں جو ان قلبی جمعیتوں کے چھپے فرائض و واجبات ہی کو چھوڑ بیٹھا ہے۔ اور ایک طبقہ فرائض و واجبات کی حد تک تو مطالبات کی پابجائی کرتا ہے مگر جمعیت قلبی کی خاطر سنن اور مستحبات کے چھوڑنے میں بے باک ہے۔

۳۔ تیسری جماعت کے عندیہ کے مطابق عبادت کی انفعیت کا دار و مدار اس کے تعدیہ پر ہے مثلاً خدمتِ خلق، محتاجوں کی امداد، لوگوں کی ضروریات میں اشتغال۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ عابد کا عمل اپنی ذات کیلئے ہے۔ اور نفع رسانی کا معاملہ دوسرے کے لئے ہے یہ بہر حال افضل ہے۔ اس لئے متعدی عبادات ہی کا درجہ اونچا ہے۔ اس موضوع پر وہ مختلف احادیث بھی پیش کرتے ہیں جن سے تعدیہ عمل کی بزرگی ثابت ہوتی ہے۔ الغرض ان کی رائے میں قلبی جمعیتوں اور مراقبوں سے کہیں اونچا مقام تعدیہ عمل والے افعال کا ہے۔

۴۔ چوتھی جماعت یہ اعتقاد رکھتی ہے کہ ہر وقت حالات کے تقاضوں کے موافق رضائے الہی کو پیش نہا بننا کرنا سب سے اونچی عبادت ہے۔ جہاد کے وقت میں جہاد سب سے بڑی عبادت ہے تہجد اور اذکار و اوراد کو چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دے بہانہ آجائے تو اوراد و اشتغال اور سب نفل کاموں سے اونچا عمل اس کی میزبانی ہے۔ جو بیچے موجود ہوں تو نوافل و اذکار سے زیادہ ثواب ان کی معاشی الجھنوں کو دور کرنے میں

ہے: صبح کو سحری کے وقت میں نماز، قرآن، ذکر، دعا اور استغفار سب افضل ہے۔ ان کے لئے اور طالب علم کے لئے تعلیم کے وقت میں علمی مشاغل، اذان ہوتے وقت اذان کی اجابت اور دوسرے اوقات کا چھوڑ دینا نماز پنجگانہ کے اوقات میں نماز پنجگانہ کے لئے سرگرمی اور اس کی اتمام، محتاج اور ضرورت مند کے ہوتے ہوئے ہر کی امداد، مقام، منصب، مال، جان اس کی اعانت میں صرف کرنا اور اسے سمجھ جمعیتوں اور خلوتوں پر مقدم کرنا سب سے اونچا عمل ہے۔ قرآن پڑھتے وقت جمعیت سمیت اس انداز سے پیدا کرنا گویا حق ذوالجلل کے سامنے موجود ہو۔ عزوات میں ذکر، تضرع و زاری میں وقت لگانا، ایام عشرہ ذی الحجہ میں تکبیرات، تہلیلات، تحمیر کی بہتات، رمضان کے عشرہ میں خلوت گزینی اور مسجد میں اعتکاف بہترین عبادت ہے۔ مسلمان بھائی بیمار ہو اس کی عیادت کرنا۔ مرگیا ہو تو جنازہ میں جانا، خلوت اور جمعیت سے کہیں زیادہ اونچا ہے۔ لوگ مصائب میں مبتلا ہوں، تکلیفوں شکار ہوں، ان سے الگ نہ ہونا، صبر کی پوری قوت کے ساتھ ان میں رہنا پیشہ افتادہ تکلیفوں کو برداشت کرنا ہی برگزینہ عمل ہے۔

ماحول میں نیکیاں ہوں تو جلوت اور برائیاں ہوں تو خلوت افضل ہے۔ ہر عمل فضیلت اور بزرگی کا اصلی معیار وہ حالات ہیں جن میں وہ عمل ہو رہا ہے۔ اصل وقت کو پورا کرنا ضروری ہے اور یہی اس وقت افضل ہے اور پس۔ دراصل یہ اختیاق مقصود عبادت پر عزم نہ کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ جب کسی کام کا مقصد معلوم نہ ہو غلط مصلحت سمجھی نہ گئی ہو تو یہ اختلاف ناگزیر ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے عبادت کا نسا کیا ہے، افسوس کہ ارباب فکر منشاء عبادت متعین کرنے میں ہی گروہوں میں پٹے ہوئے ہیں۔

اول وہ گروہ ہے جس کے نزدیک عبادت کا کوئی منشا، مقصود اور غرض

میں ہے۔ اور صرف امری درجہ ہی اس کا سبب ہے اور بس — معاشی سعادت
 اور معادی نجات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس غیر معقول عقلیت کا اظہار
 ان لوگوں کی جانب سے ہوتا ہے جو افعال الہیہ میں کسی حکمت و مصلحت کے قائل
 ہی نہیں ہیں گویا پھیلی ہوئی اس زندگی کا نہ کوئی مقصد ہے نہ علت ہے نہ کوئی
 آیت ہے اور نہ کوئی حکیمانہ حکمت ہے۔ نہ یہاں اسباب اور مسببات کا کوئی رشتہ
 ہے اور نہ مخلوقات میں قوت اور طبیعت ہے —

حافظ ابن القیم نے مفتاح دار السعادة اور طریق الہدیین میں اس نظریہ کی
 مباحث پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس طبقہ کا سرگروہ جعد بن درہم ہے حکیم الامت
 شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ کے مقدمہ میں اس نظریے کے پوتے
 پر بہت لے و سکا ہے۔ واقعی حکیم الامت نے سچ فرمایا ہے کہ۔
 هذا ظن فاسد تکذب السنۃ واجماع القرون المشہود

لہا بالخیر

بلکہ اس سے بھی ترقی کر کے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ
 من عجز ان یعرف — فانه لم یمسہ من العلم الا کمات
 یمس الابرة من الماء حین تغمس وتخرج
 کیا اس فقرے میں شاہ صاحب نے یہ راز فاش نہیں کر دیا کہ اس طبقے کو علم
 کی ہوا بھی چھو کر نہیں گذری ہے اور بقول حضرت شاہ صاحب یہ فخر کی بات نہیں بلکہ
 ہو بان بیکی علی نفسہ احق من ان یعتد بقولہ
 گویا بریں عقل و دانش باید گر لیسیت والا معاملہ ہے۔

دوسرا گروہ اس کی بالکل اپوزیشن، اور اس کے زور بیان کو دیکھ کر کچھ
 لوگوں نے مان ہی لیا ہے کہ اس نظریہ کی بنیاد عقلیت پر ہے۔ اس کا کہنا

ہے کہ عبادات کا مقصد وہی ہے جو بازار میں خرید و فروخت دین میں سیکہ کا ہوتا ہے۔ گویا عبادات ان اجور، ثواب اور نعمتوں کی قیمتیں ہیں جو بارگاہِ حقیقیہ و قیوم سے بندوں کو ارنالی ہو رہی ہیں اور ہوں گی۔ اس نظریہ کی بنیاد پر اللہ اور اس کی مخلوقات کے باہمی تعلقات بائع اور مشتری کے اور مستاجر و اجیر کے بنتے ہیں۔

یہ دونوں گروہ اپنے نظریات میں ایک دوسرے کے مد مقابل ہیں اور دونوں میں حد درجہ تباہی ہے۔ پہلا طبقہ اعمال اور اس کی جزا میں اگر سرے سے ہر تعلق کی نفی کرتا ہے اور یہ جائز قرار دیتا ہے کہ اللہ جل شانہ، اس کو بھی عذاب و تکلیف کی آماجگاہ بنا دے گا جس کی ساری عمر خدا کی طاعت میں ختم ہو گئی ہو اور اس کو نعمتوں سے مالا مال کر دے گا جسے عمر بھر میں کوئی سانس بھی خداوند ذوالجلال کی بغاوت کے بغیر نہ لیا ہو۔ دونوں کا مقام ایک ہے۔ تو دوسرا گروہ اعمال ہی کو اصل قرار دیتا ہے اور اللہ جل شانہ کے فضل و رحمت اور قدرت کو اعمال کی زنجیروں میں جکڑ کر اصلح کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ درحقیقت دونوں ہی صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں۔ پہلا اس لئے کہ اعمال ثواب و عقاب کے لئے اسباب ہیں یہ بھی اپنے مقتضیات سے ایسا ہی تعلق رکھتے ہیں جیسے دنیا کے سارے اسباب مسببات سے۔ دوسرا اس لئے کہ اعمال صالحہ کا رشتہ وجود اللہ جل شانہ کی توفیق اور فضل و رحمت سے ملا ہوا ہے۔ اس لئے اعمال بذاتِ خود قیمت نہیں ہیں۔ ارشادِ نبوت

لَنْ يَدْخُلَ أَحَدٌ مِنْكُمْ الْجَنَّةَ بِعَلْمٍ فِي بَاءٍ عَوْضٍ أَوْ مِقَابِلَةٍ لَمْ يَكُنْ فِيهَا مِنْ عِبَادَاتِ اللَّهِ كَمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ فِي بَاءٍ سَبِيحَةٍ

کے لئے ہے اور اس گروہ کی صاف اور کھلی تردید ہے جو عبادات کو نعمتہائے الہیہ کی قیمتیں بتلاتے ہیں۔ اور زبانِ وحی ادخلوا الجنة بما كنتم تعملون میں بقاءِ سبیت کے لئے ہے اور اس گروہ کی صاف اور کھلی تردید ہے جو جزا اور اعمال کے درمیان

کسی ربط باہمی کا قائل نہیں ہے۔ گویا دونوں اذراط و تفریط کا شکار ہیں۔ راہ اعتدال اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اعمال نعمت ہائے الہیہ کے لئے سبب ہیں مگر عوض اور قیمت نہیں ہیں یہی مسلک حق ہے۔ تیسرا اگر وہ بھی ہے۔ اس کے خیال میں عبادت کی عوض یہ اور صرف یہ ہے کہ ریاضت اور مجاہدہ کے ذریعے نفوس انسانی میں فیضانِ علوم کی صلاحیت رونما ہو جائے اور نفس اپنی بہیمی اور سبعی قوتوں سے الگ تھلک ہو جائے۔ اس گروہ میں دو طبقے ہیں۔ ایک وہ فلاسفہ جو قدم عالم وغیرہ کے قائل ہیں۔ دوسرے فلاسفہ صوفیائے اسلام دونوں عبادات کو ریاضیات کے درجہ کی بات سمجھتے ہیں۔

چوتھا گروہ محمدی اور ابراہیمی ذہن رکھتا ہے۔ عبادت اور اس کے پس منظر، غایت اور عوض کو ایک تحقیقی نظر سے دیکھتا ہے اور یہ نظریہ ٹھیکہ فطری اور عقلی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عبادت کا کوئی پس منظر الہیت کی حقیقت سے الگ ہو کر نہ مقرر ہو سکتا ہے اور نہ ہی تصور میں آ سکتا ہے۔ الہیت بھی خدا کی دوسری صفات کی طرح ایک صفت ہے اور یہ صفت اللہ جل شانہ کے سوا کہیں نہیں پائی جاتی نہ حقیقتاً نہ مجازاً۔ خداوند ذوالجلال کی الوہیت ہی عبادت کا اصلی سبب، اثر اور تقاضا ہے۔ اللہ اور عبادت میں باہم ایسا ہی تعلق ہے جیسے متعلقات صفت کو صفت کے ساتھ ہوتا ہے۔ کیا معلومات بغیر علم کے اور مقدرات بغیر قدرت کے کوئی وجود رکھتی ہیں؟ اگر نہیں رکھتی ہیں اور یقیناً نہیں رکھتی ہیں تو پھر عبادت کا بغیر الہیت کے وجود کیوں اور کیسے ہو سکتا ہے؟ الہیت خود بخود چاہتی ہے اسی طرح جیسے بھوک روٹی اور پیاس پانی چاہتی ہے۔

جیسا پہلے بتا آیا ہوں کہ عبادت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ منعم کے

انعامات کی بے پایاں بارش دیکھ کر خواہ مخواہ آدمی تو آدمی حیوانات میں بھی وجدانی طور پر ایسی محبت پیدا ہوتی ہے جس میں اپنی نیاز مندی اور منعم کی عظمت کی آمیزش ہوتی ہے یہی تعظیم و تذلل کے امتزاجی پیمانہ محبت سے عبادات کی قسمیں بنتی ہیں۔ اس لئے اصل عبادت اللہ جل شانہ کی محبت ہے۔ نہ صرف محبت بلکہ بلا شرکت غیرے محبت اللہ جل شانہ کی عبادت ہے۔ اس کے ساتھ کسی سے بھی محبت نہیں ہو سکتی ہے۔ محبت اگر کسی سے ہو سکتی ہے تو صرف اس کی خاطر ہو سکتی ہے۔ انبیاء و اولیاء سے اسی لئے تو محبت ہوتی ہے کہ وہ اللہ والے ہوتے ہیں۔ چونکہ عبادت کی حقیقت، غایت محبت ہے اور محبت کا کوئی مرحلہ بغیر اوامر کے اتباع اور نواہی سے اجتناب کے پورا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نبوت کی اتباع ہی کو مدعیان محبت کے لئے محبت کی نشانی قرار

دیا ہے۔ قرآن میں ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

اللہ سے محبت کی لازمی شرط اتباع رسول بتائی گئی ہے چونکہ مشروط کا شرط کے بغیر پایا جانا مجال ہے اس لئے اتباع نہ ہونے کی صورت میں محبت ناممکن ہے کوئی شخص ولی نہیں ہو سکتا اتباع چھوڑ کر۔ اور یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ پیغمبر کی اتباع کو مشروط محبت قرار دیا گیا ہے صرف اطاعت کو نہیں۔ اتباع اور اطاعت میں بہت بڑا فرق ہے۔ اطاعت وہ ہے جسے ہم اردو میں کہا جاتا ہے کہتے ہیں اور اتباع کہتے ہیں کسی محسوس اور مرئی نمونہ کے مطابق کرنے کو اور بات چنانچہ کہتے ہیں۔ اس لئے سارے قرآن میں یہ کہیں نہیں آیا کہ اللہ جل شانہ کی اتباع کرو یہ ضرور آیا ہے کہ اطاعت کرو اور اسی لئے اطاعت کا مطالبہ زبان نبوت نے سیاسیات میں متب کے لئے کیا ہے۔

فرمایا

اطيعوا ولو غداً حشيتاً

مگر اتباع کا دائرہ صرف خلفاء راشدین تک محدود رکھا ہے۔ کیونکہ ان کے متم
اعمال براہ راست سراج رسالت سے ماخوذ تھے، شرطِ محبت چونکہ اتباع ہے۔ اس لئے
نصر آبادی کہا کرتے تھے

ادعیتم حب رسول اللہ و ترکتم سنتہ

آدم بر سرِ مطلب: عزیزِ من! علم کا منشا یہ اور صرف یہ ہے کہ محبت کے لئے جس
کی اتباع کو شرط قرار دیا گیا ہے اس کی زندگی کی مختلف حالتیں، اعمال، احوال سامنے آجائیں
تاکہ ایک انسان مسلمان ہونے کے بعد شرطِ محبت کو پورا کر سکے۔

شاید تم اسے فرزانگی کہو مگر میں تو اپنے اس عمل کو جو ختم نبوت کے سلسلے میں
مجھے قید و بند تک لے آیا دیوانگی اور صرف دیوانگی سمجھتا ہوں۔ فرزانوں کو تو تم سمجھا سکتے
ہو، بہلا سکتے ہو مگر دیوانے دیوانے ہوتے ہیں یہاں افہام و تفہیم کام نہیں دیتا
عشق کے گوید کہ اے محکوم خیر سینہ تو از بتاں مانند دیر
تانہ داری از محمد رنگ و بو از درود خود میالا نام او

اس موضوع پر اپنی ذات کی حد تک صرف اتنا جانتا ہوں کہ چالیس سال کی عمر کا تقریباً
اوپر حصہ مطالعہ و تحقیق اور فکر و غور میں بیت گیا ہے۔ اس بیس سال کی مدت میں پڑھ کر
سن کر، سوچ کر، سمجھ کر اور مشاہدہ تجربہ کر کے اس بارے میں میری معلومات کا ایک
نام سنا پرن چکا ہے۔ میں ایک یقین رکھتا ہوں جس کی پشت پر برسوں کے مطالعہ
ت فراہم کئے ہوئے دلائل ہیں۔ میں نے جس چیز کو حق پایا ہے۔ اس پر پختہ قلبی
اطمینان اور دائمی سکون کے ساتھ ایمان لایا ہوں۔ میری یہ معلومات میری ذات
تک محدود نہیں رہیں بلکہ میں پوسے انہیں سال سے ان کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ اب اگر
کسی نے یہ سمجھا ہے کہ میری معلومات، میرے خیالات اور میرے عقائد کو صرف
طاقت اور جہل کی دلیل سے بدلاتا جائے گا۔ تو میں اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہوں

کہ ایسے شخص کا مقام ایوان حکومت نہیں بلکہ کچھ اور ہے اور اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس دباؤ میں آکر میں اپنا ایمان اس کے پاس رکھ دوں گا اور آئندہ لاشن کٹے ہوئے خیالات ہی ظاہر کروں گا تو میں اس کو آگاہ کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اپنی ترازو میں تولنے میں غلطی کی ہے میرا دل صداقت کے لئے تو ہمہ وقت کھلا ہوا ہے اور میری رائے کو علمی اور عقلی دلائل سے بدلا جاسکتا ہے۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت میری رائے یہ نہیں بلکہ میرا ایمان ہے اور ایمان قابلِ بیع و رہن چیز نہیں ہے۔ تین ماہ کی قید کے بعد جب میں باہر گیا تو میرا درس، جمعہ کی تقریر اور عید گاہ کا خطاب لوہا ہے کہ میرا پہلا بول وہی تھا جس کی یاداش میں تین ماہ اندر رہ کر جا چکا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ یہ ایمان ہے اور اس کا اظہار میرا پیدائشی حق ہے۔ اسے دبانے کی پہلے بھی جس نے کوشش کی ہے ناکام ہوا ہے اور آئندہ بھی جو کرے گا انشاء اللہ ناکام رہے گا۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ذاتِ نبوت سے عشق ہو اور چھپ جائے۔ یہاں شرطِ محبت ہی اتباع ہے اور بس۔ تم نے اگر اس وقت وقت کا مطالبہ پورا نہیں کیا تو یہ رونے کا مقام ہے۔ قرآن نے تم کو میں پیچھے رہنے والوں سے کہا تھا۔

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا

خدا سے اس گناہ کے لئے مغفرت کی دعا مانگو۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

بنام مولانا عطلد الرحمن عتیق مولوی فاضل دینی، اے۔ پی۔ ٹی، محلہ دھارو وال سیالکوٹ

۳۰ اکتوبر ۱۹۵۳ء

اسلامی نظام حیات کی برتری کی تمنا، رائے عامہ اور جمہوریت، رائے عامہ کے جائزہ لینے کا طریق، باطل کی ہواؤں سے حقائق کے چراغ نہیں بجھتے، جو کچھ مل جائے ٹھنیت ہے۔ سب کی فکر میں سب کچھ نہ چھوڑنا دانش مندی ہے، زعامت اور قیادت کا فرق —

عزیز من! السلام علیکم

دھیرے دھیرے حالات کو بدلتے ہوئے پڑھ پڑھ کر گڑھ رہا ہوں۔ اپنے لئے نہیں، اپنا تو ہے ہی کیا۔ آخری سالس ہیں۔ خدا کرے ایمان کے ساتھ دنیا سے روانگی ہو۔ زندگی تو اپنے ملک کے عوام کی وجہ سے گڑھن ہو رہی ہے۔ کیا ہوگا۔ کیا واقعی ایسا وقت آئے گا کہ اس ملک کی عوامی زندگی راحت کا سالس سے گی اور ان زمین پر لیٹنے والوں، بھیک مانگنے والوں، دواؤں سے محتاج ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینے والوں کو رہنے کیلئے اچھا مکان، سواری کے لئے کار، کھانے کے لئے عمدہ عمدہ اور نذید کھانے اور بیماری کے لئے شفا خانوں کی امداد ملے گی؟؟؟

پڑھتے ہیں کہ اسلام نے اپنے عہد اقتدار میں عوامی معاشرے کو اتنا بے نیاز اتنا باوقار اور متمول بنا دیا تھا کہ صاحبِ نصاب کو صدقہ دینے کے لئے ڈھونڈنے سے شہری زندگی میں کوئی غریب نہ ملتا تھا۔ واہ واہ کیا کہنے ہیں، اس نظام کے۔ اور کیا پارسی زندگی ابن آدم کیلئے پھر جنت کی پرکیف اور شاداب زندگی نہیں۔ بس گڑھن یہی ہے اور غم اسی کا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایک دفعہ تو خالص اسلامی زندگی خس و خاشاک سے صاف ہو کر سرابِ ضلالت میں کھٹکتی ہوئی دنیا کے سامنے آجائے علمی نہیں بلکہ عملی طور پر۔ کم از کم ان نادانوں کو جو ہر قدم پر اپنے گھر سے ہٹ کر دوسروں

کے لقموں کو دیکھتے رہتے ہیں اور ہر نظر فریب لگے کو دیکھ کر لٹو ہو جاتے ہیں۔ کبھی
 کیونٹزم، کبھی فیسٹی ازم اور کبھی امپریلیزم کا منہ دیکھتے ہیں۔ پتہ لگ جائے کہ اسلامی
 نظام حیات کی برکتیں کیا ہیں دستور ساز اسمبلی نے قدم تو اٹھایا ہے مگر کیا کہوں اور
 کس سے کہوں۔ ان اوپر والوں کو کچھ پتہ نہیں کیا ہو گیا اور کس دھن میں ہیں۔ ڈھنڈ
 بیٹھے ہیں۔ جمہوریت کا مگر کردار پیش کرتے ہیں۔ امپریلیٹوں کا۔ اسلام کو ان لوگوں
 نے ہوا بنا دیا ہے۔ ساری آبادی اسلام اسلام کر رہی ہے۔ مگر ان کے کالوں پر
 جوں نہیں رہی گئی۔ اور مزہ یہ ہے کہ ہر سانس میں جمہوریت کی راگنی لاپتے ہیں
 پتہ نہیں کہ ان کی لغت میں جمہوریت کس بلا کا نام ہے۔ آزاد ملکوں کا دستوریہ
 کہ جمہور کی جانب سے چنے ہوئے نمائندے ہر قدم پر جمہور کے احساسات کا احترام
 کرتے ہیں مگر یہاں کا الٹا دستور ہے۔ رائے عامہ مطالبہ کرتی ہے اور پوری قوت
 سے مطالبہ کرتی ہے۔ جلسے کرتی ہے۔ جلوس نکالتی ہے۔ قراردادیں پاس کرتی
 ہے۔ تاریں بجانہ کرتی ہے۔ لفافوں اور کارڈوں کے پلندے کے پلندے بھیج دیتے
 جاتے ہیں مگر اگر ٹی ہوئی گردن یہی کہتی رہتی ہے کہ ایک مخصوص طبقے کی آواز
 ہے۔ یہ جتانے کے لئے کہ یہ آواز عوامی ہے۔ جب عوام خود ہی پانچ آدمیوں کو
 وزیروں کی کوٹھی تک بھیننے کا ارادہ کرتے ہیں اور ہر شہر سے اس کے لئے قدم اٹھاتے
 ہیں تو یہی عوام کے نمائندے اور جمہوریت کا لاگ الاپنے والے عوام کے خون سے
 ہونے کیلئے ہیں اور نام رکھتے ہیں اس کا لاء اینڈ آرڈر — جب دل کی بھر پور اس
 سے بھی نہیں نکلتی تو خالص امپریلیٹ کا مخصوص مستبدانہ اور حاکمانہ چولہا پین کرنا
 کے مشہور اوڈ وائر کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ کیسی بے انصافی اور کیسے بیچارے عوام کو
 پریشان کرنے کا سامان ہے۔ کوئی ان سے پوچھے خدا کے بندو با یہ کہاں کی جمہوریت
 ہے۔ انصاف تو یہ تھا کہ اگر عوام کے نمائندوں کو کسی مطالبے کے عوامی ہونے

کالیقین نہ آئے تو اس کے لئے یقین کے ذرائع پیدا کریں۔ ہر شہر میں خود جلسوں میں
 پہنچیں۔ اگر یہ نہیں تو استصواب کرا لیں سارے ملک کا نہ سہی ایک صوبے کا کرائیں
 سارے صوبے کا نہ سہی ایک ضلع کا کرائیں۔ سارے ضلع کا نہ سہی تو ضلع وار ایک ایک
 تحصیل کا کرائیں۔ مگر یہ کام تو وہ کرے جسے رائے عامہ کے سامنے جھکنا ہو اور جو
 کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد رائے عامہ کو جھکوانے اور کچلنے کا ہتھیار چکے ہوں وہ
 ایسا کیوں کریں؟ تحریک ختم نبوت اسی استبداد کی بھینٹ چڑھ گئی۔ رائے عامہ کو باطل
 کر دیا گیا۔ پانالی کی وجہ جواز کے لئے بھانت بھانت کی بولیاں بولی گئیں
 بتایا گیا کہ ہندوستان سے مل گئے۔ کہا گیا کہ دولت نامہ اقتدار کا خواہاں ہے۔ اس
 نے مولویوں کو پیسے دے کر استعمال کیا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر کیا باطل
 کی ہواؤں سے کہیں حقائق کے چراغ بجھے ہیں۔ حقیقت تو حقیقت ہے
 خواہ اس کے لئے مجاز کے کتنے ہی مصنوعی ڈھانچے بنائے جائیں۔ مجھے
 اب اسلام کا نہیں بلکہ اسلام والوں کا دکھ کھائے جا رہا ہے۔ ۱۹۲۶ء
 ایک خواب شیریں تھا۔ مزہ بڑا آیا۔ خواب کھتا واقعی یہ خواب کہ اسلام بے اقتدار
 ہے۔ قرآن و سنت راجح، خلافت راشدہ کا دور عود کر آیا ہے۔ بازاروں
 میں کلبوں میں، عدالتوں میں خدا اور رسول کی طاعت ہی طاعت ہے۔
 ان سب باتوں کے باوجود اب تک جو کچھ ٹوٹا ہے خوب ٹوٹا ہے
 میں اس اصول کا آدمی ہوں کہ مالایدار کا کلہ کا پتلا کلہ۔ جو کچھ ٹوٹا ہے
 غنیمت ہے۔ اگر بلا دست قوت سارح ہو تو اسی سے بہت کچھ غیر معمولی فوائد و نفا
 ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ ابھی خود اس میں بہت کچھ لب کشائی اور مطلب برآری کی
 گنجائش ہے۔

ادل تو آئین اور قانون کی خود باہمی آدیزش ایسی ہے جس سے چابکدست

بآسانی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

دوم یہ کہ قرارداد کا النطاق مستقبل میں بننے والے صوبائی قانون ساز اداروں کے قوانین پر ہو۔

سوم راج الوقت قوانین نہ کالعدم ہوں گے اور نہ ان کو قرآن و سنت کی مخالفت کے بہانے سے فیڈرل کورٹ میں چیلنج کیا جاسکے گا۔

چہارم شہریت اور شہری آزادی خود محتاج تشریح ہے۔ کل کا ذکر ہے کہ پنجاب کے قانون ساز ادارے نے شراب کی بندش کا قانون بنایا اور ایک شخص نے اس کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کیا۔ عدالت نے شہری آزادی کے بہانے سے قانون کو ناجائز قرار دیا۔

پنجم مذہبی آزادی کا جو ٹائٹل دستوری طور پر دیا گیا ہے۔ وہ اس مرحلہ پر عجیب نہیں کہ بے دینی کی وبا پیدا کر دے اور زمانہ اکبر کی طرح ایک گروہ ایسا پیدا ہو جائے جو قرآن و سنت کی بیان کردہ حادوں کو اپنے فکر و نظر کی کوتاہیوں سے پامال کر دے۔

ششم دستوری چربے کی یہ ایٹیم بڑی ہی خطرناک ہے کہ قرآن و سنت کی تعبیر جو فرقہ جس طرح کرے گا۔ اسی کو اسی طرح مانا جائیگا۔

شعبوں کو جلنے دیتے یہ تو شاہی فرقہ ہے۔ چکرالوی فرقہ اور بھنگ پینے والوں کا مخصوص فرقہ ہے یعنی جنہیں ہم اہل سنت کہتے ہیں۔ ان

میں خود ہزاروں مذہبی بولیاں بولنے والے موجود ہیں۔ کل کی بات ہے کہ عکس پر کجروں کے مانع کے متعلق پنجاب اسمبلی میں سکندر کے زمانے

میں کسی شخص نے آواز اٹھائی تو سر شہاب الدین نے یہ کہہ کر ختم کر دی کہ مذہب میں مداخلت ہے اور مذہبی مداخلت شہری آزادی کے

خلاف ہے۔

اب خود فرمائیے کہ ان حالات میں اس اسلامی جمہوریہ میں قرآن و سنت
کی کس حد تک پابجائی ہوگی۔
الغرض ابھی بہت کچھ خدشات ہیں۔ اور کیا عرض کروں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

نبیام بمرولانا مفاظ خواجہ محمد احسان الحق صاحب مولوی فاضل ایڈوائسریٹریٹ سول جج گوجرانوالہ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۳ نومبر ۱۹۵۳ء

خلوت ایک بہت بڑی نعمت ہے، اللہ سبحانہ کی شان جمالی و جلالی، بلا اور
بلا حسن میں فرق، شیخ اکبر اور مولانا روم کا نظریہ، علامہ محبت اللہ
بہاری کا تعارف۔

عزیز! السلام علیکم

مورخ ۳ نومبر وقت عصر ہے۔ اذکار سے فراغت ہوئی تم یاد آئے۔ یہ پتہ نہیں
کہ کیوں؟ تم تو سوچتے ہو گے کہ مجھے تکلیف ہو گی۔ اس لئے کہ جہاں میں ہوں۔
لوگوں کو اس جگہ سے نفرت ہے۔ نام ہی سے کتراتے ہیں مگر آہ لوگوں کو پتہ
نہیں کہ یہاں کیا ہے۔ اگر انہیں پتہ ہو جائے تو باہر کی کرڑا ہا سرمایہ دارانہ زندگی
قیمت دے کر بھی اسے خریدیں اور تمنا نہیں کریں۔ مگر کھوکھلی تمناؤں، جھولی
آرزوؤں سے یہ نعمت نہیں ملتی یہ تو خاص اللہ جل شانہ کا انعام ہے۔ مجھے
تو اس زندگی کے اب قیمتی ہونے کا پتہ چلا ہے۔ دیکھتے میاں کب تک
رہتے ہیں۔ اب تک ان کی شان جمالی کی گود میں وقت گذرا کھٹا اور سمجھتے تھے
کہ بس گود ہی ہے۔ اب شان جلالی کی گود دیکھی تو اس کی پو قلموں لذتیں
اور رنگ برنگ کی حلاوتیں اور ہی نظر آئیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ اللہ جل شانہ
نے قرآن میں بدروالوں کو سمجھاتے ہوئے لیبی المؤمنین منہ بلاء حسنا
میں بلا کے ساکنہ حسن کی قید کیوں لگائی تھی۔ وہ محبت ہی کیا ہے
اور اس میں مزہ ہی کیا ہے جو جفا سے خالی اور شورشوں سے نا آشنا ہو۔
مزہ تو ٹرٹرنے میں ہے اور ٹرپ ٹرپ کرٹنے میں ہے۔ اللهم ارزقنی

شهادة فی سبیلک واجعل موتی بیدار رسولک فی

اب فکر یہاں کی نہیں وہاں کی ہے۔ اللہ سے دعا کرو کہ انجام بخیر ہو۔
 دل میں ایک آرزو ہے۔ اس کی پابجائی کی تدبیر سوچتا ہوں مگر ابھی تک سمجھ
 میں نہیں آئی۔ کوشش کر رہا ہوں اور پُر امید ہوں کہ انشاء اللہ گوہر مقصود
 ضرور ملے گا۔

اس وقت دماغ میں ایک خلجان ہو گیا کہ شیخ اکبر اور مولانا روم کا نظریہ یہ
 بتایا جاتا ہے کہ جو محسوس نہیں وہ معقول بھی نہیں۔ نظریہ تو خوب ہے
 مگر یاد پڑتا ہے کہ ملائچ اللہ بہاری صاحب مسلم الثبوت نے اسے براہمہ
 ہند کا فکریہ قرار دیا ہے۔ ملاجی کے بارے میں آزاد بلگرامی نے بحرے سمت
 از علوم و بدرے سمت بن النجوم لکھا ہے۔ عالمگیر کے زمانے میں لکھنؤ اور دکن
 کے منصب قضا پر رہے پھر معتوب ہو کر معزول ہو گئے۔ اس کے بعد
 سفارستوں سے پھر منظور نظر ہو کر شانزادہ عالم کے اتالیق مقرر ہوئے
 عالمگیر کی وفات کے بعد شاہ عالم کے زمانے میں سہارے ہندوستان کے
 محکمہ قضا کی صدارت ملی۔ عالم بڑے ہیں۔ بقول صاحب آثار الکرام آباؤ اجداد انہی
 کے رہنے والے ہیں۔ انہی کی زمین ہی بڑی مردم خیز ہے۔ درس نظامی میں ان کی دو
 کتابیں داخل ہیں اور دونوں عجیب ہیں۔ سلم العلوم اور مسلم الثبوت۔ سلم العلوم
 میں ایک جگہ شاید قضا یا کی بحث کے آغاز میں ایک اعتراض کا جواب دیا ہے اور
 دعویٰ کیا ہے کہ یہ جواب میرا خانہ ساز ہے مجھ سے پہلے یہ کسی کو نہ سوجھی جالانکہ
 ان سے پہلے تفتازانی نے مطوٰں میں بھی یہی جواب لکھا ہے اور ملاجی سے اچھا
 لکھا ہے۔ مولانا ابراہیم بلیادی نے حاشیہ پر بہت کچھ بدافعت کی ہے مگر بات
 چسکی نہیں ہے۔ اصل یہی ہے کہ شاید ملاجی چونک گئے عافاہ اللہ۔
 والسلام علیکم ورحمتہ اللہ

بنام مولانا محمد میاں صدیقی کاندھلوی فاضل جامعہ اشرفیہ مولوی فاضل علمی مرکز انارکلی لاہور۔

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۰ نومبر ۱۹۵۳ء

حسن پسندی اور حسن کاری، قرآن حسن کاری کا داعی بن کر آیا حسن
پسندی کے لئے قرآن و حدیث کا سہارا، حسن پسندی کا نسب نامہ
حسن کاری کی تشریح، آیت محکم سے اخذ کردہ نتائج، امت
میں استحسان کی مثالیں، صحابہ کو جو چیز سیاست میں گوارا نہ تھی
وہ ہمیں عبادت میں پسند ہے، اباحت کا نظریہ اور اس کا نسب نامہ۔

عزى المخلص السلام علیکم

اس وقت دن کا ایک بج رہا ہے چائے پی کر قلم دوات سامنے رکھی معاً
تم یاد آئے۔ اس یاد کی اس خط سے تلافی کر رہا ہوں۔ جی تو چاہتا ہے
گا ہے از ہجر دوستان کروں
گر یہ ہائے ہائے می خواہم

کسی نے سچ کہا ہے

راحت از روزگار نتوان یافت

خرمی ازین دیار نتوان یافت

مزه چاہتے ہو تو دیار پر زور دے کر پڑھو اور ستانی کا دل پہلو میں ہو تو
اسلام کا مرثیہ کہو

مسلمانان مسلمانان مسلمانان مسلمانان

ازین آئین بے دینان لیشمانی لیشمانی

کیا کہوں اور کیسے کہوں

کہ اس دور از دل دیوانہ ما

سواد نامہ خود افسانہ ما است

دل دیوانہ والی بات خوب چچی۔ واقعی ہم جیسے فرزانگی کہتے ہیں وہ اختیار کی زبان
 میں دیوانگی ہوتی چاہیے۔ اے کاش ہمارے عمل کی یہی قیمت ہو۔ شاید کہیں
 پڑھا ہے نہ معلوم اس کا روایتی مقام کیا ہے کہ

بن یمن احد کرحی یقال انہ جنون

اللہ اللہ کیسے ہوں گے وہ دیوانے جن کے نام کو اسلام کے نام پر بیٹے
 لگانے والے ہم فرزانے ہیں۔ شاید والدین نے غلطی سے علی نام رکھ دیا ورنہ

مردار کردار عالی گرداندہ نام!

ہر کسے را علی نام است نے چوں چیدا

بیابانی تو سب ہوتے ہیں مگر ہر آہوٹے مہرائی کا خون مشک اذ فرہیں ہوتا۔ ان
 کی دیوانگی پر ہزار فرزانگیاں قربان۔ جنہوں نے اسلام کو دنیا میں پیش کیا اور اس
 کی خاطر جانوں اور مالوں کی بازی لگادی۔ کینے عواقب سے بے خبر تھے اور کیسے
 نتائج سے بے پرواہ۔ گویا کہ رسم ناز چنناں باشد و نیاز چنیں۔ ایران والوں نے انکو
 دیکھ کر دیوانہ دیوانہ پکارا تھا۔ ان کو ان کی نیاز مندانہ سرشاریوں کی وجہ سے دیوانہ
 ہی پکارا جانا چاہیے۔ اللہ اللہ نہ ان کے یہاں سیاسی مصلحتیں عقین نہ اقتصادی
 منفعین۔ سب سے بڑی سیاسی مصلحت اللہ کے دین کا بول بالا اور سب سے
 بڑی اقتصادی سود مندی نفس کی لذتوں کو ختم کر کے رسالت کے چراغ کو روشن
 کرنا تھا۔ آہ آج تقدیر الٹ گئی۔ قضا بدل گئی۔ زمین دگر ہو گئی۔ زندگی کے سرگوشے
 میں حسن کاری کی جگہ حسن پسندی آگئی۔ قرآن حسن کاری کا داعی بن کر آیا ہے
 جسے قرآن و سنت کی زبان میں احسان کہتے ہیں۔ احسان کے معنی نیکی کر دن
 نہیں بلکہ نیکو کاری کر دن ہیں۔ زندگی کے ہر گوشے میں نیکو کاری اور حسن کاری
 کا مطالبہ تھا یعنی ہر عمل کا نہیں بلکہ ہر عمل میں حسن کار بننا ضروری قرار دیا

مقام شاہد طبرانی کی روایت ہے کہ یہ...
 ان اللہ کتب الاحسن علی کل شیء...
 بعد کو یار لوگوں نے مطالبے کی سختی سے تنگ آکر ترمیم کی اور حسن کاری کی جگہ
 حسن پسندی کو قرآن کی ساری آیتوں اور رسالت کے تمام ارشادات کو پس انداز
 کر کے اسلام کا مطالبہ بنا دیا، گویا اسلام کا مطالبہ احسان نہیں بلکہ استحسان
 ہو گیا اور داد دیتے اس ذہن کی جس نے اس کی تائید...
 ما رآہ المسلمون حسنا فهو عند اللہ حسن

سے پیدا کر ڈالی۔ اور اس بار یک پر تے کے پیچھے نبوت کے خلاف ہر شخص نے
 من مانی سازشیں کیں، جی بھر کر اسکیمیں بنائیں، وہ ساری کر لیں جسے نبوت
 کسٹم کرنا چاہتی تھی، نبوت ہی کے نام پر چالو ہو گئی، ایکسپان بل گیشن اور کوچہ
 بکوچہ، در بدر، محلہ بہ محلہ، قصبہ در قصبہ اور شہر در شہر اپنی پٹ پھیل گئے
 فان اللہ والی اللہ الملت کی ابتدا...

اجتماعی اور سیاسی زندگی سے نیکر انفرادی زندگی تک یا دار الحکومت سے لیکر
 مسجد اور خانقاہ تک کا یا پلٹ گئی، مسلمانوں میں سب سے پہلی تلوار اٹھی، کیوں؟
 پتہ نہیں کہ لوگ کیا سمجھتے ہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ بنیادی اختلاف ہی
 تھا کہ سیاسی اور اجتماعی زندگی میں کچھ لوگوں نے احسان سے ہٹ کر استحسان
 کی راہ اختیار کر لی، یعنی فکر و نظر کے یا نفس کا چورہ کھینچنے والوں نے یہ
 سوچا کہ نبوت نے سیاسی اور اجتماعی زندگی میں جو اصول و حسنہ چھوڑے
 اس کی پابجائی ضروری نہیں، یہ اسلام کے نام لینا اولیٰ میں سب سے پہلے
 شیطان کو قدم جمانے کا موقع ملا اور قرآن کی چیختی ہوئی متعدد آوازیں خالص
 سیاست کے میدان میں صد بصر ہو گئیں، نہ ان کنتم بحبوت اللہ فانتم...

پر نظر ہی نہ لگتا کہ لکھنے والے رسول اللہ ﷺ اس وقت حینتہ سامنے رہا اور نہ لیکھنے والے
 انکیم احسن عملاً پر غور کیا۔ سب سے بے نیاز ہو کر اور فلاں ربک کا یومینوت
 سے نظریں بچا کر فیصلہ کر لیا کہ سیاسی اور جماعتی زندگی میں اسلام حسن کاری کا نہیں بلکہ حسن
 پسندی کا خواہاں ہے۔ بلکہ بعد میں کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ حکومت کے باب
 میں مجھ سے حسن کاری کا جو مطالبہ کرے گا اضر ب عنقہ۔ میں اس کی گردن اڑا دوں گا
 اب ذرا آگے بڑھے اور سوچئے کہ اس بنیادی تبدیلی کا نتیجہ کیا نکلا۔ وہ یہی جو
 ایک کم ظرف کو پولیس کمشنر بنانے یا ایک نادان تنگ نظر کو وزیر اعظم بنا دینے کا
 ہوتا ہے۔ اہل اقتدار کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ اس شراب کو پی کر کوئی بھی نبوت
 سے الگ ہو کر قابو میں نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ حکومت کے شرائط انجام دینے
 کے لئے جس علم کی اور جس لیے لوٹی و بے نوصی اور بے نیازی کے ساتھ جنڈا
 کے ڈر اور محاسبہ کے دغوغے کی حاجت ہے وہ نبوت سے الگ ہو کر کہاں
 سے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کو چھوڑ کر سردور میں کوئی سیاست
 بھی خواہ وہ انفرادی زندگی میں کیسی ہی اچھی ہو انسانی زندگی میں صحیح توازن قائم
 نہ رکھ سکی۔

ظلم و عدوان، ناجائز نفع اندوزی، بے اعتدالی اور ناہمواری نے کسی نہ کسی
 صورت سے راہ پائی۔ انسانی زندگی فطری آزادی سے محروم ہو گئی۔ سارے
 مصائب، ساری تباہیوں اور امت کی ساری محرومیوں کی اصلی جڑ یہی ہے
 یہ وہ روگ ہے جس نے پورے اسلام کا نقشبہ بدل دیا ہے۔ اور جس بیماری
 کا آغاز دماغ سے ہوا کرتا وہ یوں درد کر سارے جسم اسلام میں پھیل گئی۔ اخلاق
 و روحانیت، علم و فنکارانہ تدان و معاشرت اور یاد الہی اور نیاز مندی کو تہدق
 کی طرح اندر اندر کھار ہی ہے۔ اس کا علاج اس کے سد اچھ نہیں ہے کہ پھر

سے نظر کو حسن پسندی اور استحسان سے بٹایا جائے اور قرآن کے مطالبے یعنی حسن
کاری اور احسان کو پورا کیا جائے۔

تاریخ میں آج تک ان دونوں کے نام موجود ہیں جن میں اس کے لئے
سسر توڑ اور جانگھل کوشش کی گئی تھی۔ صفین ہو یا حرہ۔ کربلا ہو یا بیابان مکہ
اور پھر علی بن ابی طالب اور دوسرے تابعین۔ اسی میدان کے پیرو ہیں۔ یہی
کے سوا کچھ نہیں چاہتے تھے کہ خالص سیاسی زندگی میں استحسان سے منہ موڑ
کر احسان کو اپنا یا جائے۔

سر داؤد نہ داد دست در دست نیرید
حقا کہ بنائے لالہ است حسینؑ

کہتے تھے اور صرف یہی کہتے تھے کہ سیاست میں نبوت نے جو اسوہ حسنہ
چھوڑا ہے اور جسے نبی کے ساتھ پہلوں نے نبھایا ہے اس میں ترمیم نہ ہو۔ یہی
احسان اور حسن کاری ہے۔ حافظ ابن کثیر نے شاید لیبسوکے مزاجیم احسن علیہ
الکے تحت فضیل بن عیاض کے حوالے سے ان گنت تابعین اور صحابہ کا یہ تاثر
نقل کیا ہے۔

لا یقبل العمل الا اذا كان خالصا و صوابا و الخالص ان
یکون لله تعالیٰ و الصواب ان یتكون علی سنة رسول الله
صلی الله علیہ وسلم (ادکما قال)

بنیاد بغدادی کی نثر و تصوف کے جو تصوف کی کتابوں میں یہ فقرہ لکھا
جاتا ہے کہ

الطریق کلها صواب و علی الخلق من اقتفی اثر رسول الله صلی الله
صلی الله علیہ وسلم

ادروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ زندگی کی کوئی شاخ بھی اثر رسوں سے
 الگ ہو کر خدا اللہ مقبول نہیں ہے اور کیوں ہو جب کہدیا گیا ہے کہ
 فَلَا وَرَبِّكَ كَأَيُّ مَنُونٍ حَتَّىٰ يُجِيبُواكَ الْخ

اس آیت میں ایمان کو کڑی شرطوں کے ساتھ مفید کیا ہے کہ۔

الف:۔ ما اشجر بینہم میں رسالت کا فیصلہ

ب:۔ فیصلہ موافق ہو یا مخالف۔ اس کے خلاف دل گرفتگی نہ ہونا۔

ج:۔ ساری زندگی کے سارے حالات میں اپنے آپ کو سراپا رسالت کو

سونپ دینا۔

دیکھئے ویسا ہوا کہ ساقیہ لتمیما کی قید کس قدر معنی خیز ہے۔ اس نے

بات میں کتنا زور پیدا کیا ہے۔ کیا۔۔۔ اس کا حاصل یہ نہیں ہے کہ قرآن احسان
 چاہتا ہے اور احسان یہ ہے کہ زندگی کے گوشوں کے لئے تڑو نہرتا۔ نے جو محسوس

اور مرئی نمونہ عمل چھوڑا ہے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا جائے جیسا پہلے کہہ
 چکا ہوں کہ مرض کی ابتداء داغ سے ہوتی اور اس کی بیماری یوں دوڑ کر

امت کے سارے جسم میں پھیل گئی۔ ہر مقام پر گوشے اور ہر جگہ پر حسن پسندی
 نے قبضہ کر لیا۔ مرض اتنا ظہر کہ ہو گیا کہ اب امام مسلم بن نوذر کنار خور علماء اور

خواص کے طبقے ہیں اس ذکر و نذر تیرے کہنے والے تو ہیں کہ عبادات اور شعاثر
 میں احسان ہونا چاہیے اور اس کے لئے وہ آئے دن نئے نئے رنگ میں

شور بھی مچاتے رہتے ہیں۔ لیکن ایسے رہا سب نذر مستور ہیں جو دریاؤں
 کی طرح سیاسی اور اجتماعی زندگی میں نظریہ احسان کے داعی ہوں۔۔۔ میں کیا

کہوں۔۔۔ یہاں تو معاملہ بالکل الٹا تھا ہے۔ سیاست، اجتماعیت اور سیاست
 تو بڑی چیزیں ہیں۔ اب تو آخری دور میں ایک خاص طبقہ ایسا بن چکا ہے

چو عبادات میں بھی نظریہ استحسان کا مدعی ہے اور اس کے لئے ایک علمی ترکش سے دلائل کے تیر بھی نکالتا رہتا ہے۔ شاید آپ نے ان لوگوں کے کردار و رفتار پر غور نہیں کیا۔ کردار میں ان کی نماز پر ایک چلتی نظر ڈال کر ان سے پوچھئے۔ کہ نماز میں نیت کے تلفظ سے لیکر وہ تمام کام جو نماز کے بعد ایام اور مقتدی مل کر کرتے ہیں یعنی سب کا باآواز بلند لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا۔ صلوٰۃ و سلام بلفظ خطاب یا بلا خطاب پڑھنا۔ امام اور مقتدی دونوں کا سنتوں کے بعد اجتماعاً دعائے مانگنا۔ وغیرہ وغیرہ کی اصل کیلئے یہ جواب میں آپ کے سامنے نظریہ احسان نہیں بلکہ استحسان آئے گا۔ کس منکب سے بات کو روو۔ مساجد سے ہٹ کر درامشاہد میں آجائے۔ یہاں بے لچاری کے احسان کا گز رہی نہیں ہے۔ قدم قدم پر استحسان برآجمن ہے۔ پیشانیاں سے رگڑی جا رہی ہیں۔ مرادیں مانگی جا رہی ہیں۔ تدریس چڑھ رہی ہیں۔ بنتیں پانی جا رہی ہیں۔ ایصالِ ثواب نے الٰہی زقند لگا کر عذاب کی صورت اختیار کر لی ہے۔ سب کچھ گئے ہیں۔ سب سے منہ موڑ لیا ہے۔ سب تو دوسروں کے چاہنے والے بن گئے ہیں۔ سرتاسر کام کا نقشہ بدل گیا۔ کہاں تک چھڑوں یہ سلسلہ لانتنا ہی ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنیہ کجا کی انہم
 یہ ساری خرابی احسان کی جگہ استحسان کے آنے سے ہوئی۔ اللہ اکبر!
 صحابہ کے زمانے میں صرف سیاسیات میں احسان کی جگہ استحسان آیا تو دنیاؤں
 سے تلواریں نکل آئیں خون کے معرکے قائم ہو گئے۔ آج زندگی کی ہر کل
 میں حسن پسندی سے کام لیا جا رہا ہے۔ اسلام کے ہر گوشے میں خرید
 اور حجاج کا روحانی تصرف غلبہ پا رہا ہے مگر کوئی حسین اور زید نہیں

ہے۔ بہر حال احسان اور استحسان کی نظریاتی کشمکش کا آغاز وہ تھا اور انجام یہ ہے۔ بات لمبی ہو جائے گی مگر کیا کروں کئے بغیر چارہ نہیں۔ جس دور میں احسان و استحسان کی کشمکش کا آغاز ہوا تھا۔ وہ دور صدی کہلاتا ہے۔ یعنی علوم سینوں میں تھے۔ ایک کروٹ کے بعد جب علوم سینوں سے صحیفوں میں منتقل ہوئے اور مباحث کی طرح اس موضوع پر بھی غور و فکر شروع ہوا تو علمی اصطلاحوں میں اسی موضوع نے حسن و قبح عقلی و شرعی کا اصطلاحی لبادہ پہنا۔ اور پٹے والی بات یونانی فلسفہ کی موٹنگانیوں میں دب کر رہ گئی۔ بغداد کے بازار میں چاہیے۔ آستینیں چڑھی ہوئی ہیں۔ گرما گرم بحث ہو رہی ہے کہ حسن و قبح شرعی ہے یا عقلی۔ اصول فقہ اور الہیات کا یہ بلند پایہ موضوع ہے۔ میں صرف زنجیر کا سرا بتانا چاہتا ہوں۔ مختلف کٹر یوں سے بحث کر کے و ماغ کو الجھن میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ لکھتا جاؤں۔ مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں قلم کی غلط کروٹ کا نشہ کا نہ ہو جاؤں۔ اچھا آج ختم کرتا ہوں پھر کبھی یاد آئے تو بات پوری کروں گا مگر اشارتاً اتنی بات اور کہے جاتا ہوں کہ تم نے فقہ اور اصول کی کتابوں میں اباحتِ اصلیہ کا مسئلہ لکھا دیکھا ہوگا اور پڑھا بھی ہوگا اور کہیں اصل حرمت کا فیصلہ بھی پڑھا ہوگا اور کسی جگہ لتاری نظر سے یہ عبارت بھی گزری ہوگی کہ الاصل التوقف۔

اس کا شجرہ نسب بھی اسی احسان اور استحسان سے ملتا ہے۔ یہ موضوع ذرا تفصیل طلب ہے غالباً مسلم الثبوت کی کسی شرح میں لکھا ہے کہ الاصل فی الاشیاء الاباحتہ یزید اور عبد الملک کا نہایت سے۔ بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ — والسلام علیکم وعلیٰ آئینہ

بسم مولانا منظور احمد صاحب خطیب جامع مسجد نارووال ضلع سیالکوٹ۔

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء

غداری کا الزام خود الزام تراشوں کی کھلی غداری کا آئینہ دار ہے، عبدالملک
بن مروان کا آزادی رائے کو کچیلنے کے لئے آرڈیننس، سیاسی
زندگی کے سارے گوشے آج مصلحت اور منفعت کے تقاضا
سے پورے ہوتے ہیں۔

عزیز من ! السلام علیکم

یہ خط ایک خیالی دنیا میں لکھ رہا ہوں۔ خیالی اس لئے کہ مجھے معلوم
ہے کہ میری بات تم تک نہیں پہنچے گی۔ میں آجکل زندوں کے گورستان میں
رہتا ہوں۔ مگر یہ لوگوں کا تاثر ہے۔ ہے تو یہ جیل مگر میرے لئے اللہ کی
رحمت۔ کیوں؟ یہ موضوع ذرا تفصیل طلب ہے۔ پھر سہی۔ جیل کا نام
سننے ہی تم شاید اس کشمکش میں ہو کہ یہ کیوں ہوا۔

عزیز من ! آج کی دنیا میں یہ بات پوچھنے کی نہیں۔ تم پہلے وکیل تھے
اب جج ہو۔ قانون دانی بات تم خوب جانتے ہو۔ کوئی حکومت قانونی نہیں
ہے۔ جب تک عدلیہ آزاد نہ ہو اور جب تک فرماں روائی ہنگامی قوانین اور
سیکورٹی کی فراہم کردہ اطلاعات کے بل بوتے پر چل رہی ہو۔ سبھی لوگ شخصی
انصاف کا جنازہ نکل گیا۔ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں کہ غداری
مملکت کا جو الزام مجھ پر لگانے والے لگاتے ہیں۔ کیا میں اپنی انفرادی
اجتماعی اور سیاسی زندگی کے دائرہ تک اس کا مرتکب ہو سکتا ہوں۔ بھلا جو
شخص یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ ایک پڑوسی کو ایذا دینا تقاضائے ایمان کے
خلاف ہے اس پر یہ الزام لگا دینا کہ وہ ایک ایسی مملکت کے خلاف ہے

جسے مسلمانوں نے اپنے خون سے سینچ کر اپنی ابرو کو بیچ کر اپنی دولت کو لٹا کر بنایا ہے۔ فی الواقع خود الزام تراشی کی کھلی غداری کا آئینہ دار ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اپنے عدل و انصاف اور اخلاق و کردار کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ فائدہ بناتے مگر کر رہے ہیں کہ اپنے کردار و گفتار کے تباہی سے خود غدار بنا رہے ہیں۔ فانالشد والی اللہ المشتکی۔

تم تو جج ہو۔ فریادیں کیا رائے عامہ کی بنائی ہوئی حکومت میں رائے عامہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے منتخب حکمرانوں کے سامنے اپنے دل اور منہ کی آواز کو پیش کریں۔ مگر ہمیشہ سے اقتدار کی اس کج ادائیگی نے کہ واقعات پر مبنی حکایت کو نہ کہ شکایت کو خود اقتدار کے خلاف چیلنج سمجھا۔ اچھے اچھے کام کے آدمی موت کے گھاٹ اتار دیئے۔ اسلامی تاریخ میں عبدالملک جسے انجصاص انجر الناس اور افسق الناس کہتے ہیں، نے رائے عامہ کی آزادی کو کچیلنے کے لئے آرڈیننس نافذ کیا تھا کہ

من قال لی بعدیومی هذا اتق الله اضرب عنقه

جو امینہ کی باقاعدہ مضبوط حکومت دراصل عبدالملک ہی سے شروع ہوئی ہے۔ گویا دراصل قبائے استبداد کا سب سے پہلے باقاعدہ زب تن کرنے والا دیوا استبداد ہی ہے مگر دنیا جانتی ہے کہ یہ رائے عامہ اور جمہوریت نہیں ہے۔

بہر حال کہنا یہ چاہتا ہوں، میری یہاں آمد تعجب خیز نہیں ہے۔ حکیم سنائی نے کیسی اچھی بات کہی ہے۔

منکہ چول سیرغ دریک گوشه سکن کردہ ام

مادرائے مرکز خاکی نشین کردہ ام!

کہنے والے تو غدار کہتے ہیں اور ان کو کہنا چاہیے۔ وہ اگر یہ نہ کہیں تو آپ ہی بتائیے

اور کیا کہیں کہ یا وہ نہیں جانتے اور جانتے ہیں کہ جانتے ہیں۔ کہ ہم غدار نہیں ہیں۔

جی نہیں وہ ضرور جانتے ہیں اور جانتے ہوئے انجان نہیں بلکہ دانا بشر بنے ہوئے ہیں

اور ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ جب بات نہ مانتی ہو اور عزت نفس میں آبادگی نہ ہو تو بات یوں ہی
 بنایا کرتے ہیں طاقت غداری کا الزام ہی تراشا کرتی ہے مگر لیونٹا لٹائے کے لفظوں میں
 کہوں گا کہ غداری کا الزام اس وقت تک سے جب تک ناکامی ہے اور جب آواز میں قوت
 اور رائے عامہ میں ابھار پیدا ہوا تو یہی غدار کہنے والے ان گوشہ نشینوں کو محب وطن اور
 مجاہد کہہ کر سکا میں سگے۔ کیا ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوا؟ کیا
 ہو گا اھدیٰ من الذین آمنوا سبیلاً
 میں اس طرف اشارہ نہیں ہے

بیروں تراو اور از دل شاں تلخی مزاج

میرے بھائی! یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ سیاسی زندگی کے سارے گوشے کوچ
 مصلحت، پالیسی اور منفعت کے اقتضاء سے انجام دیتے جا رہے ہیں اور جب تک
 نظام حکومت کی بنیاد اس سے ہٹ کر صرف خوفِ خدا، خوفِ حساب پر قائم نہ ہوگی
 اور جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی قیادت نے مواخذہ عدالت الہی کے دعوے کی
 سرشاریوں سے نہ ہوگی زندگی کی سرکل اسی طرح بگڑی ہے گی۔ سائنس کی تدوین
 چاہے کتنے خارجی اسباب تلاش کر لو مگر اصلی سبب خود ما با نفسہم ہے۔
 والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

بند خواجہ احسان الحق ایڈمنسٹریٹو سول جج گوجرانوالہ

رحمت میں رحمت، مصیبت میں نعمت کا تصور، تنہائی عتاب و عقاب نہیں بلکہ بیماری کی دوا ہے، خلوت اور جلوت کا تقابل، غلط رفاقت ہو تو خلوت سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے، خلاف مزاج صحبت سے قبض ہوتا ہے۔

السلام علیکم

جی فی اللہ حافظ صاحب!

کہنے کو تو جہاں میں ہوں لوگوں کی زبان میں زندگی کا گورستان ہے۔ اور ہے بھی لوگوں کے خیال کے مطابق کچھ سچ مگر میرا تاثر یہاں کے بارے میں ہمیشہ لوگوں کے خلاف رہا ہے۔ لوگ یہاں کے معاشرے میں جسے سب سے بڑی رحمت سمجھتے ہیں وہ ہی میرے نزدیک سب سے بڑی رحمت ہے۔ اور جوان کے خیال کے مطابق مصیبت ہے وہ میرے لئے نعمت ہے۔ لوگ یہاں سب سے زیادہ کوٹھری میں تنہائی سے گھبراتے ہیں۔ اندھیرے کی نگری اور مکین تنہا۔ بعض کے لئے یہی اختلاف قلب کا سامان بن گیا۔ مگر مجھے اس چیز سے پیار ہے۔ جوں جوں خلوت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ میرے دل کی کلیاں زیادہ سے زیادہ کھلتی ہیں۔ اور جس قدر جلوت کا سامان ہوتا ہے اسی قدر دل میں کلاہٹ کے آثار ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔

مرض آتش خوارہ کے لذت شناسد دانہ را

پچھلی دفعہ ایک بار جب مسٹر غلام سرور کا عتاب برق درعد بن کر یہاں کے خرمین امن کو تباہ کر رہا تھا تو — نزلہ بر عضو ضعیف افتاد — کے مطابق میں بھی معنوی نگاہوں کا شکار ہوا۔ عتاب کے نتیجے میں جو عتاب میرے لئے تجویز ہوا وہ تنہائی کی رہائش تھی لیکن اس پچارے کو کیا پتہ ہے کہ یہ میری بیماری کی دوا ہے اور یہ وہ ہی نسخہ شفا ہے جو

تلاش کے باوجود مجھے باہر نہیں ملتا تھا۔

وہ بند کر کے چلے گئے۔ میں باغ باغ تھا اور دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ ان کے باہر نکلتے ہی الحصن الحصین اور قرآن حکیم پر ایک نگاہ ڈالی اور دیوار پر کوئلے سے جو بیس گھنٹے کی مشغولیت کا پروگرام بنا لیا۔ پندرہ دن بڑے مزے سے گزرے لیکن آپ یہ نہ سمجھ جاتیے کہ میں جلوت کی افادیت کا منکر ہوں۔ حاشا حاشا نہیں اگر صالح اور عالم ہوں تو ہزار خلوتیں ان پر قربان۔ لیکن صرف وقت کو گزارنا میرا مسلک نہیں ہے۔ خلافت مزاج صحبت سے جتنا بچے قبض ہوتا ہے شاید ہی کسی کو ہو۔ خبر نہیں لوگ کیسے برداشت کر لیتے ہیں اور کیونکر وقت کو گزرنے کو گھٹن کے ساتھ گزارتے ہیں۔ یہاں کی فضاؤں میں آجکل ساری مادی اور جسمانی راحت کے سامان فراہم ہیں مگر جس رفاقت کا سد

قرۃ فال بنام من دیوانہ روزہ

ہے۔ اس سے حد درجہ تکلیف ہے۔ اخلاق سے فائدہ نہیں زبان سے لہا نہیں۔ شرافت سوز گفتار سے کان پھٹ جاتے ہیں اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مگر کلیجہ ہضم کے بیٹھے ہوئے ہوں اور اس پر بھی اللہ سے اجر کا متمنی ہوں۔ غیبت کی گرم بازاری میں تباہ بنا لا لقاہ، لہذا اور ہمز کے سارے اطوار، ہمتسخر اور استہزاء کی عریاں ہو رہی۔ نٹ نٹے رنگ میں دن بھر دیکھتا ہوں۔ رحم کی اللہ سے دعا بھی کرتا ہوں آپ بھی دعا فرمائیے۔

علیکم والسلام ورحمۃ اللہ

بہار حافظ محمد صادق صاحب گندم منڈی سیالکوٹ

وقت کی قدر و قیمت، انبساط وقت کے سبب سے زیادہ قدر دانی تھے
میدانِ حشر کا نظارہ، قبر کا بھیانک اور خوفناک منظر، یہاں منٹ
پل اور گھڑی بڑی قیمتی ہے، اس مختصر سی زندگی میں ایک لمبی زندگی
کے لئے سامان فراہم کرنا ہے، دورانِ دلہنی یہ ہے کہ ابد اور دوام کی زندگی
کیلئے لوزی تیار ہو، اس زندگی میں نگاہوں، کانوں کو مرصیاتِ الہی کا
خوگر بناؤ، اچھی زندگی کا مختصر سے مختصر لائحہ عمل، صدقہ کی قوت اور
اللہ کے یہاں اس کا مقام۔

عزیز سلمہ،

السلام علیکم

اس وقت ڈیڑھ بجا ہے۔ تم یاد آئے۔ اگرچہ اکثر یاد ہی آتے رہتے ہو اور خصوصاً
وعادوں میں۔ اس وقت چائے اور نماز سے فراغت ہوئی تو تم خود بخود بن بلائے
مہمان بن گئے جی چاہا کہ تم سے باتیں کر لوں اور دوسرے مشاغل کو ملتوی کر دوں۔
اس وقت پروگرام تو تلاوتِ قرآن کا ہے مگر کیا کروں تم سے بات نہ کروں تو
شکایت کرو گے۔ کہو وقت گزار رہے ہو یا گذر رہا ہے۔ وقت بڑی قیمتی چیز ہے
لوگوں کو اس کی قدر نہیں۔ بے قدری اس لئے ہے کہ ابھی اس کی قدر دانی کا مقام
آنکھوں سے اوجھل ہے۔ اس مقام کو آن تک انبیاء کے سوا آنکھوں سے کسی نے
نہیں دیکھا۔ انہوں نے دیکھا تو ان کی نیاز مندی کی رگ بھڑک اٹا لک فی النہار
سَبَّحًا طَوِيلًا اور رات فکر و نظر کے ساتھ آخر شماری میں گزار دی۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

سوچو کہ ایک صاف اور چھپیل میدان، باغات، محلات، حورو و غلمان، میوہ جاتا

دلچسپی کے سارے سامان اور مزے کے ایسے سارے اسباب مہیا کرتے ہیں کہ
 دل میں چین، نگاہوں میں سرور، شنوائی میں کیفیت اندوزیاں ہوں اور یہ سب کچھ تو مگر
 تنوع اور بولقلمونی کے ساتھ ہوتا ہے اور توازن کے ساتھ ہو۔ اللہ اکبر!

مشکلات کا اتنا انبار ہے کہ ہر مصیبت اور ہر تکلیف بھیا تک شکل سامنے
 لئے ہوئے کھڑی ہے۔ سانپوں، بچھوؤں اور تمام زہر چکاپ جانوروں کی بھیڑ سے
 گزر کر جانا ہے۔ ایسا ساز و سامان ساتھ لے جانا ہے کہ راستے کی تاریکی کے
 ساتھ کسی ایذا رسان چیز کو راستہ روکنے کی سمیت نہ ہو۔ اس کے آگے ایک
 تق و دوق میدان ہے۔ مخلوق کا اتنا ہجوم ہے کہ کھوے سے کھوا اچھلتا ہے گرمی
 کی اتنی تیزی ہے کہ ہر شخص اپنے پسینہ سے اس تندرثر الوری سے کہ عرق در عرق ہے
 اسی میں حساب ہو رہا ہے۔ چیکنگ اتنی سخت ہے کہ رات اور ماٹھ بھی نگاموں سے
 اوجھل نہیں ہے۔ الفاظ نہیں معانی تو لے جا رہے ہیں۔ کردار بلکہ گفتار بھی تل
 رہی ہے۔ بطور میں اس قدر وحشت ناک ہیں کہ ہر شخص دیکھتے ہی لرزہ بر اندام ہو
 جاتا ہے۔ کوئی بناوٹی حساب یہاں کام نہیں دیتا اچھوں اچھوں کے چھکے چھوٹ
 رہے ہیں۔

اس منزل سے پایاب ہونے کے بعد وہ میدان سامنے ہے جس میں ہمیں
 یہاں رہ کر سامان کے لئے میٹریل تیار کرنا ہے کہ
 مالا عین سرات وک اذت سمعت وک اخطر علی قلب بشر۔

اتنے بڑے اور اہم کام کیلئے وقت صرف زیادہ سے زیادہ ساٹھ سال کے
 لگ بھگ ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ وقت کھوڑا ہے یا زیادہ، اسے گذرنا چاہیے یا گذرنا چاہیے
 اس کا منٹ، اس کی بل، اس کی گھڑی بڑی قیمتی ہے۔ پرزہ منٹ کے بعد
 یَا لَیْتَنَا خُرَدًا اور فَا رَجَعْنَا کِی صَدَائِمِ ہلند کریں گے۔ شرم سے گردنیں جھکیں

ہوں گی اذالمجرمون فاحسوا و اسہم انکھیں زمین میں گڑھی ہوں گی خشعا
 انصار صد چہرے کانک دانے اور ذلیل ہوں گے ترہقہم قترۃ اور ترہقہم
 ذلۃ۔ نہ بھائی ہوگا نہ بہن۔ نہ باپ ہوگا نہ ماں۔ نہ بیوی ہوگی نہ بچے یوم لفرالہ من
 اخیہ وامہ و ابیہ و صکھبتہ و بنیہ۔ نہ بٹہ ہوئے مکان نہ سچی ہوئی دکان
 ہوگی ہر شخص اپنی حالت میں مگن ہوگا لکل امرہ منہم یومئذ شات یغنیہ۔
 سیکر پیارے ایہ وقت غفلت سے گزار دینے کا نہیں۔ دور اندیش ہو۔
 دور اندیشی یہ نہیں ہے کہ اتنا کماؤ کہ تمہارے بعد تمہاری اولاد بھی مزے کرے
 بلکہ دور اندیشی یہ ہے کہ اس فقور سے سعادت میں اتنی محنت کرو کہ آئندہ ابداء
 دوام کی زندگی میں سکھ اور چین نصیب ہوگا کہ وہ تیرا زندگی اصل زندگی ہے
 اللهم لا عیش الا عیش الاخرۃ۔ قبر کی مشکلات حل ہوں۔ میدانِ حشر کی رہو اپنی
 سے بچاؤ ہو۔ اور بالآخر عیشۃ الراضیۃ لیس ہو۔ چہرے پر چمک دک ہو ہشاشی
 ہشاشی ہو تر و تازگی ہو۔

میرے عزیز! یہاں نگاہوں کو اللہ جل شانہ کے احکام کا پابند بناؤ تاکہ
 یہ نگاہیں اس زندگی میں دیدارِ الہی کی لذت یا بیوں سے ہمدریش ہو سکیں۔ یہاں
 کالوں کو مرضیاتِ الہی کے لئے وقف کرو تاکہ اس زندگی میں کلامِ الہی کے سننے
 کی کیفیت اور لطافت سے بہرہ یابی ہو۔ قدم قدم پر احتیاط سے چلو۔ نہت بات
 سوچ کر اور توں کر نکالو اور یقین کرو کہ منہ سے نکلا ہوا ایک بول یہاں رائیگاں
 نہیں۔ اس کی پشت پر تاراج کا ایک پہاڑ ہے۔

نہی کو اچھی بناؤ۔۔۔ حلال۔ ذری کرانے کے ساتھ ساتھ محرمات سے
 بچتے ہوئے اور فرائض کی پابندی کرتے ہوئے کچھ فقور اس وقت چوبیس گھنٹوں
 میں نفس کے محاسبہ کے لئے نکالو۔ حلال کی قیدوں سے نکالی ہے کہ اس

سے ہنٹ کر ساری عبادت اور نیاز مندی بیکار ہے۔ مال سے محبت بہت ہی کم کرو
 زیادہ سے زیادہ خدا کی راہ میں صدقہ کرو۔ پیارے! صدقہ میں اللہ جل شانہ
 نے وہ قوت رکھی ہے کہ اس سے گناہ دُھل جاتے ہیں اور غضبِ رب ٹھنڈا
 ہوتا ہے۔ اس لئے صدقہ بظاہر ذریعہ ہے۔ تم تاجر ہو تاجروں کے نام تو رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس صدقے کے بارے میں خاص پیغام ہے۔ فضائل
 صدقات اردو میں لکھے ہوئے ہیں ان کو پڑھو۔ اچھا جواب رخصت ہوتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۲ دسمبر ۱۹۵۳ء

کچھ اپنا حال، روزانہ کالائٹھ عمل، جیل کی زندگی کے چوبیس گھنٹے، دن بھر کے

مشاغل اور روزمرہ کا پروگرام

السَّلَامُ عَلَيْكَ

جی فی اللہ و فقنا اللہ و ایاکم

جی چاہا کہ کچھ اپنی حالت لکھوں۔ نہ معلوم میرے تاثرات قلب زبانِ قلم سے نکلنے کے

بعد آپ تک پہنچتے ہیں یا کہ نہیں۔ اس خیال سے کہ دل بڑا بدل رہا ہے اسمت لکھ رہا ہوں۔

کچھ ہجوم و ساکس اس قدر ہے کہ بے چین ہوں اور بے قرار ہوں۔ ارادۂ سکون چاہتا ہوں مگر بلا ارادہ بیقرار ہو جاتا ہوں۔ وساوس لاتا نہیں ہوں آجاتے ہیں۔ اگرچہ دن رات مشغول رہتا ہوں مگر ان مشغولیتوں کے باوجود دل کی دنیا خطرات کی آماجگاہ بنی رہتی ہے۔ یہ روگ ایسا لگا ہوا ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سے بے نیازی اور بے پردائی ہو۔ الحمد للہ! قلب دن کے اکثر ادوات اللہ جل شانہ کی طرف رکھتا ہوں۔ یعنی تکلف سے گزر رہا ہوں۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ جی چاہتا ہے کہ اللہ کی بس ہمہ وقت یاد ہے اور مجھے تکلف کی بھی تکلیف نہ ہو۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ بے تکلفی کی اس طلب میں کچھ میرا نفس مجھے دھوکا دے رہا ہے تکلف میں مشقت سے گزرنا ہوتا ہے اور نفس مشقت کا چور ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے رات کے درمیان اٹھتا ہوں اٹھتے ہوئے دعائے مسنون اللہم ربنا اللہم انت قیوم السموات

سورہ آل عمران کا آخری رکوع اور مغزرات سبعہ پڑھتا ہوں استنجاء چائے اور وضو سے فراغت کے بعد تہجد میں لگ جاتا ہوں تین پارے آٹھ رکعت میں کرتا ہوں آٹھ رکعت کے بعد تین در بقرات مسنونہ پڑھتا ہوں۔ دتروں کے بعد طویل دعا مانگتا ہوں دعا سے فراغت کے بعد سلطان الاذکار میں لگ جاتا ہوں جس قدر ہو جائے

میرے نصیب۔ پھر ایک سو بار کلمہ سوم۔ ایک سو بار استغفار۔ اور ایک سو بار درود کے بعد صبح و شام کے مسنون اذکار یعنی بسم اللہ الذی لا یشرف الخ تین بار۔ اعوذ بکلمات اللہ تین بار۔ اعوذ باللہ السميع الخ تین بار۔ سورہ حشر کی آخری آیات۔ سورہ روم کی آیات سبحان اللہ۔ اخلاص اور معوذتین تین بار اور اصبحنا واصبح الملك الخ ایک بار رضیت باللہ الخ تین بار۔ اللهم عافنی فی بدنی الخ تین بار۔ اللهم انی اعوز بک من العقاقیر تین بار۔ سید الاستغفار ایک بار۔ حسبی اللہ لا اله الا هو الخ سات بار۔

سنت فجر کے بعد ذرا دائیں کر وٹ لیٹنا ہوں اور پھر نماز رکعتی میں باجماعت پڑھتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ طویل تر تکے ساتھ منہ اندھیرے پڑھوں مگر کھینوں کا ساتھ ہے اس لئے مجبور ہوں۔ نماز کے بعد کلمہ چہارم سو بار۔ طلوع آفتاب پر دو رکعت نماز اشراق نماز کے بعد غسل اور کھانا۔ کھانے سے فراغت کے بعد کچھ دیر سلطان بالاذکار پھر کچھ مطالعہ۔ دس بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک قیلوبہ۔ ساڑھے گیارہ بجے کے بعد استنجا وغیرہ سے فارغ ہو کر چائے کا دور اور پھر نماز ظہر سلطان الاذکار۔ نماز ظہر ایک بجے کے بعد پڑھتا ہوں۔ نماز کے بعد کچھ لکھنا پڑھنا۔ دھائی بجے قرآن حکیم کی تلاوت اور اذکار عصر تو نے چار بجے پڑھتا ہوں بعد نماز عصر کھانے سے فارغ ہو کر سو بار درود سو بار استغفار، سو بار کلمہ سوم۔ اور صبح وائے مسنون اذکار۔ بعد از نماز مغرب وواہین چھ رکعت میں نصف پارہ پڑھتا ہوں۔ اداہین سے فراغت ہوئی تو ایک سزار اسم ذات کا معمول ہے۔ اسم ذات اب تک ایک لاکھ سے متجاوز ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ عشاء تک اخبار کا مطالعہ ہے۔ اخبار سول اینڈ میٹری گزٹ ملتا ہے۔ اگرچہ میں انگریزی میں کچھ ادبی صلاحیت نہیں رکھتا مگر شدہ بدھ اتنی ضرور ہے کہ کچھ الفاظ کچھ محفوظ رکھتا اور کچھ دلالتہ الحال کی مدد سے بات کی تہ تک پہنچ جاتا ہوں۔ مقالہ افتتاحیہ ضرور پڑھتا ہوں۔ بیچارہ ایڈیٹر اپنی جدت طرازی کی وجہ سے گھونٹ گھونٹ پر علماء

کے منہ آتا ہے خیر یہ ہارن ہے مائیکروفون تو کسی اور کے قبضہ میں ہے۔
 نماز عشاء کے بعد مسنون اذکار اور سورہ ملک، سورہ بقرہ اور سورہ دخان کی تلاوت
 کے بعد سو جانا ہوں۔ یہ ہے میرا وزمرہ کا معمول اور میرے سارے مشاغل کا پروگرام۔
 مجھے علم نہیں کہ اس میں کہاں کہاں غلطی ہے اور کیوں کر ہے۔ افسوس کہ کام کے
 لئے وقت ملا تو راپہر نہیں۔ اللہ جل شانہ میرے حال زار پر رحم فرمائیں اور دعاؤں
 کے ساتھ اس کمی کے متعلق بھی اللہ جل شانہ سے دعا کرتا ہوں۔
 حضرت! میں لکھ نہیں سکتا کہ گناہوں کی آلودگیوں کے کتنے داغ ہیں۔ جو
 میرے دامن پر لگے ہیں۔ اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ معاف فرمائے۔ شاید گناہوں کی
 ہی ظلمت ہے جو اب تک استقامت کی دولت سے محروم ہوں۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ

پسلم مولانا محمد بشیر صاحب مدیقی محلہ کچی مسجد سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۷ دسمبر ۱۹۵۳ء

جیل کی زندگی کا خاکہ، سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۳۳ دعویٰ بلا دلیل کا نام ہے، اسلامی
مملکت کا سیاسی مذاق، ۱۹۵۳ء کا نہیں ڈرامہ، میں بالوکس نہیں ہوں، اللہ
کی شانِ قدیری اور اس کی شانِ حکیمی کی توضیح اور ان میں باہمی فرق، ما
بقوم اور ماہا نفسہم کی تشریح، علماء کی فتح اسلام کی آمد کا
مقدمہ اور مغرب کی شکست ہے، اسلامی قومیت کا فیصلہ وقت کا

اہم تقاضا ہے۔

علیکم
السلام

عزیم سلمہ!

اس وقت دن کے بارہ بجے ہیں۔ چائے سے فارغ ہوا ہوں۔ شاید تم پوچھو
کہ یہ چائے کا کون سا وقت ہے۔ بات یہ ہے کہ لباس اور خوراک میں ایک حد تک آزاد
ہوں۔ میرا فیشن یہ ہے کہ بیدار ہونے کے بعد چائے پلنی چاہیے۔ یہاں کے پروگرام کے
مطابق قبیلہ دس سے ساڑھے گیارہ بجے تک ہے۔ اس لئے چائے کا
وقت بھی بارہ بجے مقرر ہوا۔ رات کو ایک اور دو کے درمیان پیتا ہوں۔ سو کے
اٹھتا ہوں تو جب تک پیالی منہ کو نہیں لگتی کچھ کھویا سارہتا ہوں۔ میں نے لب کی
جگہ منہ اس لئے کہا ہے کہ چائے میں لب سوزی اور لب دوزی میرے نزدیک مکروہ
ہے۔ چائے نوشی کے وقت لبوں سے پیدائندہ آواز میرے مذاق کیلئے بہت ہی
گراں اور میری طبیعت کے لئے سامانِ قبض ہے کیونکہ یہ چائے کے لب سوزان
لب دوز ہونے کی علامت ہے۔

اسنو! میں مؤرخہ ۸ اگست کو دوبارہ پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند

دیا گیا ہوں۔ تم پوچھو گے کہ کیوں؟ اس کا مجھے پتہ نہیں۔ شاید گرفتار کنندگان کو

اس کا پتہ نہ ہو اور پتہ نہ ہونے کی وجہ صاف ہے۔ جب پولیس کی چیرہ دستیاں آخری حد کو پہنچ جاتی ہیں تو وہ اپنے ترکش کے شکار کے لئے وہ تیرا استعمال کرتی ہے جسے سیفی ایکٹ کی دفعہ ۳۱ کہا جاتا ہے۔ دعویٰ تو ہے مگر دلیل نہیں ہے۔ دلیل ہوتی تو کھلی عدالت میں پیش ہوتی۔ ہم بھی ذرا تو سنتے اور مخاطب سے آنکھیں چار کرتے۔ مگر عدالت میں بیچارے معاملہ لے جائیں تو کس برتے پر؟ کیا کہیں؟ یہ شخص محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا ٹی رٹوس الا شہاد اعلان کرتا ہے یا یہ کہ مرزا علیہ ما علیہ کی جھوٹی اور خانہ ساز نبوت کی دھجیاں لوگوں کے سامنے اڑاتا ہے۔

بتائیے ان دونوں باتوں میں سے کون سی بات علیحدتِ خدا داد سے غداری کے مترادف ہے۔ ان کی روسیاسی کی یہ سب سے بڑی شہادت ہے کہ آج ایک مسلمان کھلے بندوں پبلک اسٹیج پر ایمان کی دعوت نہیں دے سکتا۔ خوش ہیں کہ ہم نے دیا دیا۔ اور ابیس بعلیں بجا رہا ہے کہ جو کام وہ انگریز سے نہ کر اسکا وہ محمد کے نام لیواؤں سے پورا ہو گیا۔

قاعدہ تو یہی ہے کہ جمہوری مملکت میں جب ایک بات رائے عامہ کے منہ سے نکلے تو اس کے نمائندے اس پر غور کریں اور اطمینان کے لئے استصواب کرالیں۔ مگر اس مملکت کا سیاسی مذاق ہی کچھ نرالا ہے۔ جہاں اور جب رائے عامہ کا رجحان کسی ایک جانب دیکھا تو فوراً غدار غدار پکارنا شروع کر دیا۔ گالیوں سے کام نہ چلا تو بے محابا لالٹیاں آگئیں۔ لالٹھیوں سے بات نہ بنی تو اپنیوں کے سینوں کو اپنیوں نے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ جب میں سوچتا ہوں کہ آہ رسالتِ محمدیہ کے نام پر دو ٹوں کی بھیک مانگنے والوں نے محمد کے نام لیواؤں پر گولیاں چلائیں۔ ولینوں کا سہاگ لٹ گیا۔ بچے یتیم ہو گئے۔ تو میں کہہ نہیں سکتا کہ میرے قلب و جگر کا کیا حال ہوتا ہے۔

اللہ اکبر! زلزلے کے انقلابات کس کس رنگ میں سامنے آتے ہیں۔ میں
 بائوس نہیں ہوں۔ اللہ جل شانہ کو اس بات پر پوری قدرت ہے کہ دلوں کی کاپیا پلٹ لے اور
 الشانہ اللہ پلٹ ہی کر رہے گی۔ مگر مجھے میرا تاریخی، سیاسی اور اجتماعی مطالعہ اس وقت
 اس کے یاد کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا اور اب بھی نہیں دیتا۔ اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو
 جائے اور خدا کرے کہ ہو تو یہ اس کی شانِ قدیری کا ظہور ہوگا ورنہ شانِ حکیمی یہ نہیں
 ہے۔ شانِ حکیمی تو یہ ہے۔

ان الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بانفسهم

ما بقوم نظام نماں روائی ہے اور ما بانفسہم کردار و گفتار ہے۔ فرمائیے کہ جو میزان
 اب تک رتوں کے غلط ہونے کی وجہ سے غلط تھی اب وہ خود بخود کیسے درست ہو جائیگی
 اور شانِ قدیری یہ ہے کہ رتیں پوری نہ ہوں مگر میزان صحیح آجائے۔ ایسا بھی ہوتا ہے
 بد میں ایسا ہی ہوا تھا۔ رقم فی الواقع پوری نہ تھی۔ باہر سے وقتی طور پر مزید رقم کا اضافہ کر کے
 میزان پوری کر دکھائی تھی۔

لقد نصركم الله ببدونكم اذلة

جو کام عاۃ اللہ کے ماتحت ہو میری اصطلاح میں وہ شانِ حکیمی ہے اور جو
 اسباب و علل سے بالا ہو کر رونما ہو وہ شانِ قدیری ہے۔ عام عادت تو
 شانِ حکیمی کی ہے۔ شانِ قدیری کا ظہور تو صرف اس وقت ہوتا ہے جب دامانِ
 اعمال رضائے الہی کی خاطر چاک درچاک ہو۔ خیر یہ تو ماضی ہے۔ اب حال میں بعض
 تاثرات کی شعوری اور غیر شعوری طور پر اوپر سے نیچے تک پورکس ہو رہی ہے
 وہ بہت ہی عجیب ہیں اور ان کے نتائج ان سے بھی عجیب تر۔ معلوم ہے کہ کیا طور پر
 ہے؟ وہ ہی جو کل تک اسلام خطرے میں سے کا بگل بجائے تھے۔ پاکستان
 پوری قوت کے ساتھ اسلام کو ختم کرنے کی فکریں لگے ہوئے ہیں اور بالارادہ ان

جراثیم کی لیشٹ پناہی کر رہے ہیں جو اسلام ہی کی بیخ کنی کیلئے منصوبہ وجود پر آئے۔
 تحریک ختم نبوت کی ناکامی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ وزارت
 خارجہ کی گدی پر کون برا جمان ہوتا ہے یا مرزائی کی ملک میں پوزیشن کیا ہے؛ سوال یہ ہے
 کہ علماء کے منہ سے نکلی ہوئی بات مان لی گئی تو علماء کی فتح ہے اور ان کی فتح اسلام کی
 آمد کا مقدمہ ہے اور یہ مغربی تہذیب کی شکست ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان پر اس
 تحریک کے سلسلے میں ناپاک الزام لگائے گئے ہیں۔ حالانکہ سب جانتے ہیں
 کہ مرزائیت کے خلاف علماء کا موقف آج کا نہیں بلکہ پاکستان بننے سے پہلے
 کا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ مرزائیت انگریز کی سیاسی مصلحتوں کا خود کاشتہ پودا
 ہے۔

یقین کرو کوئی بات طے نہیں ہو سکتی جب تک خالص دستوری زبان میں
 اسلامی قومیت کا فیصلہ نہ ہوگا۔ اسی فیصلہ ہی پر مرزائیت کی نقاب کشائی ہوگی۔ خود
 ارباب بست و کشاد کو اپنی موجودہ پالیسی پر از سر نو غور کرنا ہوگا اور بس — اچھا
 ختم کرتا ہوں

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

بشہر مولانا حامد الرحمن صاحب کاندھلوی زراعتی کالج ٹنڈو جام ضلع حیدرآباد

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۹۵۳ء

وسادوس کا آنا مذموم نہیں لانا مذموم ہے، وسادوس دور کرنے کی پانچ
تدبیریں، اصلاح نفس کے دو طریقے، توبہ اور طریق ولایت
اور دونوں میں فرق، ایک مثال کے ذریعے اس کی تشریح، جو اس اور
مشاہد کی طرح لطائف بھی پانچ ہیں، صوفیاء کی زبان میں ان کی پیداواری
کا نام نسبت ہے۔

عزیری ! وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ دیرناہ السلام علیکم

تم، ہجوم وسادوس کے شاکی ہو۔ ان کا آنا مذموم نہیں لانا مذموم ہے۔ اگر آنے
پر ہی پریشان ہو اور ان کو دور کرنے کی فکر میں ہو تو ان کو دور کرنے کی چند تدبیریں
جو اس وقت ذہن میں ہیں لکھتا ہوں۔ کسی ایک پر عمل کر لو اور پھر بتاؤ۔
اول: آیات سکینہ کی تلاوت کر لیا کرو۔ قرآن میں آیات سکینہ چھ ہیں۔
دوم: کوشش کرو کہ دل کسی لمحہ بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو اور غافل نہ
رکھنے کی تدبیر یہ ہے کہ زبان ہر دم کسی نہ کسی ذکر میں مشغول رہے۔
لا یزال لسانک وطمأن ذکرا اللہ

سوم: نماز فجر کے فرضوں اور سنتوں کے درمیان چالیس بار یا حتیٰ یا قیوم
لا الہ الا انت برحمتک استخیت پڑھ لیا کرو۔

چہارم: تنہائی کا تھوڑا سا وقت نکال کر سبحان اللہ صرف ایک سو بار اس
طرح کہ سبحان کی یاد سے دل پر ضرب لگاؤ اور حاء کا
اظہار ذرا دراز ہو۔ سانس جلالہ کی ہائے ہوز پر ختم ہو۔
پنجم: اگر وقت ملے تو صبح کی اذان سے پہلے خلوت میں بیٹھ کر دل کی طرف

متوجہ ہو اور کوزہ ذہن میں ایک زشتہ ٹور دل میں یقین بھرو پھر ستر بار یاہادی
کہو۔ امید ہے ان تدبیروں میں سے جو بھی کرو گے انشاء اللہ کامیابی
ہوگی۔

مگر عزیز من! ایک بات سنو۔ وساوس ہوں یا ہوا جس، خواطر ہوں یا خواہش
ان کو ختم کرنا درجہ مقصودیت میں داخل نہیں ہے۔ مقصود تو صرف اللہ کی یاد ہے
یہ دیکھو وہ ہوں ہی ہے کہ نہیں۔

اصلاح نفس کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریق نبوت، دوم طریق
تصوف۔ طریق تصوف میں میلانات، تقاضوں اور خواہشوں کا ازالہ کیا جاتا ہے
مگر طریق نبوت میں ازالہ نہیں بلکہ امالہ ہوتا ہے۔ یعنی طریق نبوت میں نفس کے
تقاضوں کا رخ بدلا جاتا ہے اور طریق تصوف میں انہی تقاضوں کی بیخ کنی کی جاتی
ہے۔ اسے ذرا ایک مثال سے سمجھو۔

نالہ ایک آبادی کے ساتھ ہے اور سر روز بربادی کا سامان بنا رہتا ہے۔ اس
کی بربادی کو روکنے کی ایک تدبیر تو یہ ہے کہ مکان مضبوط کر لئے جائیں۔ سینٹ
کے پلاستر ہو جائیں۔ اور مکانوں کی کرسیاں اونچی کر دی جائیں۔ نالے کو اپنی جگہ
چلنے دیا جائے۔ اور ایک تدبیر یہ ہے کہ جہاں سے نالہ نکلا ہے اسے جا کر
ٹوڑ دیا جائے اور تباہ کر دیا جائے۔

نفس میں غضبی اور شہوی قوتیں ہیں۔ یہ دو قوتیں ہی اخلاق اور صفات بناتی
ہیں۔ یہ ہر جاندار میں ہوتی ہیں۔ قوت شہوی منافع اور مصارج کی تلاش میں رہتی
ہے اور قوت غضبی مضار اور مفاسد کا ڈیفنس کرتی ہے۔ بائیں تلاش میں قوت
شہوی لگتی ہے۔ تو حرص کا میدان نمایاں ہوتا ہے اور دفع مفاسد کے لئے قوت
غضب میدان میں آتی ہے تو قوت اور عزت ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کی ناکامی

سے حقداور قوت شہوت کی ناکامی سے حسد ظاہر ہوتا ہے۔ قوت شہوی میں
جوش ہوتا ہے تو نخل اور غصبی کے جوش میں عدوان یعنی ظلم و کبر اور فخر کا ظہور
ہوتا ہے۔

نالے سے میرا مقصود یہی دو قوتیں ہیں جو قلب کی آبادی کی طرف سیلابی
صورت میں آکر لوری آبادی کو تباہ کرتا ہے۔ صوفیا آٹے اور آبادی کی بربادی کا یہ
تماشا دیکھا تو لول بڑے کہ ان دو قوتوں کو جڑ سے ختم کر دینا چاہیے۔ اس کیلئے
انہوں نے ریاضات شاقہ اور تعذیب جسم کی صورتیں پیدا کیں۔ لیکن حکیم مطلق کی تخلیق
حکمت سے مقابلہ تھا۔ ناکامی ہوئی اور ناکامی ہو رہی ہے۔ انبیاء آئے اور انہوں
لے لوگوں کو بتلایا کہ مکانوں کی بنیادیں مضبوط کی جائیں۔ پلاستر کے جائیں اور کرسی
اوپنی رکھی جائے۔ نالے کو بہنے دیا جائے کسی نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ آفات
نفس اور وساوس راہ سلوک کے مسافر کیلئے راستے کے بچھو اور سانپ ہیں۔
جو راستہ میں ان کو مارنے میں لگ جائے گا وہ سفر سے رہ جائے گا۔ کام چلتے رہتا
ہے۔ ان کی طرف آنکھ پھیر کر دیکھنا بھی نہیں چاہیے۔ شاید عارف رومی نے اسی
نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اندریں راہ مے تراش و مے خراش

تاو مے آخر مے فارغ مباحش

نفس اور اس کی قوتیں بیکار نہیں ہیں۔ یہی نالے کا پانی ہے۔ اس سے
جہاں جھاڑ کا نٹے پیدا ہوتے ہیں وہیں بہترین کھانے کی خوش ذائقہ مینریاں
بھی نشوونما پاتی ہیں۔ اس کا رخ بدل دیکھئے۔ استیصال نہ کیجئے۔ اگر کر چلنا
معیوب ہے اور شریعت نے منع کیا ہے مگر میدان جنگ میں اللہ جل شانہ
کو ابودجانہ کی یہی رفتار پسند آئی۔ کیونکہ رخ بدل گیا۔ اب ختم کرتا ہوں۔

مگر شاردۃ ایک بات اور کہے دیتا ہوں۔ جس طرح حواسِ خمسہ ہیں ایسے ہی
مشاور بھی خمسہ ہیں۔ یہ تو ہیں اطباء اور حکماء کے زیر بحث۔ ان کے ساتھ لطائف
بھی خمسہ ہیں۔ یہ ہیں اصلاحِ نفس میں عارفانہ کا موضوع۔

حواسِ خمسہ یہ ہیں :- باہرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ

مشاور خمسہ یہ ہیں :- حس مشترک، متصرفہ، تخیل، وہم، حفظ

لطائف خمسہ یہ ہیں :- عقل، قلب، روح، سر، نفس

لطائف کی بیداری کا نام ہے نسبت۔ یہی مقصودِ تصوف ہے اور یہی

منزل احسان ہے۔

وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ

بنام مولوی محمد اسحاق شہابی پتھر گورنمنٹ نارمل اسکول سپرور ضلع سیالکوٹ

ڈیٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۹۵۳ء

انسان ایک عالم صغیر ہے، روح کی تکوین، روح سے اخلاق کا تعلق نفس
قلب اور عقل کی تشریح، سزا اور روح کی حقیقت، انسان کا امتیازی
مقام ان لطائف خمسہ سے وابستہ ہے جو اس اور مشاعر کی طرح
لطائف پنجگانہ بھی اگر کام نہ کریں تو انسان حیوانیت سے بھی گرجاتا

السلام علیکم

بھی فی اللہ! آج آپ کو خطر لگھ رہا ہوں۔ تقریب یہ ہے کہ تفہیمات دیکھتے دیکھتے ذہن
آپ کی طرف منتقل ہو گیا۔

انسان صرف ہاتھ، پاؤں، ٹانگ، آنکھ اور منہ کے مجموعہ کا نام نہیں ہے
بلکہ اس کے طبقات ہیں اور یہ عالم صغیر اپنے ہر طبقہ کے لئے ایک مستقل وجود
اور مستقل مدت رکھتا ہے۔ ظاہری طبقہ تو اس کا یہی قالب ہے۔ کھانے
پینے کے تقاضے اس میں موجود ہیں۔ ہاضمہ اور غذائی قوتیں بھی ہیں۔ کیلوسس
اور کمیوس بھی اسی میں ہیں۔ غذائیں حصوں میں تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ منی، خون،
روح — منی مجامعت کے ذریعہ رحم عورت میں منتقل ہو کر خون کی آئیرش سے
بدن انسان بناتی ہے۔ یہ ہے ظاہری طبقہ — اور اسے عالم صغیر کا طبقہ سافلہ
بھی کہتے ہیں۔ یہی فن طب و تشریح کا موضوع ہے۔ اس کے بعد ایک دوسرا
طبقہ ہے جسے طبقہ روح کہتے ہیں۔ اس کی تکوین اس طرح ہوتی ہے
کہ اخلاط سے پیدا شدہ بخارات لطیف دل کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں حرارت
دل کی آئیرش سے ایک پاک و صاف معتدل جوہر بنتا ہے۔ یہی روح ہے

جو نفس ناطقہ کی مولد ہے۔ انسان دراصل اسی جوہر لطیف کا نام ہے اور بدن اسی کا گرانہ ہے۔ اخلاق اور ظاہری و باطنی احساسات کا تعلق بھی اسی سے ہے یہ جوہر لطیف تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

ایک حصہ مکان کی دیکھیے کھال اور نگرانی کا فرض انجام دیتا ہے اور مکان کے افادی تعلقات کی غور و پورداشت کرتا ہے۔ صوفیاء کی زبان میں اس کا نام نفس ہے یہی وہ مقام ہے جہاں برائیوں کو مٹانے والی قوتوں سے بدن کی مملکت میں داخل ہونے کا موقع ملتا ہے۔

دوسرا حصہ وہ ہے جو نفس ناطقہ کے تابع فرمان رہتا ہے اور توبہ کی عملیہ میں سکونیت، لطافت اور عبادت کے لئے ایجنت پیدا کرتا ہے صوفیاء کی زبان میں اسے قلب کہتے ہیں۔

تیسرا حصہ وہ ہے جو نفس ناطقہ کے احکام کے ظہور کیلئے جو اننگاہ کا کام دیتا ہے اسے عقل کہتے ہیں۔ ان تین لطائف کو علماء نفسیات اور فلاسفہ مانتے ہیں۔

خالص دلیل کی زبان سے اگر سنا چاہتے ہو اور ان تینوں کا مشاہدہ چاہتے ہو تو سو آدمیوں کو ایک جگہ جمع کر لو اور ان کے سامنے شاندار کھانے چن دو۔ کھانا چن دینے کے بعد کھڑے ہو کر سب کو مخاطب کرو کہ اس شخص سے زیادہ بوقوت کون ہوگا جو یہ کھانا کھائے۔ اس کھانے کو ورنہ بہائم کھا سکتے ہیں۔ خوب کھانے کی برائی بتاؤ۔

اس کے بعد مجمع کو دیکھو کہ اس میں کس کس افتاد طبیعت کے لوگ ہیں کچھ مقرر کی تقریر پوری طرح سمجھنے کے باوجود مقرر کو غضبناک نگاہوں سے دیکھیں گے۔ اندراندر سے ان کو سوسائٹی میں تدلیل کا اندیشہ بھی ہوگا سگر کھانے پر مکی

کی طرح کریں گے۔ گویا تمثیل کے رنگ میں اگر لوہے کا پہاڑ دیا جائے کہ ترازو کے ایک کٹ

میں لذت و مسوائی ہو اور دوسرے میں لذت کام و دہن ہو تو اس کی اقتادِ طبع

لذت ہوگی۔ اس پر نفس کا غلبہ ہے اور فلاسفہ کی زبان میں یہ مغلوبِ شہوتِ نفسی

ہے۔ کچھ مقرر کی تقریر سے غضب آلود ہوں گے چہرے سرخ ہو جائیں گے

رگین پھول جاٹیں گی اور یہ کہہ کر اٹھ جائیں گے کہ میں اس قسم کے کمین لوگوں میں بیٹھتا

بھی گوارا نہیں کرتا۔ ہزار معذرت کیجئے مانیں گے نہیں۔ صوفیاء کی زبان میں مغلوب

قلب ہے اور فلاسفہ کے نزدیک یہ نفسِ سبعی کا شکار ہے۔ کچھ ایسے سونے گے

مقرر کے سامنے بولیں گے کہ کھانے کے خراب ہوئی وجہ بتاؤ۔ اگر تم عقل

کھانے میں لڑائی بتا دو گے تو میں نہ کھاؤں گا ورنہ تم بکو اس کر رہے ہو اور غلہ

کہتے ہو۔ فلاسفہ اور صوفیاء کے نزدیک یہ مغلوبِ عقل ہے۔

اس عملی مثال میں تینوں لطائف موجود ہیں۔

اب ذرا ایک قدم اور آگے بڑھو۔ عقل اور قلب میں بھی دو درجے ہیں عقل

ایک درجے میں عالمِ قدس کی طرف متوجہ رہتی ہے۔ اور ایک درجے میں مادی اور محسوس

سینوچنا بھی نہیں چاہتی۔ عقل کے درجہ اولیٰ کا نام سر ہے۔ دل کے بھی دو درجے

ہیں۔ ایک درجہ میں وہ روحانیت اور سکوت و سکون چاہتا ہے اور ایک

درجہ میں کود پھلانگ کا خواہاں ہوتا ہے۔ دل کے پہلے درجے کا نام روح ہے

یہ ہیں لطائفِ خمسہ۔

السان فی الواقع دوسرے حیوانات سے اپنی لطائف کی خاطر امتیازی مقام رکھتا

ہے اور احسنِ تقویم بنا ہے۔ ان لطائف میں جوں جوں بیداری ہوتی جاتی ہے

تو رشتے میں اور لطائف بھی رونما ہو جاتے ہیں۔

کوشش کیجئے کہ یہ لطائف بھی مشا اور حواس کی طرح اپنا اپنا کام کر

تاکہ آسن تقویم کا مقام حاصل ہو۔ ورنہ یقین مانئے کہ حیوانیت اور شجریت سے زیادہ پستی
 رونما ہو جائے گی۔ بیشک جسمانی قوت درختوں، پہاڑوں، اور حیوانوں کی طرح بڑھے گی مگر
 دماغ حوص وسیع ہو کر کتوں سے زیادہ حریص ہو جائیں گے۔ یعنی صحیح معنی میں شہ
 و رضا اسفل سافلین کی تصویر ہوگی۔

شاید حضرت علی کی طرف اخلاق کی کتابوں میں جو یہ مقولہ منسوب ہے کہ سب انسان
 رب کا فرماں بردار ہو تو ملائکہ سے افضل ہے اور نافرمان ہو تو کتے سے بدتر ہے۔
 اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ لطائف بیدار نہ ہوں تو اسفل سافلین میں پہنچ جاتا ہے۔
 انبیاء کی آمد کا مقصود بھی یہی ہے جیسا کہ قرآن میں وحی کے استشہاد سے ثابت ہو
 رہا ہے۔

یہ شاید آپ پوچھیں اور اس کے لئے بے چین ہوں کہ لطائف کیسے
 بیدار ہوتے ہیں؟ سوال میں ذرا گہرائی ہے۔ مختصر جواب سے تسلی نہ ہوگی بطویل
 جواب کیلئے خط کا محدود معیار اجازت نہیں دیتا۔ کوشش کروں گا کہ دوسرے
 خط میں سمجھاؤں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بنگلہ مولانا فضل حق صاحبی کے خطیب مجدد اجمہ بازار سیالکوٹ۔

شرکت جیل سیالکوٹ

۱۸ دسمبر ۱۹۵۳ء

توجید بطور مقام حاصل کرنے کا نسخہ اور اس کی ترکیب استعمال

حییٰ فی اللہ!

السلام علیکم

اگر پنی کو پناہ مانا ہو تو تدبیر یہی ہے ناکہ گرمی کے زور سے اس کی ٹھنڈک کو گرمی میں تبدیل کر دیا جائے اور گرمی کی ایک ضروری مقدار مہیا ہونے پر اللہ جل شانہ کے حکم سے پنی بجاپ بن جائے گا۔ بس مسئلہ سمجھ میں آگیا۔ اگر چاہتے ہو کہ توجید بطور مقام ہاتھ آئے اور یہ چاہت بھی سچی ہو۔ توقع، آرزو اور ولولے کے درجہ کی نہ ہو تو بس نفس کے دامنوں سے جو آلودگیاں چمٹی ہوئی ہیں۔ اور جن جن سے جی ٹھنڈا ہوتا ہے ان کو اللہ جل شانہ کی محبت، طاعت، خشیت، موالات، سوال، توکل، لجاؤ، ریاضا، تقویٰ اور تحاکم و زخبت کی گرمی سے ختم کر لو۔ تم پوچھو گے کہ یہ گرمی کیسے پیدا ہو۔ تین کام کرو۔

الف :- نفی و اثبات پر بہتات کے ساتھ مداومت کرو۔

ب :- جی کو یادِ الہی سے غافل نہ ہونے دو۔

ج :- زبان کو گناہ کی آلودگیوں سے بچالو۔

لو چھٹی ہوئی کام ہو گیا۔

اللہم اجعلنا منهم برحمتك - اللہم سیر علینا - اللہم اجعلنا من الذین

یذکرونك دائماً - اللہم جرد الصناعات التعلقات کلہا - اللہم وفقنا

لما تحب وترضی

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بنہار جب الغفور جب ابٹ محلہ کالج وڈ شہر سیالکوٹ

۲۳ دسمبر ۱۹۵۳ء

سینٹی ایجٹ کی دفعہ میں انصاف کے نام پر بے انصافی اور عدل کے نام پر ظلم ہوتا ہے، خلوت کی لذتیں اور پرکیت نفع اندوزیاں، اللہ کی یاد وہ نعمت ہے کہ اس سے آگے کسی نعمت کا تصور بھی نہیں، خواب میں بشارت، جرم کا کھلے ہندوں اقرار، معافی پر موت کو تزییح، قوم کے لئے مرنا فخر، بکنا لعنت ہے۔

تلمیذی العزیز! السلام علیکم

یہ تو ہمیں معلوم ہی ہوگا کہ مؤرخہ ۸ اگست ۱۹۵۳ء کو حکومت کا عتاب برق و رعد بن کر میرے خرمین آزادی پر پڑا اور میں اس غیر جمہوری قانون کی دفعہ ۳ کے ماتحت جسے پبلک سینٹی ایجٹ کہتے ہیں جیل میں پہنچا دیا گیا۔ اس قانون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انصاف کے نام پر بے انصافی اور عدل کے نام پر ظلم اس کے آسرے پرورش پاتا ہے اور انتظامیہ کو عدلیہ سے بے نیاز ہو کر من مانی کارروائیاں کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مجرم کو جرم کا علم نہیں ہوتا اور نہ ہی ارادہ پتہ ہی دیا جاتا ہے۔ میں خود سوچتا ہوں کہ خلوت کی یہ سعادت جو مجھے باہر کسی قیمت پر بھی نہیں ملتی تھی، بار بار اس کے لئے آرزوؤں کا خون ہوا۔ بلکہ بوجہ اسی تک درد میں جگر خوں ہوا۔ یکایک کیسے نصیب ہوئی؟ اس کی لذتوں اور پرکیت نفع اندوزیوں کی کیا پوچھتے ہو۔ زبان میں اس کے لئے یارائے سخن نہیں اور قلم میں اس کی تاب نہیں۔ سچ کہدوں۔ کیفیات ہیں، جذبات ہیں، میرے پاس تعبیر کے لئے الفاظ نہیں۔ بیداری اور خواب دونوں یہاں یکساں ہیں۔ جا سکتے ہوئے تو جا گتا ہی ہوں مگر سوتے ہوئے بھی الحمد للہ بیدار رہتا ہوں۔ یہ وہ جنت

ہے کہ اس پر دنیا کی کروڑ ہا اور بے بہا لذتیں قربان ہیں۔ اللہ جل شانہ کی بڑی ہی
 عنایات ہیں۔ مختصر سے مختصر الفاظ ہیں۔ یہ کہ بس اللہ کی یاد کی توفیق ملی ہوئی ہے
 اور یہ وہ نعمت ہے کہ اس سے آگے کسی نعمت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ تصور
 ہو بھی کیسے؟ انسان کی انسان ہوتے ہوئے اس کے آگے پرواز نہیں
 ہے۔

ذالك موهب الرحمن ليست

تجمل باجتهاد او بكسب

شاید سند احمد کی حدیث ہے حضرت ابو الدرداءؓ کے حوالے سے
 مارج میں لکھی ہے۔

الا انبئکم بخیر اعمالکم واذکاھا عند ملیکم وارتعھا فی

درجاتکم وخیرکم من اعطاء الذهب والفضة وان

تلقوا عدوکم فتضربوا اعناقهم ویضربوا اعناقکم قالوا

وما ذالك یا رسول اللہ قال ذکر اللہ عز وجل

میں کہہ نہیں سکتا کہ ساعات کیسی لطیف ہیں لم یدر من لم یدق

والی بات ہے۔ ارباب اقتدار تو اسے تعزیر، عقوبت اور تعذیب سمجھے ہوئے

ہیں۔

بدم گفتی وخورسندم عفاک اللہ تو گفتی

جواب تلخ می زید لب لعل شکر خارا

اگر ان کو میری لذت گیر لوں گا پتہ چل جائے اور خدانہ کرے کہ پتہ ہو تو

یقیناً اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کے لئے مجبور ہو جائیں۔ انہوں نے پتہ نہیں کس

جرم کی پاداش میں میرے لئے یہ مقام تجویز کیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں

اس کے سوا کچھ نہیں کہ ختم نبوت کی حمایت پر میرے منہ سے نکلے ہوئے چند بول پر رنگ لائے ہیں۔ ذوالنون مصری نے کیا خوب کہا ہے۔

لا انساك في اكثر ذكراك

ولكن بذكراك يجرى لسانی

اسے کچھ حسن اتفاق کہنے کہ آنے سے دو روز پہلے خواب میں ایک شخص نے بتایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ حالات خوش آئند ہیں۔ اب بھی جذبات میں وہی گرمی ہے۔ احساسات وہی ہیں۔ صاف صاف اور بلا خوف لومہ لائم کہتا ہوں کہ اگر ارباب اقتدار کی نظر میں میرا جرم ہی ہے تو مجھے اس جرم کا کھیلے بندوبست قرار ہے۔ یہ اقرار میرے ایمان کا جزو لاینفک اور میری اخروی نجات کی اساس ہے۔ یہ نظریہ نہیں جو بدل جائے۔ یہ عقیدہ ہے اور عقیدہ بھی وہ جس کی عمارت قرآن و سنت کے صاف اور صریح محکمات پر اٹھی ہے۔ تیرہ سو سال سے ہواؤں کے نہ معلوم کتنے طوفان اسے ختم کرنے کے لئے اٹھے ہیں اور نہ معلوم کتنے اٹھیں گے مگر آج تک اپنی جگہ سے نہ ہلا ہے نہ پلے گا انشاء اللہ۔ اور اگر میرا جرم ارباب اقتدار کی نظر میں اس کے سوا کچھ اور ہے تو اولاً اس کی تعین مطلوب ہے اور تعین میں اگر یہ جرم ملت سے غداری یا ملک سے بے وفائی ظاہر ہو تو پھر حکومت کا فرض ہے کہ مجرم کو قانون کے مطابق جرم کی پوری پوری سزا دے۔ ختم نبوت پر منہ سے نکلے ہوئے بول اگر جرم ہیں تو معافی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں اور اس جرم کا میں خود اقراری ہوں۔

غداری کا الزام اگر ان کے علم میں پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو وہ خوشی سے سزا دیں اور زیادہ سے زیادہ دیں۔ میں اپنے علم میں مجرم نہیں ہوں۔ مجھے اپنے

اس جرم کا اقرار نہ ہو تو میری زبان پر معذرت کے لفظ کی غلط کروٹ بھی نہیں
 آسکتی۔ الحمد للہ کہ میرا دامن غداری کے ناپاک دھبوں سے آج تک آلودہ
 نہیں اور خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ میں قوم کے لئے مرنا جانتا ہوں مگر بکنا نہیں
 جانتا۔ اس اخلاقی سطح کے آدمی دنیا میں سو سائٹی کے بدترین افراد ہوتے
 ہیں۔ بھلا جس شخص کے عقیدے میں ایک مسلمان کی بدخواہی نا جائز ہو،
 اسے پورے سات کروڑ کا بدخواہ بتانا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ اللہ معاف
 کرے، وقت بہت گزر چکا ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

ڈسٹرکٹ جنرل سیال کوٹ

۲۷ دسمبر ۱۹۵۳ء

حکیم الامت شاہ ولی اللہ کی ذات صرف علمی نہیں بلکہ استدلالی شخصیت ہے۔ شاہ صاحب کے سینہ تجدید سے اپنی ہوئی ہدایت علم الہی اور ربانی ہے۔ فکر و عمل کی دو قوتیں، افراط و تفریط، راہ اعتدال، ایمان اور اس کے عناصر، توحید، توحید کے دامن پر دو حصے، توحید کے مدارج، انسانیت کی تکمیل توحید پر موقوف، تسبیح و تحمید توحید میں معرفت کے پیمانے ہیں، توحید انسانی فطرت کا خمیر ہے۔

تلمیذی عزیز! وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضناہ۔ السلام علیکم
اسلام سمجھنے میں مجھے جس قدر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے فائدہ ہوا۔ زبانِ قلم میں اسے بیان کرنے کی تاب نہیں ہے۔ بلکہ اگر اسلام شناسی کی راہ نوردی میں یہ علمی شخصیت میری راہنما نہ ہوتی تو میں کہہ نہیں سکتا کہ میں کہاں ہوتا۔ حجۃ اللہ البالغہ، البدور البانغہ، الخیر الکثیر اور التفہیمات الالہیہ میرے شبانہ روز مطالعہ کا مرکز رہے ہیں۔ مجبلاً غیبہ ما یجب لنفسہم کے دباؤ نے مجھے مجبور کر دیا کہ شاہ صاحب کو جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ میں پڑھ سکا ہوں۔ آپ کے سامنے بھی اس کی سوغات پیش کروں۔
در اصل شاہ صاحب کی گرامی قدر علمی شخصیت صرف پڑھنے کی نہیں بلکہ اعتبار و استدلال کی ہے۔ کیونکہ شاہ صاحب کے علوم خود شاہ صاحب کے لفظوں میں "علم الہی اور ربانی" ہیں۔

اسلامی زندگی آج جس افراط و تفریط کا شکار ہے اور جسے دیکھ دیکھ کر

پر دروند اندر اندر کرٹھ رہا ہے۔ اسے دور کرنے اور اسلام کے جادہ اعتدال پر لانے کا میرے خیال میں ایک طریق یہ ہے کہ حکیم الامت کے علوم کو زیادہ سے زیادہ شاہزادہ عام پر لایا جائے۔

اسی یقین سے دب کر میں نے ارادہ کیا ہے کہ شاہ صاحب کے علوم میں سے مختلف عناوین کا انتخاب کروں۔ اس راہ میں میری نظر انتخاب سب سے پہلے توحید پر پڑی ہے۔ بیگانے تو بیگانے خود بیگانے بھی توحید کے اس تصور سے خالی الذہن ہیں جس کی دعوت انبیائے کرام نے تھی۔
حق جل مجدہ نے انسان کو فکر و عمل کی دو قوتیں دی ہیں۔ اول الذکر کو عاقلہ اور آخر کو عالمہ کہتے ہیں۔ قوت عالمہ کی ساری سرگرمیاں کھانے کیلئے غذا، رہنے کیلئے مکان، پہننے کیلئے کپڑا، سکون کے لئے رفیقہ اور اپنے ہم چشموں میں برتری کے مقام کی تلاش میں لگی رہتی ہے۔ قوت عاقلہ محاورات، تخیلات، احساسات اور علمی ادراکات کی تک و دو کرتی رہتی ہے (التفہیمات

الابلیہ ص ۳۱۷)

جیسے عمل کے میدان کی وسعتیں زندگی کے ہر گوشے میں ناپید اکنار میں ٹھیک اسی طرح منکر کی پہنائیوں کی بھی آخری سرحد کوئی نہیں ہے۔ عمل کی وسعتیں ہوں یا منکر کی پہنائیاں دونوں افراط و تفریط کا شکار رہتی ہیں۔ (التفہیمات ص ۱۷۱)
انبیاء کی آمد کا مقصد و حید یہ ہے کہ انسان کو منکر و عمل کے میدان میں افراط و تفریط سے بچا کر اعتدالی پر رکھا جائے۔ اسی جادہ اعتدال کا نام دورہ ایمان ہے۔ اس کی سبب نبی دعوت لے کر آئے اور اسی کی خاطر قرآن اترتا ہے (التفہیمات ص ۵۳)

جو ایمان آخرت میں مفید اور انسانی زندگی کے لئے حیانت اور بچاؤ کا کام

دیتا ہے وہ ہے کہ جس کی عمارت توحید، محبت، فنا، توکل، عبادت، ذکر اور یقین کی بنیادوں پر قائم ہو۔ (التفہیمات ص ۱۶۰ ج ۲)

توحید یہ ہے کہ دایمان مومن شرک کی ساری آلودگیوں سے محفوظ ہو۔ محبت یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی ناراضگی کے مقابلے میں ذاتی میلان اس کی نگاہ میں بیچ ہو۔ فنا یہ ہے کہ کبائرت سے اجتناب اور صفائے پراہر سے بچا رہے۔ توکل یہ ہے کہ شگون، چھوت چھات، بھوت پریت، دیو پری سب سے الگ تھلگ رہ کر اللہ جل شانہ پر بھروسہ رکھے۔ عبادت یہ ہے کہ فرائض کی پابندی کرے۔ ذکر یہ ہے کہ اذقات مختلفہ میں جو دعوات و اذکار شائع علیہ السلام سے ثابت ہوں۔ ان کو ادا کرے۔ (التفہیمات ص ۱۶۰ ج ۲)

توحید تمام نیکیوں کی اصل اور اساس ہے کیونکہ انسان کے لئے خدائے ذوالجلال تک رسائی کی صرف یہی راہ ہے اور اسی کے ذریعے انسان پر عالم غیب منکشف ہوتا ہے یہی انسان میں عالم قدس سے ملنے کی قابلیت پیدا کرتی ہے۔ توحید کی عظمت اور تمام نیکیوں کے لئے بس کی گانٹھ ہونے کا اندازہ اس پیغام سے ہوتا ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ جل شانہ کی جانب سے بندوں تک پہنچایا ہے۔

من یقنی بقرب الارض خطیئة لا یشوک باللہ شیئا لقیته

بمثلا مغفرة ذمہ اللہ البالف ص ۵۹ ج ۱

توحید کے متعلق غلطیوں، گمراہیوں اور خامیوں کا سرچشمہ صرف وہ باتیں ہیں۔ ذات، صفات، عبادتیں ساری مشورثوں کے برگ و بار ان سے نکلے ہیں۔

الف۔ خالق میں مخلوق کی صفات ماننا۔

ب۔ مخلوق میں خالق کی صفات دیکھنا۔

پہلی راہ ستر تا ستر شبہ اور دوسری ستر تا ستر اشراک کی راہ ہے (حجۃ اللہ البالغہ) اگر توحید سے گریز یا نظریات کی کڑیاں بے شمار ہو سکتی ہیں اور ہیں لیکن بنیادی لفظ ہمیشہ وہی رہے ہیں۔

تشبیہ۔ یعنی اللہ جل شانہ کے لئے ایسی صفات تجویز کر لی جائیں جو مخلوقات کی صفات سے مشابہ ہوں۔

اشراک۔ یعنی مخلوق کے لئے وہ صفات تجویز کی جائیں جو خالق کی صفات سے مشابہ ہوں۔

توحید کی اگر تمام ارتقائی کڑیوں کو یک جا کر کے دیکھا جائے تو اس میں صرف چار مدارج نمایاں ہوں گے

الف۔ توحید وجودی۔

ب۔ توحید خالقیت۔ قرآن اور دوسری کتب الہیہ میں توحید کے یہ دونوں ابتدائی مراتب بحث و نظر کا موضوع نہیں ہیں کیونکہ قرآن کی تصریحات کے مطابق یہ دونوں مدارج اللہ جل شانہ کے وجود اور خالقیت میں یگانگت قرآن کے مخالفوں کے مسلمات میں سے ہیں۔

ج۔ توحید تدبیر و تصرف

د۔ توحید عبادت۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ان میں باہم ایک

طبعی رابطہ قائم ہے۔

عرب کے اشراک کی تصور نے خدا کے مقبول بندوں میں اولاً تدبیر و تصرف کی بالاستقلال طاقتیں تجویز کیں اور جب توحیدی تصور کے قیام سے وہ استقلال قائم نہ رہ سکا تو توسل اور توسط کا درجہ انہوں نے پیدا کیا۔

یعنی اگرچہ خود خدا نہیں ہیں لیکن خدا تک پہنچنے کے لئے ان کی عبادت ضروری ہے
 ایک پرستار کی پرستش اگرچہ ہوگی خدا کیسے مگر ہوگی ان ہی کے آستانوں سے ہم
 براہ راست خدا کے آستانے تک نہیں پہنچ سکتے۔ نجائین یعنی ستارہ پرستوں
 نے تصرف و تدبیر کا یہی خزانہ ستاروں میں دیکھ کر ان کی عبادت کے ہیکل قائم کئے
 عیسائیوں نے حضرت مسیح کے لئے علوم مرتبت اور قرب الہی کی وجہ سے ابن اللہ
 کی تمثیل اختیار کی اور کچھ نے حلول کی آڑ میں اللہ کہہ کر پکارا۔ اس کے نتیجے میں
 اقامت ثلاثہ، کفارہ اور مسیح پرستی کے تصورات چھانگئے (حجۃ اللہ ص ۵۹)

انسان فکر و عمل کی دو قوتوں سے مالا مال ہے۔ یہی اس کی نوعی خصوصیت
 ہے۔ جس کے بل بوتے پر وہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے۔ اس کا یہی
 مزاج نوعی خود اپنی ان دو قوتوں کے لئے طبعاً غذا چاہتا ہے۔ اگر اس کو غذا
 سے محروم کر دیا جائے تو بلاشبہ اپنے اس نوعی کمال کو حاصل نہ کر سکے گا جو
 شہنشاہ کائنات جل مجدہ نے اس کے لئے مقرر کیا ہوا ہے۔ فکر کی اسی غذا کا
 نام زبان شریعت میں علم توحید ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۳)

انسان کی قوتِ فکری کے لئے جو علمی غذا توحید کے ذریعے مہیا کی
 گئی ہے۔ اسی کی معرفت کو ذہن انسانی سے قریب تر کرنے کے لئے ناموس وحی
 میں تسبیح و تہمید کا پیمانہ آیا ہے۔ ذہن انسانی جن جن صفات کو جانتا اور پہچانتا
 ہے۔ ان سب کو حضرت حق جل مجدہ کے لئے بولا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ
 بھی بتایا ہے کہ ان صفات کا موصوف جب حق جل مجدہ ہو تو کائنات کی کوئی
 چیز اس کی تمثیل نہیں ہے۔ ہم بولتے ہیں کہ حق جل مجدہ کی ذات ستودہ صفا
 حیات، علم، قدرت، بصارت، ارادہ، سماعت اور کلام کی صفات سے موصوف
 ہے لیکن وہ اپنی توصیف میں بھی یگانہ ہے۔ مثلاً وہ عالم ہے لیکن اس کا علم

علم حضوری ہے۔ وہ بیک آن بیک لمحہ بارش کے قطروں، تودہ ہائے ریگ کے ذروں، درختوں کے پتوں اور جانداروں کے سانسوں کی گنتی اور شمارے کو جانتا ہے۔ بصیر ہے۔ وہ اٹالوٹ رات کی تاریکی میں چھوٹی کی چال اور بند کمروں کے اندر لحافوں میں لپٹے ہوئے انسانوں کی اندرونی دھڑکنوں کو دیکھ لیتا ہے (حجۃ اللہ ص ۲۳ التفہیمات ص ۲۳)

ذاتِ اکبر جل شانہ کو میلیوں، عیبوں، کوتاہیوں اور کمزوریوں سے منزہ اور پاک یقین کرنا تسبیح ہے۔ اس کے لئے کمالات اور حسن و جمال پر مبنی اوصاف ثابت کرنے کا نام تحمید ہے۔ ان دونوں کا مجموعہ ہی اللہ جل شانہ کی وہ صحیح معرفت ہے جو عناصر کی اس گود میں انسان کو ہو سکتی ہے۔ اس سے آگے اس دنیا میں خدائے ذوالجلال کی معرفت انسان کے بس سے باہر ہے (حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۴)

یہ بات انسان کے وجدانی ادغان کے خلاف ہے کہ وہ اپنا اور ارد گرد پھیلی ہوئی پروردگاری کا مطالعہ کرے اور ایک پروردگاری کا یقین نہ کرے۔ ایک شخص غفلتوں اور سرکشوں کے نتیجے میں ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے۔ لیکن خود اپنا اور اپنے مشاہدات کا انکار نہیں کر سکتا۔ وہ جب اپنے چاروں طرف زندگی اور پروردگاری کا ایک عالمگیر، منظم اور با ترتیب کارخانہ دیکھتا ہے تو اس کے دل کے ایک ایک ریشے سے آواز اٹھتی ہے کہ ایک پروردگاری موجود ہے گویا پروردگاری کا اعتقاد حضرت شاہ صاحب کے لفظوں میں مرکوز فی طبائع الانسان یعنی انسانی فطرت کا اندرونی تقاضا ہے۔ اختلاف ایک پروردگاری کے ہونے میں نہیں ہے یہ تو فطرتِ انسانی کا ایک وجدانی احساس ہے لیکن فطرت کا یہی اندرونی جذبہ جب ایک بالاتر ہستی کو مان لیتا ہے تو مان لینے

کے بعد اسے جان لینے کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔ یہیں سے قدر شناسی کے فطری جذبے میں فکر و ذہن کی مداخلت شروع ہوتی ہے چونکہ انسانی معلومات محسوسات کے دائرے میں محدود ہیں اس لئے اس کا تصور اس دائرے سے باہر قدم نہیں نکالتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ انسانیت کا ہر قدم اس راہ میں درماندگیوں کا شکار رہا۔ کبھی موالید و عناصر، کبھی کواکب و سیارات اور کبھی صلحا کی روحیں اس کے دامن فکر پھینچ کر رہ گئیں۔ فکر انسانی کی سب سے پہلی درماندگی یا بقول حضرت شاہ صاحب حیرۃ حائرہ یہی ہے (البدور البارغہ ص ۹)

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بہار ہر وہنا حکیم عبدالواحد بریلوی فاضل بہار کھٹیاکان سید لکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

یکم جنوری ۱۹۵۴ء

دینداری ، فن دینداری اور پیشہ دینداری ، فن دینداری ، تجارت علماء اور
پیشہ دینداری دین فروشی کا ہم معنی ہے ، نبوت کا مطالبہ ان دونوں میں
سے ایک نہیں ہے ، نبوت کا پیشہ نہاد اور علم کے موضوع پر اس
کا مطالبہ ، نفس کو لذت دوسروں پر اپنی برتری جتانے میں آتی ہے
کتابی معلومات انسان کے باطن کا ترکیب نہیں کرتی ہیں ، اچھی محبت
اور اس کی ضرورت ، اخلاق کے مراحل کی پیچیدگی ، اخلاق حساب کے
پہاڑے نہیں جن کو رٹ لیا جائے ، انسان کرنے کے بعد کب اکھٹا
ہے۔

تلمیذی العزیز ! السلام علیکم

آج ایک خاص تقریب سے تم سے باتیں کرتا ہوں — دین و مذہب کو
بہتوں نے صرف فنی طور پر حاصل کیا ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ اس کو برتیں
اس سے اپنی زندگی بنائیں۔ اسے ایک مسلک حیات قرار دیں۔ محض دین کی باتیں
جان لیتے ہیں۔ مقصود ان معلومات پر عمل کرنا نہیں ہوتا بلکہ اسے دوسروں کو جانانا
اپنی تلبطیت کا سکے جمانا ہوتا ہے۔ یا پھر دوسروں کو لتاڑنا۔ اور بہت صرف اس لئے
پڑھتے ہیں کہ یہ بھی منجملہ دوسرے مکاسب کے ایک اکتسابی ذریعہ ہے۔ وہ
اس سے معاشی اچھنوں کو دور کرتے ہیں۔ پہلے کو علم پر اسے علم اور فن دینداری
اور دوسرے کو علم پر اسے نافر یا پیشہ دینداری کہتے ہیں۔

پہلا لیجاری بہ العمامہ او لیاری بہ السعفاء کا اور دوسرا دین فروشی

کا مصداق ہے۔ علم کے موضوع پر نبوت کا مطالبہ نہ یہ ہے اور نہ وہ۔ قرآن نبوت

اور اسلام علم کی تحصیل کو صرف اس لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ لوگ اس کو بہتیں، جزو
 زندگی بنائیں اور ایک ادراکی ذمہ وار وجود ہونے کی وجہ سے جو فرائض ذاتی اور اجتماعی
 اس پر لاگو ہوتے ہیں ان سے گریز پائی کسی وجہ سے اختیار نہ کریں۔ لیکن آہ
 ظاہر بینوں کو عمل میں لذت کہاں نصیب، نفس کو لذت پہ تو صرف اپنے کو وہ منوں
 پر جتانے آتی ہے۔ نفسیت کا لیبل چپکا لینے اور مطالعوں کے نام ٹٹ لینے سے کچھ
 نہیں ہوتا۔ اصل چیز تو صرف ایمانیات میں توحید و رسالت، یقین مجازات، اور
 اعمال میں درستی اخلاق ہے۔ اگر یہ حاصل ہے تو سب کچھ حاصل ہے۔ اگر نہیں تو

کچھ بھی نہیں۔ باقی سب لفظا ظیباں اور اصطلاحی لبرلیاں ہیں۔
 وہی ہیں پاک طینت لو لگی ہے جن کی خالق سے
 نہیں ہے شرک کی نجاست بس وہ طاہر ہیں

عارف بلکہ کہا ہے

علم را بر تن نونی مارے بود علم را بر ذل زنی پائے بود
 صرف کتابی معلومات انسان کے جوہر باطن کو منتقل نہیں کر سکتیں اس کیلئے
 اچھی صحبت کی ضرورت ہے۔ زندگی پر اثر زندہ شخصیت ہی کا پڑتا ہے۔ ایمان میں
 قوت، عمل میں رہنمائی زندہ معلم ہی کے واسطے سے نصیب ہوتا ہے یہی وجہ
 ہے کہ کتابی معلومات کیلئے کتابی صورت چارہ ہی مشہور ہیں مگر اس کے
 عکس بنیوں یعنی معلموں کی تعداد طبرانی کی ایک روایت میں ایک لاکھ چوبیس
 ہزار بتائی گئی ہے۔ عالم بے عمل وہ ہی کہتا ہے جن کے دماغ کتابی معلومات
 سے لبریز ہیں۔ لیکن دماغ غنیمت کی نیند سو رہے ہیں۔ گویا یہ

خشک مغز و خشک تار و خشک پوست
 از کجا ہے آید این آوازِ دوست

Marfat.com

علم اگر عمل میں پیوست نہ ہو تو صرف یہی نہیں کہ انسان اخلاقی گناہوں، بدنگاہی،
 بدزبانی اور بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے بلکہ انسان کی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ ہی بدل جاتا
 ہے۔ اخلاق کے اکثر مرحلے بڑے ہی پیچیدہ ہیں۔ حساب کے پہاڑے نہیں کہ چھوٹا بچہ
 بھی آنکھ بند کر کے رٹ لے۔ جذبات کی کشمکش ایک طرف ہوتی ہے۔ عاقبت اندیشی
 کا فتویٰ دوسری جانب۔ اور پھر خود جذبات کے اندر ہی باہم آویزش اور کشمکش۔ کیا
 حرب کہا ہے۔

فرصت کشمکش مدہ این دل بقرار را
 یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابداری

گرنے کے بعد انسان گناہ سے لاکھ اگر کھینچتا ہے تو عموماً اس وقت جب
 خود گناہ کی قوت جواب دے بیٹھتی ہے۔ ورنہ جب تک قوت و سامان موجود ہے
 نفس پرستیوں اور سیہ کاریوں کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ شباب کی بد مستیاں و بے
 احتیاطیاں کس کو معلوم نہیں ہیں؟ مالویانہ مالو مگر کہے دیتا ہوں۔ بیکسی اور بدی پلوت
 میں جو ثواب و عذاب لگا دہے گا ہی۔ اس دنیا میں بھی دونوں میں یہ بین فرق ہوتا
 ہے کہ طاعت کے بعد طبیعت میں شگفتگی، اطمینان، اور سکون پایا جاتا ہے
 اور معصیت کے بعد طبیعت کو اضطراب اور بے چینی لاحق ہو جاتی ہے۔ شاید
 سمجھ گئے ہو گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں یہ اور صرف یہ کہ علم کو عمل میں برتو بسک
 حیات بناؤ۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ

مرغ پر نارستہ چون پڑاں شود : طعمہ پر گریہ وراں شود
 وہ بصارت تھی یہ بصیرت ہے۔ — والسلام علیکم ورحمتہ اللہ

بظہر مولوی امیر علی مولوی فاضل رنگپورہ سیالکوٹ۔

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۹ جنوری ۱۹۵۴ء

میر خسرو شیخ نظام الدین بلخی کے مرید، پیر اور مرید میں بے حد محبت ہے
جیل بلحاظ صورت خالقہ سے ملتا جلتا ادارہ ہے۔ تخلیہ اور تخلیہ تصوف
کے دو رکن ہیں، جیل کی زندگی سزا سزا تخلیہ ہے، اگر یہاں تخلیہ کا بھی
انتظام ہو جائے تو قیدی اولیاء اللہ بن کر واپس آئیں، جیل میں
جائے۔ رہائش کا نقشہ اور روزمرہ کا پورا پورا پروگرام

جی فی اللہ !
السلام علیکم
خدا ہمیں خوش رکھے تم اس وقت یاد آگئے

جگر خوں ہو تو دردِ دل میں پتی پر لہر پیدا

اصل میں مصرعہ تو یوں لکھا ہے

جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں پتی پر لہر پیدا

یہ صوفیانہ مذاق ہے اور وہ ایک اجتماعی کا تاثر ہے، یاد پڑتا ہے کہ پارسے
اقبال نے حالی کی یاد میں کہا ہے۔ جہاں میں رہتا ہوں لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ چندوں
راہزنوں اور قاتلوں کا یا زندوں کا گورستان ہے مگر مجھے اس سے اختلاف ہے۔ میر
خیال میں ہے

اس مکانیست مندر لگہ جاناں بودہ است

یہ مصرعہ امیر خسرو کا ہے۔ تم کبھی دہلی کے قیام کے دوران میں سستی نظام الدین گئے
پوگے دہلی ان کا مزار ہے خواجہ نظام الدین کے مرید ہیں۔ پیر کو مرید سے اور مرید
کو پیر سے بے پناہ محبت تھی۔ پیر صاحب مرید کی شاعری کے بھی مداح تھے۔
خواجہ صاحب کی زبانی کا ایک مصرعہ ہے

خسر و کہ نظم و نثر متشککم خاست

اخیر میں خسر و غیبات الدین تغلق کے ساتھ بنگال گئے وہیں کچھ قیام کیا۔ اسی قیام میں خبر ملی کہ پیر صاحب اس دار فانی سے رحلت کر گئے خسر و زوتے بیٹے ہی آئے اور مراد مقدس پر حاضر ہوئے۔ خانقاہ کے دروازے پر پہنچ کر شعر پڑھا جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

ایں مکانیست منزلگہ جاناں بودہ است۔

یہ مقام خانقاہ سے صورت کے اعتبار سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ خانقاہی لوازم کی روزانہ پابجائی ہوتی ہے۔ ایک مرید کی تربیت کے لئے خانقاہ میں گھر سے علیحدہ ہونے کے بعد جو کچھ ہونا چاہیے۔ وہ یہاں بکمال موجود ہے۔ تصوف و چیزوں سے مل کر بنتا ہے تخلیہ اور تخلیہ۔ بلکہ بعض اکابر سے تو تعریف ہی منقول ہے۔ تخلیہ کی حد تک تو سب کچھ یہاں ہوتا ہے یعنی کم خوردن، کم گفتن، کم سخن اور کم بامردہاں آمیختن کا سارا کورس ہر قیدی کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ اس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہی اسکیم کا اضافہ کر دیا جائے تو وہ بھی یہاں پوری ہوتی ہے۔ نظم، ترتیب، توازن اور تناسب۔ کسر ہے تو صرف تخلیہ کی لئے کاش! کوئی کمال بھی ہوتا تو مقصود حاصل ہو جاتا۔ ہم جیسے تشنہ لب میراب ہو کر جائے مگر وائے ناکامی فیاللاسف دیاللعاز۔

اب یہاں کی سنو۔ جہاں رہتا ہوں۔ ایک احاطہ ہے۔ شاید یہاں کی اصطلاحی زبان میں اسے سیکورٹی وارڈ کہتے ہیں۔ اس میں رہائشی کمرے ہیں۔ میرا کمرہ ۱۲ × ۸ فٹ کا ہے۔ اور پچھلی بھی ۱۲ فٹ ہے۔ سامنے دروازہ ہے۔ کمرہ شرقاً غرباً ہے۔ مغرب کی جانب دیوار میں چھت کے قریب ایک چھوٹا سا جالی دار روشندان ہے جس سے ہوا اور روشنی کبھی آتی نہیں۔ البتہ چڑیلوں کی بیٹ گزر کر میرے سکون

کو پال کرتی رہتی ہے، کمرے کے آگے دو صحن ہیں۔ ایک وسیع مربع، ۲۰ x ۲۰ فٹ ہے۔ اور دوسرا مستطیل ۸ x ۵ کا ہے، دوسرے صحن میں ایک سائڈ پر پاخانہ اور غسل خانہ ہیں۔ غسل خانے میں پانی جو بیس گھنٹے رہتا ہے، کٹی کاپاٹ لگا ہوا ہے۔ صحن میں شمالی طرف چولہا ہے۔ کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور صفائی کے لئے ایک شخص مقرر ہے۔ کھانا صبح آٹھ بجے اور شام کو پانچ بجے تیار ہو جاتا ہے۔ میں اسی وقت کھا لیتا ہوں۔ خوراک میں تین چھٹانک گوشت، دو چھٹانک دال، سیر بھر سبزی، ڈیڑھ چھٹانک گھی، ڈیڑھ پاؤدودھ، تین ماشہ چائے، ایک چھٹانک جننی، چھ سیر لکڑی ہفتہ میں دو روز فروٹ، ہسپتال کی جانب سے آدھ سیر روزانہ دہی، ہفتہ میں ایک دفعہ جیل ساختہ صابن اور سرسوں کا آدھی چھٹانک تیل ملتا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ میرا اپنا سامان سب چائے اور پان کا ساتھ ہے۔ چائے میں اسٹوپ پر پکاتا ہوں۔ دوپہر کو بارہ بجے اور شام کو دو بجے میری چائے کا وقت ہے۔ کمرے میں دروازے کے سامنے مغربی دیوار کی طرف چاندنی لگا رکھی ہے۔ ایک جانب نماز پڑھنے کے لئے جا نماز بچھا ہوا ہے۔ دوسری جانب چوبی سوٹ کمیس، پان کا سامان، لالٹین رکھی ہے اس سے ذرا پرے چائے کے برتن اور کھانے کے برتن دو ڈگریوں میں رکھے ہیں۔ سول اخبار سے کاغذ نکالے ہیں اور دیوار پر کیل سے اٹکا کر ڈیسنگ الماری کا کام لیا ہے۔ یہ ہے میری کل کائنات۔

اب پوچھو کہ میں جو بیس گھنٹے کن مشاغل میں گزارتا ہوں، لویہ بھی سن لو۔ صبح ایک اور دو کے درمیان اٹھتا ہوں۔ چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد اذان تک تہجد پڑھتا ہوں۔ اذان سے نماز تک لا الہ الا اللہ کہتا ہوں۔ تیز دوسری تسبیحات۔ نماز کے بعد طلوع آفتاب تک اسی طرح گزار جاتا ہے۔ دو رکعت اشراق کے بعد

منہ صاف کر کے کھانے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ کھانے سے فراغت کے بعد
 ساڑھے نو بجے تک تلاوت قرآن۔ ساڑھے نو سے دس بجے تک مطالعہ۔ دس
 سے ساڑھے گیارہ بجے تک قیلولہ۔ بارہ بجے چائے اور ایک بجے تک کچھ مطالعہ
 نماز کے بعد ذکر اور تلاوت قرآن۔ عصر کے بعد کھانا اور مغرب تک تسبیحات۔ بعد
 مغرب چھ نفلیں اور پھر اخبار بیخی تا نماز عشاء۔ اخبار رسول یا نید ملٹری گزٹ
 مناسبے۔ نماز کے بعد سو جاتا ہوں۔ اچھا ملاقات ختم۔ میں ہی بات کر رہا
 ہوں تم تو جواب دیتے ہی نہیں۔ کیا مون برت ہے؟ اگر نہیں تو پھر چپ کیوں
 ہو؟ بھائی ایک طرف بات میں مزہ نہیں آتا۔ اس لئے میں کبھی ختم کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۸ جنوری ۱۹۵۷ء

سید سلیمان ندوی کی رحلت جماعتی زندگی کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے
 سید صاحب بہت بڑا علمی سہارا اور تقدس و تقویٰ کا قومی سرمایہ تھے
 قدیم راہوں کے ساتھ جدید تقاضوں سے آشنا تھے، قانون کے
 خلاف قرآن و سنت نہ بننے کا مفہوم، قوم کی کاپا کاغذی مسودوں، اور
 دستوری سفارشوں سے نہیں بلکہ قلب قلب سے پلٹی ہے۔ وزیر
 قانون کا اطمینان —

جی فی اللہ وقتنا اللہ وایامک لما یحبہ ویرضاه
 السلام علیکم

اس وقت یاد آئے۔ اس کی تلافی اس مکتوب سے کر رہا ہوں یہ جانتا ہوں کہ میری
 زبان قلم سے لکھے ہوئے الفاظ کی آپ تک رسائی نہ ہوگی مگر میرے دل کی بھر اس تو
 ضرور لکھے گی۔ آپ سے دن بھی کالی ہو چلے۔ یاد کی تقریب بھی سن لیجئے۔ کل بارہ بجے
 اخبارات آئے۔ صبح اس لئے بول رہا ہوں کہ ہیں روزانہ تین چار اخبارات تھے ہیں دو انگریزی
 کے۔ ہوں اور پاکستان ٹائمز تو باقاعدہ اور اردو اخبار بے قاعدہ کبھی آثار، احسان،
 کبھی مغربی پاکستان، نوائے وقت، آج نوائے وقت اور اردو نئے نئے اخبار میں
 یہ خبر بڑی دردناک تھی۔ دیکھتے ہی کلیجہ جل گیا کہ سید سلیمان ندوی رحلت فرمائے دار بقا
 ہو گئے۔ ابھی شیخ الاسلام کی مفارقت کے داغ مند دل ہونے نہ پائے تھے کہ یہ سانحہ
 پیش آ گیا۔ پرانے رنجوں میں اس خبر نے تازگی پیدا کر دی۔ پاکستان میں ہماری
 جماعتی زندگی کا سید صاحب بہت بڑا علمی سہارا تھے اور ساتھ ہی تقدس اور تقویٰ کا
 بہت بڑا سرمایہ۔ مگر کیا کیجئے یہاں بس کسی کا نہیں۔ بیابان کی مرضی انا اللہ وانا الیہ راجعون
 بلاشبہ سید صاحب کی وفات سے ہماری جماعتی زندگی کو بہت بڑا ناقابل تلافی

تفصیل پہنچا ہے۔ دینا بھی اور سیاسی بھی، دینی اس لئے کہ حضرت عثمانؓ کے خلفاء میں اگرچہ بہت سی برگزیدہ ہستیاں ہیں مگر علم و عمل کا یہ مجموعہ کہاں؟ جو ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں، مرحوم میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اسلاف کے علم و عمل میں پوری پوری کاپی ہونے کے باوجود وقت کے بدلتے ہوئے جدید تقاضوں سے بھی آشنا تھے۔ اب ہمارے پاس جو کچھ ہر پارہ ہے وہ سب قدیم راہوں سے پورے پورے آشنا ہیں۔ مگر نئی راہوں سے نا آشنا۔

چاہے آپ براہ نہیں مگر بات پتے کی پتے کہنے پھیر رہا نہیں جاتا، ماننے یا نہ ماننے مگر سچ یہ ہے کہ سودودی صاحب میں یہ خوبی سوالا کھڑے کی ہے یہ افسوس ضرور ہے کہ ہم نے ان کو تلف تلف کر کے اپنے سے بہت دور کر دیا ہے فالی اللہ المشتکی۔

سیاسی نقصان اس لئے کہ شیخ الاسلام کے بعد پاکستان کا اقتدار اعلیٰ علمی طور پر ان سے کچھ لپکتا دکھاتا تھا۔ ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی۔ میری نگاہ میں تو کوئی جتنا نہیں آپ کا بچھے پتہ نہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنی جماعتی زندگی کے بارے میں کچھ مایوس ہو گیا ہوں۔ نہیں صاحب الحمد للہ اب بھی ہم ہی ہم ہیں۔ اقتدار کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے والے ہم، اقتدار کو جھک کر سلام کرنے والے ہم، مغرب میں ہم، مشرق میں ہم، مدارس میں ہم، مساجد میں ہم، پلیٹ فارم پر ہم۔ پریس میں ہم۔

لیجئے اب تو پاکستان اسلامی جمہوریہ بن گیا ہے، اور تو اور باہر سے آنے والے خطوط کے ہر ناموں پر بھی یہی لکھا ہوتا ہے اور اب تو یہاں کوئی قانون خلاف قرآن و سنت نہ بنے گا اور اس پر طرہ یہ کہ ہر قانون کو خلاف قرآن و سنت کے بنانے فیڈرل کورٹ میں چیلنج بھی کیا جاسکے گا۔ سادے میں بیچارے مولوی

اور بھول بھلیوں میں ہے۔ پیاری اسلام اور قرآن کے نام پر خون دینے والی امت
مگر بڑے شاطر ہیں ارباب اقتدار اور بہت دیر رس ہیں ان کی چیرہ دستیوں۔

لوگ خوش ہیں کہ اسلام کی زندگی، کچھ نشانیوں نظر آنے لگی ہیں اور اقتدار نہیں
بگا رہا ہے کہ قوم ناموں سے پہل گئی ہے، خدا راہ داری جدوجہد کا عقلی اور سیاسی تجزیہ تو
کیجئے اور ان نتائج پر نگاہ تو ڈالئے جو آگے چلے کہ رونما ہوئے۔ اسے ہیں اس حد تک
میں بھی ماننا ہوں کہ سب اگر بالادستی کسی صالح قیادت کے ہاتھ میں چلی گئی۔ تو
وہ اس سے کچھ اچھا فائدہ اٹھا سکتی ہے اور بس۔ لیکن اگر باگ دوڑا نہیں گئے
ہاتھ میں رہی جو..... پھر اس مملکت کی موجودہ اسلامیت کے مٹ جانے کا
یقین ہے اور بالآخر مصادر عراق جیسی حالت رونما ہو جائے گی۔ آخر وہاں بھی تو دستوری
پوزیشن یہی ہے۔

دنیا پر ایک نگاہ ڈالئے۔ دنیا کو چھوڑ بیٹھے کا من رلیتہ کو دیکھ لیجئے۔ ان
سب ممالک کی تقریباً دستوری پوزیشن پاکستان کی دستوری پوزیشن سے
مختلف نہیں ہے۔ ان میں کتنے ملک ہیں جن کے دستور میں مملکت کے مذہب
اور سربراہ مملکت کا مذہبی مقام مقرر ہے۔ ایران، یو یا عراق، افغانستان، یو یا مصر۔
سب کا حال یہی ہے۔ عراق کے دستور میں تو پہاں تک ہے کہ کوئی قدم خلاف اسلام
نہ اٹھایا جائے گا۔ ہندوستانی دستور میں لائڈ ہیٹ کیسی بڑی چیز ہے مگر سب
جگہ عمل کی دنیا میں جو کچھ پورا ہے وہ سب جانتے ہیں۔ صرف کاغذ کا استادیز کسی
انقلابی اور اصلاحی حالت کی پرگزہ مرکز کا رٹی نہیں ہے۔ اگر صرف کاغذی مسودوں
اور دستوری سفارشاتوں سے کام چلتا ہوتا اور بگڑی حالتیں کٹیک ہو جاتیں تو خدا
کی مرضی کے نمائندے سے ایک لاکھ چوبیس ہزار اور کتا ہیں چار نہ ہوتیں۔ معاملہ برعکس
ہوتا۔ بگڑی ہوئی امتیں دفعات اور قراردادوں سے نہیں بلکہ مبالغہ آمیز کو

تبدیل کرنے سے سنورتی ہیں۔ ما با نفسہم پر نظر ڈالئے اور پھر ما بقوم کو دیکھئے۔ غور تو کیئے کہ جس قرار داد کو خالصتہً مستقبل میں اسلامی حیات کا پیغام سمجھا جا رہا ہے۔ وہ ہے کیا؟ یہی خاکہ — کوئی قانون ساز ادارہ قرآن و سنت کے خلاف قانون نہ بنائے گا۔

برادر! اس کا تعلق صوبائی قانون ساز اداروں کے مستقبل سے بحال کے متعلق خاموش ہے۔ نہ بنائے گا۔ ٹھیک ہے۔ مگر جو بنی ہوئی چیز فی الوقت رائج ہے۔ اس کا مقام کیا ہے؟ کیا اس وقت صوبائی قانون ساز اداروں کی راہ سے جو کچھ قوانین رائج ہیں وہ کسی وقت کا لعدم ہو جائیں گے؟ ہرگز نہیں۔ اور کیا ان کو بھی قرآن و سنت کی مخالفت کے نام پر فیڈرل کورٹ میں چیلنج کیا جاسکے گا؟ ہرگز نہیں۔ شاید اسی لئے وزیر قانون مطمئن ہیں اور بڑے اطمینان سے فرماتے ہیں کہ ایسی صورت بہت ہی کم پیش آئے گی۔ مگر میں کہتا ہوں بہت کم کیا شاید پیش ہی نہ آئے گی۔ اچھا ختم کرتا ہوں۔ لیجئے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۱۵ جنوری ۱۹۵۴ء

انبیاء کی ہدایت میں عقائد، اعمال اور اخلاق کی اصلاح اور اسلام میں ان کے مدارس، اسلام ایک جاندار و جڑو ہے عقائد اس کا دماغ، اعمال اس کے اعضاء و جوارح، اور اخلاق اس کا قلب ہیں۔ پورے جسم میں شارع کی نظر اہمیت قلب کو حاصل ہے۔ قلب اگر صحیح ہو تو کئے ہوئے اعضاء سے بھی کام ہو جاتا ہے، جیسے جسم کی تندرستی کے لئے صحیح خوراک ضروری ہے۔ ایسے ہی اسلام کے جسم کے لئے بھی علم المعروف اور دعوت الی اللہ کی غذا ضروری ہے، اسلام کی صحت کی خاطر جو کام انبیاء کرتے تھے۔ قرآن میں اسی کو امت کا فریضہ قرار دیا ہے یہ امت کے فرائض بھی ہیں، خصال بھی ہیں اور اسی کے نتیجے میں یہ امت خیر امت ہے۔ نبوت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

کی عظمت شان، سینہ قرآن سے ابلا ہوا چشمہ ہدایت۔

جی فی اللہ ملکہ صاحب

اسلام علیکم!

جی چاہتا ہے کہ اس وقت آپ سے کچھ کہوں۔ لیجئے سنٹیے!

انبیاء ترجمان غیب ہوتے ہیں۔ جو کاسہ ہدایت لے کر آتے ہیں اس میں تین

چیزیں اصلی اور بنیادی ہیں۔

۱۔ مبدء و معاد اور مجازات کے متعلق عقائد کی درستگی۔

۲۔ طاعات میں سنت کے موافق عمل کی درستگی

۳۔ اخلاق اور ملکات میں اصلاح و احسان کی نشوونما

پہلے مقصد کی جن لوگوں نے بطور فن خدمت کی پہلن کو تکلیفین کہتے

ہیں اور فن کا نام الہیات یا کلام ہے۔ اشارہ ، ماتریدیہ ، اہل سنت میں اسی فن پر فخر و نظر کے مکاتب ہیں۔ اور ان کے امام ابو الحسن اشعری اور امام منصور ماتریدی ہیں۔

دوسرے مقصد کو جن لوگوں نے بطور فن اپنایا ہے ان کو فقہاء کہتے ہیں اور فن کا نام فقہ ہے۔ شوافع ، احناف ، موالک اور حنابلہ وغیرہ اسی فن میں مدارس کے نام ہیں۔

تیسرے مقصد کی جن لوگوں نے خدمات انجام دی ہیں ان کو عرفاء اور صوفیاء کہتے ہیں اور جس فن میں یہ خدمات انجام دی گئی ہیں اس کا نام اخلاق و تصوف ہے۔ قادری ، چشتی ، سہروردی اور نقشبندی اس کے مدارس ہیں۔

اس طرح اسلام صرف ایک عقیدہ نہیں ہے۔ نہ وہ چند اعمال اور معمول کا مجموعہ ہے بلکہ وہ انسان کی پوری زندگی کے لئے ایک مفصل اسکیم ہے۔ اس میں عقائد ، اعمال اور اخلاق الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ثابت تالیف تقسیم مجموعہ بنتے ہیں جس کے اجزاء میں باہم اسی طرح پیوند ہے جیسا کہ زندہ جسم کے اعضاء میں ہوتا ہے۔

عقائد اس کا دماغ ، عبادات و اعمال اس کے جوارح اور قوانم ہیں۔ جن کے بل بوتے پر وہ کھڑا ہوتا ہے اور کام کرتا ہے۔ معیشت ، معاشرت ، سیاست اور نظم کے وہ تمام اصول جو زندگی کے لئے اسلام نے پیش کئے ہیں اس کے لئے معدے اور جگر کا کام دیتے ہیں۔ اس کو صحیح و سالم آنکھوں اور بے عیب کانوں کی ضرورت ہے۔ اخلاق و ملکات اس کا قلب ہیں۔

اس پورے نظام میں اصلی اہمیت قلب کی ہے۔ اس کی ہمت تمام اعضاء و جوارح کو طاقت بخشتی ہے۔ اعضاء و جوارح اکثر و بیشتر کٹ بھی جائیں یا خراب ہو جائیں تو اکیلا قلب ٹھوٹے بچے کھنچے خستہ بیمار اعضاء کے ساتھ ہی زندگی کے پھر نئے

ہے۔ لیکن دل کی اگر حرکت بند ہو جائے تو دماغ اور جوارح اچھے بچھے ہونے کے باوجود کالعدم ہیں۔ تنگی کا بقا دل سے وابستہ ہے۔ جسم کی تمدستی کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ ذاتی طور پر اس میں کہیں کمی نہ ہو ایسے ہی اس کی تمدستی کی نشوونما اور بقا کے لئے یہ بھی ناگزیر ہے کہ اسے خواجک صحیح متی رہے، آب و ہوا موافق ہو خواجک اگر غلط ہو تو کوئی جسم بھی اعضاء کی تمدستیوں کے باوجود بقا کے لئے صحت کی ہم میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اسلامی جسم کی اسی ضرورت کو وحی نے امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اور دعوت کہہ کر پکارا ہے۔ فضائیں پیدا کرنے، ہواؤں کا رخ ٹھیک کرنے، پڑوں میں بقدر ضرورت پانی دینے، لولائی کرنے، غذائی مواد تلاش کرنے، وقت کی مزاجی موافقت سے اس میں ترکیبی عمل قائم کرنے اور اس کی خاطر جان کو جو کھوں میں ڈالنے اور تھج کرنے کا نام ہی امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور دعوت ہے۔ فضائیں اگر گتدی ہوں اور ہواؤں میں جرائم پھیلے ہوئے ہوں تو نہ صرف ایک آدمی کو جان کا خطرہ ہوتا ہے بلکہ یہی کبھی وہاؤں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

پہلے اسلام کی صحت کی خاطر یہ کام انبیاء کرتے تھے سب انبیاء نے تکلیفیں اٹھا اٹھا کر، بھوکوں رہ رہ کر، نضائوں کو مٹیک کرنے اور ہواؤں کا رخ بدلنے کی جان توڑ کوششیں کی ہیں۔

قرآن میں جو نبیوں کے تذکرے ہیں اقصیٰ ہیں اور واقعات ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے لیکن اللہ جل شانہ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی امت کو یہ بزرگی دی ہے کہ نبیوں کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ صرف سپرد نہیں بلکہ اس کو امت کی خیریت کا مبنی قرار دیا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَارَةً بِآيَاتٍ وَمَا تُعْرَفُونَ وَتَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

تم ہو بہتر سب امتوں سے جو بھی گئی عالم میں حکم کرتے ہو اچھے کاموں
کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر
اور کار نبوت جس امت کے سپرد ہوا ہے اس امت کے خصائص کا جو
نقشہ قرآن میں ہے وہ انبیاء سے ملتا جلتا ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ صرف کام
ہی سپرد نہیں ہوا ہے۔ بلکہ خصائص بھی اس امت کو نبیوں والے ارزاں ہوئے ہیں۔
اور ترقی کر کے کہتا ہوں۔ کہ صرف خصائص ہی نہیں بلکہ اس امت کے فرائض
بھی نبیوں جیسے بتائے گئے ہیں۔ کیا کہنے ہیں اس نبی کی عظمت شان کے
جس کی نبوت دنیا میں اجتماعی بعثت کا سامان بن کر آئی ہو نبی تو مبعوث ہی
ہوتے ہیں لیکن یہاں تو پوری امت مبعوث ہوئی اور اس شان سے بڑھ کر وہ تمام امتوں
اور فرائض جو نبی انفرادی طور پر لے کر آتے رہے ہیں یہ امت اجتماعی طور پر لے کر
آئی ہے۔ بات لمبی ہو جائے گی ورنہ کھول کر بتاتا کہ اس موضوع پر سنیہ قرآن
سے ابلا ہوا چشمہ ہدایت کیا ہے۔

مجملاً یہ کہ قرآن نے ہدایت، شہادت، دعوت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر
تلاوت، تبلیغ، تعلیم جو باتیں نبوت سے متعلق فرمائی ہیں۔ وہ سب کی
سب وصف اور فرض کے درجے میں اس امت کے لئے بھی بولی ہیں۔
قرآن نے امت کو ان فرائض کی پابجائی کے لئے جو واضح پالیسی دی
تھی وہ قرآن ہی کے لفظوں میں یہ تھی۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يُدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

اور چاہیے کہ رہتے ہیں ایک جماعت ایسی جو بتاتی رہے نیک
 کام کی طرف۔ اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں برائی
 سے اور وہی پچھے اپنی مراد کو۔

یعنی اسلامی نظام، اسلامی حیات، اسلامی معاشرت، اسلامی تمدن
 اسلامی تہذیب، اسلامی مواخات اور اعتصام بحبل اللہ اس وقت قائم رہ
 سکتا ہے، اس وقت نشوونما پاسکتا ہے جبکہ مسلمانوں میں ایک جماعت
 خاص دعوت اور امر بالمعروف کا کام کر رہی ہو۔ قرنِ اول ہی سے مسلمانوں نے
 اللہ جل شانہ کے حکم کو سن کر پے کرہ لگالی تھی۔ صحابہ نے خود یہ کام ذات
 نبوت کو کرتے دیکھا تھا۔ دین اسی سے پھیلا اور پھولا تھا۔ اسی کی خاطر
 خلافت قائم ہوئی تھی اور اسی کے لئے دعوات روانہ ہوتے تھے۔ مقصد تو یہی
 تھا کہ اسلام کو مزاج کے موافق خوراک اور اچھی آب و ہوا ملتی رہے۔ تاکہ
 دیر تک اس کی تندرستی قائم رہے۔ پہلے پہل تو یہ کام ایک ہی جگہ چلا لیکن
 کچھ دنوں بعد یہ کام تقسیم ہو گیا۔ کچھ نے جہاد، عدالت اور شہری انتظام
 کیا۔ یہ خلافت ظاہرہ کہلاتی ہے اور کچھ نے کتاب الہی اور سنت کی
 تعلیم، الوارِ باطن کے ذریعے لوگوں کے اخلاق کا تزکیہ شروع کر دیا۔ یہ
 خلافت باطنہ ہوئی۔ خلافت ظاہرہ والوں کو "ملوک" اور خلافت باطنہ والوں
 کو "علماء" کہا گیا۔ آگے چل کر تقسیم کا بڑھا چلا۔ کچھ لوگوں نے صرف کتاب و
 سنت کی تعلیمی سرگرمیاں قائم رکھیں اور کچھ نے صرف الوارِ باطن کے
 ذریعہ اخلاقی تزکیہ کا کام کیا۔ پہلے علماء اور موالی کے نام سے مشہور ہوئے
 اور دوسروں نے صوفیاء کا لقب پایا۔

اچھا لیجئے رخصت ہوتا ہوں۔ اب کالی وقت ہو چلا ہے۔ اگرچہ

بیت نامت نام ہے۔ اور کیا کہوں اور آہ کیا کہوں خوش نصیب ہیں
آپ۔ صندہ

دکھ ہیں تو پنے میں نہیں ملتی ہے لفت
یوں آپ کی شمشیر کے سہیل تو بہت ہیں

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

مہر جنوری ۱۹۵۴ء

دنیا میں مسلمان کی حیثیت ایک نسب یا وطن کے نام پر بنی ہوئی قوم کی نہیں ہے۔ ماننے کو اسلام، نہ ماننے کو کفر اور مان کر چھوڑ دینے کو ارتداد کہتے ہیں، قرآن کی چند اصولی اور قانونی ہدایات انفرادی اور اجتماعی ارتداد کا قرآن میں ذکر، ایمان کے بعد ایمان سے گریز پائی اختیار کرنے والا ظالم اور معون ہے، قرآن میں ملعون کی سزا، مرتد کے حربی ہونے کا فیصلہ فقہاء نے پیچا ربون اللہ، و رسولہ سے استنباط کیا ہے اسلام کی بنیادی خصوصیت، جیسے ایک نبی کا نبی ہونے سے انکار کفر ہے، ایسے ہی کسی غیر نبی کو نبی ماننا بھی کفر ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی مرضی کے آخری نمائندے ہیں۔ اس کا انکار قرآن و سنت کی کھلم کھلا بغاوت ہے

السلام علیکم

خواجہ صاحب!

اسلام صرف چند سطحی رسموں کا نام نہیں۔ بلکہ اسلام نام ہے ایک جامع تہذیب، کامل تمدن اور مکمل نظام زندگی کا۔ اس کی حیثیت نہ اوطان کے نام پر پیدا شدہ نسبتوں کی ہے جیسے کہ ایک لاہوری، ایک پنجابی اور ایک پاکستانی۔ بہر حال پاکستانی، پنجابی اور لاہوری ہے خواہ اس کی زندگی کچھ ہو اور نہ آباد اور خاندانوں کے نام پر بنائے ہوئے دائروں کی ہے جیسے شیخ، سید، فاروقی، راجپوت وغیرہ۔ شیخ بہر حال شیخ زادہ ہے چاہے وہ اپنے کردار، اور اپنی گفتار میں اخلاق کے معیار سے کتنا ہی گرا ہوا ہو۔ نہ زنا اس کی پنجابیت، اور شیخی پر بٹہ لگانا ہے اور نہ شراب نوشی اس کے لئے حلیت ہے

شُرک، کفر، فسق، فجور اور احساق کی ساری لاشوں کے بلوچو و وہ پنجابی، پاکستانی اور شیخ زادہ ہے۔

مسلمان کی حیثیت یہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اصلی اعتباری اور اہلانی مقام ان نسبتوں سے ملتا جلتا ہے جن کی عمارتیں ناموں کی بنیاد پر نہیں بلکہ کاموں کی بنیاد پر اٹھتی ہیں۔ جیسے ڈاکٹر، حکیم، حلوائی۔ ڈاکٹر اس وقت تک ڈاکٹر ہے اور حلوائی اس وقت تک حلوائی ہے جب تک وہ ڈاکٹر اور حلوائی کا کام جانتا اور کرتا ہے۔ ڈاکٹر کا بیٹا ڈاکٹر اور حلوائی کا بیٹا حلوائی نہیں ہے یہی حلقہ مسلمان کا ہے اگر اسلام کو مانتا اور جانتا ہے تو مسلمان ہے، اور اگر نہ جانتا اور نہ مانتا ہے تو مسلمان نہیں ہے۔ جیسے ایک نیشنلسٹ اور سوشلسٹ اور وقت تک نیشنلسٹ اور سوشلسٹ ہے جب تک کہ نیشنلسزم اور سوشلزم کو مانتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان اس وقت مسلمان ہے جب کہ اسلام کو مانتا ہے نہ ماننے والوں کو مسلمان نہیں بلکہ کافر کہتے ہیں اور اسلام کو مان کر چھوڑ دینے والوں کو مرتد اور اس کے عمل کو ارتداد کہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ارتداد کا بھی اسی جگہ تذکرہ ہے جہاں اس نے اسلام کا پیمانہ بتایا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَافِرًا ۖ وَالْبَعْدَ إِسْمَانَهُمْ ۚ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ

حَقٌّ ۖ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۚ أُولَٰئِكَ

جَزَاءُ عَمَلِهِمْ ۚ عَلَيْهِمُ اللَّعْنَةُ ۚ وَاللَّهُ وَالْمَلَائِكَةُ وَالنَّاسُ أَجْمَعُونَ ۚ خَالِدِينَ

فِيهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ ۚ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ۚ أَلَا الَّذِينَ

كُتِبَ عَلَيْهِمُ الذِّكْرُ وَأُتُوا بِهِ مُتَكَبِّرِينَ ۚ فَذَرْهُمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ ۚ فَمَلَأُوا

كُفْرَهُمْ نَارًا ۚ كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ۚ كَيْفَ تَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَافِرًا ۚ كَذَلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الَّذِي

گواہی دے کر کہ بے شک رسول سچا ہے اور آئیں ان کے پاس نشانیوں روشن اور اللہ نہیں راہ دیتا ظالم لوگوں کو۔
 ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں
 کی اور لوگوں کی سب کی ہمیشہ رہیں گے اس میں نہ ہلکا ہو گا
 ان سے عذاب اور نہ ان کو فرصت ملے۔ مگر جنہوں نے توبہ
 کی اس کے بعد اور نیک کام کئے تو چہ شک اللہ غفور
 رحیم ہے۔

ان آیات سے چند اصولی اور قانونی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔
 الفتنہ۔ ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا ظلم اور اختیار کرنے والا
 ظالم ہے۔

بہ۔ ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والا نہ صرف اللہ اور اس
 کے فرشتوں کی رحمت سے دور ہوتا ہے بلکہ وہ انسانی سوسائٹی میں
 انسانی رحم و کرم سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔
 ح ۱۰۔ اس کے لئے توبہ اور واپسی کا دروازہ کھلا ہوا ہے باصلاحیت
 حل کرے تو ماضی کی فرسوزاشتیں اللہ کے یہاں کالعدم ہو سکتی
 ہیں۔

ایک اور جگہ تذاو کے تذکرے میں ہے۔

وَمَنْ يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَمَا لِي بِهِ
 حَبِطَتْ أَعْمَالُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ
 هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

اور جو کوئی پھر سے تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جاوے

حالت کفر ہی میں تو ایسوں کے ضائع ہوئے عمل دنیا اور آخرت میں۔ اور وہ لوگ رہنے والے ہیں دوزخ میں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا ہے کہ۔

الف۔ ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے سے نہ صرف آخرت میں بلکہ اس دنیا میں جبط اعمال ہو جاتا ہے۔

ب۔ آخرت میں یہ شخص نہ صرف اصحاب النار میں سے ہے بلکہ وہاں اس کا مقام خلود ہے۔

ج۔ جبط اعمال یعنی ایک مسلم ہونے کی حیثیت میں اس کے کئے ہوئے سارے اعمال حروف غلط ہو گئے۔ نہ مسلمان عورت سے اس کا نکاح باقی ہے نہ مسلمانوں کی وراثت میں اس کا کوئی حصہ ہے۔

ایک اور مقام پر اجتماعی ارتداد کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا يَدْعُوا لَكُمْ عَذَابٌ دَيْنٌ فَتُوفِّيَاتُ يَوْمَ تَقُومُ
سُحُورُهُمْ وَيُحْيِيهِمْ وَيُحْيِيهِمْ وَيُحْيِيهِمْ وَيُحْيِيهِمْ وَيُحْيِيهِمْ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُتَ لَوْمَةَ لَائِمٍ خَالِكٍ فَضَّلَ اللَّهُ يَوْمَئِذٍ
وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

اے ایمان والو! جو کوئی تم میں پھرے گا اپنے دین سے تو اللہ
عنقریب لاوے گا ایسی قوم کو کہ اللہ ان کو چاہتا ہے اور وہ اس
کو چاہتے ہیں۔ نرم دل ہیں مسلمانوں پر زبردست ہیں کافروں پر
لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور ڈرتے نہیں کسی کے الزام سے۔ یہ
فضل ہے اللہ کا دے گا جس کو چاہے اور اللہ کشائش

والا ہے خبردار!

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ارتداد کے دائرے میں مسلمان کے فرائض یہ ہیں کہ۔
 الف۔ مرتد ہونے والے شخص سے نہیں بلکہ خود دین سے پیار کرے۔
 ب۔ اس کا مقابلہ تن کر کرے اور اس معاہدے میں کسی رحم و کرم کو درمیان
 میں نہ آنے دے۔

۳۔ اس سے مقابلہ میں سر توڑ سرتن کی بازی لگا دے اپنے کو تاج کرے۔
 ۴۔ ملامت گروں کی کوئی ملامت اور طعنہ زلوں کا کوئی طعنہ اس راہ میں
 مزاحم نہ ہو۔

۵۔ سب اس سے رفاقت کے انفرادی اور اجتماعی تعلقات
 توڑ لیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے۔

إِنَّ النَّبِيْنَ يَبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ
 فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْخَىٰ بِمَا عَاهَدَ
 عَلَيْهِمُ اللّٰهُ فَسَيُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا۔

تحقیق جو لوگ بیعت کرتے ہیں تجھ سے وہ بیعت کرتے
 ہیں اللہ سے۔ اللہ کا ہاتھ ہے اوپر ان کے ہاتھ کے پھر جو
 کوئی قول توڑے سو توڑتا ہے اپنے نقصان کو اور جو کوئی
 پورا کرے اس چیز کو جس پر اقرار کیا اللہ سے تو وہ اس کو
 دے گا بدلہ بہت بڑا۔

یعنی بیعت ایسان کے وقت جو قول و اقرار کیا گیا اگر اسے توڑے گا۔ تو
 اس کے نقصان کا خود ذمہ وار ہے۔ اسی موضوع پر ایک اور مقام

پر ہے :-

فَانْتَابُوا تَامِرًا صَالِحَةً وَالزُّكْرَةَ فَارْحَمْنَاكُمْ فِي الدِّينِ وَتَفْصِلُ الْآيَاتِ
 لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ وَإِن نَّكُتُوا يَمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعْنُوا
 فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أُمَّةَ الْكُفْرِ أَنَّهُمْ لَا آيْمَانَ لَهُمْ لَعَنَّا لَهُمْ
 يَنْتَهَوْتَ - إِلَّا تَقَاتِلُوتُ قَوْمًا نَكَتُوا يَمَانَهُمْ وَهُمْ يُبَاخِرُ
 الْمُرْسُولَ وَهُمْ يُدْبِرُونَ كَمَا أُولَ الْأَنْتَشُونَ لَهُمْ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ
 تَخْشَوْهُ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ
 وَيُخْزِيهِمْ وَيُنْزِلُ عَلَيْهِمُ السَّلْطَانَ وَيُغْنِي قَوْمَ الْمُؤْمِنِينَ
 وَيُذْهِبُ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ
 عَلِيمٌ حَكِيمٌ

سو اگر توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیتے رہیں زکوٰۃ تو تمہارے
 بھائی ہیں حکم شریعت میں اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں حکموں کو
 جاننے والے لوگوں کے واسطے۔ اور اگر وہ ٹوڑ دیں اپنی قسمیں
 عہد کرنے کے بعد اور عیب لگائیں تمہارے دین میں تو لڑو
 کفر کے سرداروں سے بیشک ان کی قسمیں کچھ نہیں تاکہ وہ
 باز آئیں۔ کیا نہیں لڑتے ایسے لوگوں سے جو توڑیں اپنی قسمیں
 اور منکر ہیں رہیں کہ رسول کو نکال دیں اور انہوں نے پہلے چھڑ
 کی تم سے۔ کیا ان سے ڈرتے ہو سو اللہ کا ڈر چاہیے تم کو زیادہ
 اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ لڑو ان سے تا عذاب دے اللہ ان کو تمہارے
 ہاتھوں اور رسوا کرے اور تم کو ان پر غالب کرنے اور ٹھنڈے
 کرنے دل مسلمان لوگوں کے اور نکالے ان کے دل کی صلہ اور

اللہ توبہ نصیب کرے گا جس کو چاہے گا اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

ان گرامی قدر آیات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دینی اخوت کا اصل اور بنیادی معیار اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ غیر اسلام سے توبہ کر کے اسلامی زندگی کے دو محسوس اور مرئی عمل کے پیمانوں کو اپنالیں یعنی نماز اور زکوٰۃ۔ اور عہد کے بعد نکث کریں اور دین پر عیسوں کے دھبے لگائیں توبہ ائمہ کفر و ضلالت ہیں۔ ان سے قتال ناگزیر ہے۔

مجموعی حیثیت سے ان سب آیات پر ذہن کو خالی کر کے غور فرمائیے اور دیکھئے کہ روح قرآن کیا ہے؛ اور ناموس وحی سراب ضلالت میں بھٹکتی ہوئی دنیا کو کس طرف لے جا رہا ہے؛ دوسروں کا پتہ نہیں مگر میں اپنی جگہ جو کچھ محسوس کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ

ایمان کو اپنائینے کے بعد ایمان سے گریز پائی اختیار کرنے والوں کے متعلق قرآن حکیم کی راہنمائی یہ ہے کہ وہ ظالم ہے، ملعون ہے، دنیا اور آخرت میں اس کی ساری عملی زندگی حرف غلط ہے۔ اس کے مقابلے میں تنہا جان کو جو کھوں میں ڈال کر اس کا مقابلہ کرنا ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے۔ ناکث اور اس نکث کے نقصان کا ذمہ وار ہے۔ ناکثین اگر اجتماعی صورت میں ہوں تو قتال واجب ہے۔

اور انہاد ہی کی ایک قسم وہ ہے کہ اللہ اور رسول کی ایذا جس کے عناصر ترکیبی ہوتے ہیں۔ قرآن ہی میں سورہ احزاب میں ہے۔

إِنَّ الذِّبْنَ يُوْذَوْنَ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِعَنَاهُمْ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَ

الْآخِرَةَ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا

جو لوگ ستاتے ہیں اللہ کو اور اس کے رسول کو۔ ان کو پھسکارا
اللہ نے دنیا میں اور آخرت میں اور تیار رکھا ہے ان کے
واسطے ذلت کا عذاب۔

رحمت حق سے دوری اور اس دنیا میں انسانی رحم و کرم سے محرومی کو قرآن
میں کہیں لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ سے اور کسی جگہ لَعْنَهُمُ اللَّهُ فِي
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ سے تعبیر فرمایا ہے۔ بات ایک ہے مگر انداز بیان مختلف
ہے۔

ملعون کے بارے میں قرآن نے جو ضابطہ بیان کیا ہے بلاشبہ مرتد
اس میں داخل ہے مرتد کی ملعونیت پر قرآن کی سب سے بڑی شہادت
یہ ہے۔

أُولَئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ
أَجْمَعِينَ

ان ہی پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی
لَعْنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا
پھسکارا ہے ان کو اللہ نے دنیا میں اور آخرت میں اور تیار
رکھا ہے ان کے واسطے ذلت کا عذاب

اور ملعون کے متعلق قرآن نے جو ضابطہ بتایا ہے

مَلْعُونٌ أَيْمًا تَقْفُوا أَيْدِيَهُمْ وَأَقْتُلُوا قَتِيلًا

پھسکارے ہوئے جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور مارے
گئے جان سے۔

قرآن ملعون کو سوسائٹی کے لئے جس قدر خطرناک سمجھتا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ ملعون کے لئے صرف قتل ہی کو نہیں کہتا بلکہ اس کا مطالبہ بوٹیاں کر دینے کا ہے۔ جن لوگوں کو عربی زبان کے اسباب سے مٹھوری سی واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ قتل اور لقتیل میں کیا فرق ہے؟

قاتل مومن کے لئے صرف یہ الفاظ بولے جاتے ہیں:-

مَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِدًا فَقَدْ حَزَمَ لَمَّْا جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا وَ
غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا

اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان کر تو اس کی سزا دوزخ ہے

پڑا ہے گا اسی میں اور اللہ کا اس پر غضب ہوا اور اس کو

لعنت کی اور اس کے واسطے تیار کیا بڑا عذاب۔

شرعاً اسی ملعونیت کی بنا پر اس کا قتل واجب ہے اور مقتول کے ولی کا قرآن نے یہ قانونی حق بیان کیا ہے۔

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيَّهِ سُلْطٰنًا عَلٰی لِسْرَتِ
فِي الْقَتْلِ

اور جو مارا گیا ظلم سے تو دیہیم نے اس کے وارث کو زور و
حد سے نہ نکل جائے قتل کرنے میں۔

اس کے علاوہ قرآن حکیم کا پڑھنے والا طالب علم یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ ارتداد کی چادر اوڑھنے والا شخص اپنے عقائد، گفتار اور کردار سے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ اسی معنوی حالت کو قرآن کی زبان میں مشاقہ اور محادہ کہتے ہیں اور یہی میدان

عمل میں جب روٹنا ہو تو محاربہ کہلاتی ہے۔ قرآن نے اللہ اور رسول سے
محاربہ کرنے والوں کی جو سزا تجویز کی ہے وہ سورہ مائدہ میں موجود ہے۔

إِنَّا جَاءَ الَّذِينَ يَحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَسَوْفَ نَنصِبُ فِي الْأَرْضِ فِئَةً
أَنْ يَاقْتُلُوا أَوْ يَاصْلُبُوا أَوْ تَقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ
يَنْفُوا مِنَ الْأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي
الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ إِلَّا الَّذِينَ قَاتَلُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْرَأَ
عَلَيْهِمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ رَحِيمٌ

پہی سزا ہے ان کی جو لڑائی کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول
سے اور دوڑتے ہیں ملک میں فساد کرنے کو کہ ان کو قتل کیا
جائے یا سولی چڑھاٹے جاویں یا کاٹے جاویں ان کے ہاتھ، اور
پاؤں مخالف جانب سے یا دور کر دیئے جاویں اس حجہ سے یہ
ان کی رسوائی ہے دنیا میں اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب
ہے۔ مگر جنہوں نے توبہ کی تمہارے قابو پانے سے پہلے
تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

بدامنی پھیلانا، ہنسا کرنا ایسے الفاظ ہیں جن سے کفار کے حملے
رہنمی، ڈکیتی، ناحق قتل، لوٹ مار، شہری زندگی کی سبب مجرمانہ سازشیں
داخل ہو سکتی ہیں۔ لیکن اللہ اور رسول سے محاربہ کا مدلول ارتداد کے
سوا کوئی نہیں ہے اس لئے اس آیت کے نہ صرف عموم میں مرتد کی سزا
کا ذکر ہے بلکہ یحاربون اللہ ورسولہ کا منطوق ہی ارتداد ہے اور اس
کے منہ میں مرتد کے سوا کسی اور چیز کو رکھنا منہ کے مزے کو بگاڑ دینے
کے مترادف ہے۔ شاید فقہاء نے جو مرتد کے حربی ہونے کا فیصلہ کیا ہے

اس کا پس منظر قرآن حکیم کی یہی آیت ہے۔
 یہ حقیقت ہے کہ قرآن حکیم سوسائٹی میں مومن ہونے کے بعد ایمان سے
 گریز پائی کسی درجے اور کسی مرحلے پر بھی برداشت نہیں کرتا۔ غضب اور عذاب
 عظیم کو اس ناپاک طرز عمل کا ناگزیر نتیجہ قرار دیتا ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أَضْرَكَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ
 بِالْإِيمَانِ وَلَكِنْ مَن شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَجَاءَهُمُ غَضَبٌ
 مِنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ

جو کوئی منکر ہو اللہ سے یقین لانے کے پیچھے مگر وہ نہیں جس
 پر زبردستی کی گئی اور اس کا دل برقرار ہے ایمان پر اور لیکن
 جو کوئی دل کھول کر منکر ہوا سو ان پر غضب ہے اللہ کا اور
 ان کو بڑا عذاب ہے۔

قاتل مومن کے قرآن نے جو اوصاف ذکر کئے ہیں۔ غضب، لعنت،
 اور عذاب عظیم۔ اور ان اوصاف کی بنیاد پر اس کی سزا اگر قتل ہی تجویز
 کی گئی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مرتد کی سزا قتل نہ ہو جبکہ مرتد کے متعلق قرآن
 کے منہ بولے اوصاف وہی ہیں جو قاتل مومن کے یعنی غضب،

لعنت اور عذاب عظیم۔ اور پھر جس طرح قاتل مومن کی سزا قرآن میں
 الگ بیان نہیں کی گئی بلکہ اے کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ
 کے عموم میں داخل کیا گیا ہے۔ اسی طرح کیوں نہیں مانا جاتا کہ مرتد کی سزا
 اگرچہ خصوصاً نام لے کر بیان نہیں ہوئی بلکہ اسے بھی یجاد بون اللہ و
 رسولہ کے عموم میں داخل کر لیا گیا ہے۔

اصول کا طالب علم جانتا ہے کہ اوصاف لعنت کے درجے میں ہونے

ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جسگہ تو لتنت، غضب اور عذاب عظیم سے قاتل
 مومن کے لئے قتل کی سزا مقرر ہو جائے اور دوسری جگہ وہی اوصاف موجود ہوں
 مگر ان کو علت بنا کر معلول مقرر کرتے ہوئے بدن پر کپکپی طاری ہو جائے۔
 یہ تو قرآن کی ان دستوری سفارشات میں سے ہے جس کو ہر کتب
 فکر کے اساتذہ آغاز اسلام سے اب تک مانتے آئے ہیں۔ کیا آپ جرات
 سے خلافت قرآن یہ کہنے کو تیار ہیں کہ ایمان سے گریز پائی اختیار کرنے والا
 ملعون، مغضوب علیہ اور معذب بعذاب عظیم نہیں ہے؛ اگر ہے اور یقیناً
 ہے تو پھر اس سے پیدا شدہ نتائج کا انکار کیوں کیا جاتا ہے۔ کیا معافی
 و حقائق کی پامالی کے وقت میں الفاظ قابل اعتنا ہیں اور اللہ کے
 دین کے مقابلے میں اشخاص قابل رحم ہیں؛ قرآن نے تو زنا جیسی اخلاقی
 شناخت میں ایمان والوں سے مطالبہ کیا تھا اور امید باندھی تھی کہ اللہ
 پر یقین ہے تو اس کے حدود و احکام جاری کرنے میں کوئی پس و
 پیش نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ مجرم پر ترس کھا کر سزا روک لو یا اس میں
 کمی کر لو یا سزا دینے کا ایسا غیر موثر طرز اختیار کرو کہ سزا سزا نہ ہے۔ قرآن

میں ہے۔
 وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ
 بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔

اور نہ آوے تم کو ان پر ترس اللہ کے حکم چلانے میں اگر تم یقین
 رکھتے ہو اللہ پر اور پچھلے دن پر۔

سزا کے اعتبار سے ارتداد بہر حال ارتداد ہے مگر ذات کے لحاظ
 سے اس میں کچھ درجات ہیں

اسلام کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ کسی بھی نبوت کا انکار نہ کیا جائے۔ بلا تفریق مکان و زمان حق کی روشنی کا جہاں بھی اور جس جگہ بھی چمکارا پڑا ہے اسے مانا جائے کسی ایک پیغمبر کا انکار بھی سب نبوتوں کا انکار ہے اور یہ خدا اور رسول کے درمیان ناقابل معافی تفریق ہے۔ قرآن نے جس قوت کے ساتھ اس پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے وہ قرآن ماننے والوں کے سامنے ہے۔ وہ کہتا ہے۔

اولئك هم الكافرون حقا

یسے لوگ یہی ہیں اصل کافر۔

اسلام کی یہی خصوصیت ہے جس سے قوموں، وطنوں، طبقوں، خاندانوں، اور شخصوں سے نکل کر اسے بین الاقوامی مقام حاصل ہوا ہے۔ ذرا غور فرمائیے۔ کہ یہودی بننے کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ کی نبوت کا اقرار کرے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ حضرت عیسیٰ کا انکار کرے۔ عیسائی ہونے کے لئے صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ کو مانے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرے۔ برخلاف ایک مسلمان کے کہ اس کی روح نبوت کے باب میں انکار سے آشنا نہیں ہے اس کا نیشنل ماثو یہ ہے کہ

لَا تَفْرَقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رَسُولِهِ

ہم جدا نہیں کرتے کسی کے پیغمبروں میں سے۔

بالفاظ دیگر قرآن کے نزدیک ہر نبوت کا اقرار اسلام اور کسی ایک نبی کا انکار بھی پورے اسلام سے انحراف ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ بھی سن لیجئے کہ جیسے ایک نبی کا نبی ہوتے ہوئے انکار کفر ہے ٹھیک اسی طرح کسی پیغمبر نبی کو نبی ماننا بھی کفر ہے۔ نبی نہ ہوتے ہوئے نبی کی ڈینگ مارنا سب سے بڑا ظلم ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ
شَيْئًا وَمَنْ قَالَ سَأُنزِلُ مِثْلَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو باندھے اللہ پر بہتان یا کہے مجھ پر وحی
آئی اور اس پر وحی نہیں آئی کچھ بھی اور جو کہے کہ میں بھی اتارنا ہوں
خصل اس کے جو اللہ نے اتارا۔

اگر اسلام ہی ہے کہ کسی ایک نبی کا بھی انکار کیا جائے تو فطر تا یہ سوال خود
بخود پیدا ہوتا ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر نبوت کا سلسلہ
قائم رہے تو قرآن کا ایک مکمل ضابطہ حیات ہونے کی حیثیت میں اولین فرما
یہ ہے کہ وہ اجراء نبوت کے متعلق ایک واضح پالیسی کا اعلان کرے مگر قرآن
پر مٹنے والے جانتے ہیں کہ اس نے اس ادعاء کے باوجود کہ وہ حیات کا
تعمیلی ضابطہ ہے اور اس اعلان کے باوجود کہ ایک نبی کا انکار بھی اسلام سے
علیحدگی ہے۔ رسالے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی یہ بات کہ جناب محمد رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت باقی ہے ملاحظہ یا اشارہ بیان نہیں کی۔ بلکہ اس
کے برعکس توحید کے بعد پوری وضاحت اور پوری صفائی کے ساتھ دو باتوں کو
پیش کیا ہے اور وہ یہ ہیں کہ۔

الف :- محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ختم للناس ہے۔ اور
ب :- محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجود کی گود میں خدا کی مرضی کے آخری
نمائندے ہیں۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے بعد کسی اور نبی کو ماننے کی گنجائش نہیں اور یہ ان ضروریات میں
میں سے ہے جن کا انکار کفر اور قطعاً کفر ہے۔ اس کا انکار قرآن و سنت

کی کھلم کھلا بغاوت ہے اور پورے اسلام سے ارتداد ہے۔ تازغ گواہ ہے کہ اسلام کو سب سے پہلے جس ارتداد سے سابقہ پڑا اور جس کے بند و بست کے لئے فوراً نبوت کے شہید جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خود میدان میں آنا پڑا۔ وہ اسی بنیاد پر اٹھا پڑا ارتداد عقدا۔

خیر یہ تو ضمنی بات تھی، بتانا یہ چاہتا ہوں کہ ارتداد کی سزا قتل قرآن کا مطالبہ ہے، سنت کی پکار ہے اور صحابہ کرام کا اس پر عمل ہے۔
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

بنام جناب خواجہ محمد مسیح صاحب، سیالکوٹ

اس تحریر کی تقریب یہ ہے کہ ایک روز صبح تقریباً گیارہ بجے خواجہ محمد مسیح صاحب اپنے دوسرے رفقاء کی معیت میں جیل دزیر کی حیثیت سے تشریف لائے۔ پاس بیٹھ گئے اور مجھ سے یوں مخاطب ہوئے کہ مولانا! قرآن میں تو مرتد کی سزا کا ذکر نہیں ہے اس وقت کی گفتگو تو آئی گئی ہوئی مگر رات کو سووتے وقت ہنا نخانہ دماغ میں خواجہ صاحب کی بات چٹکیاں لیتی رہی۔ اکٹھا اور سب اچھا کی فضا میں بیٹھا تنہا لکھتا رہا۔

ڈیڑھ لاکھ جیل سیالکوٹ

۲۲ جنوری ۱۹۵۲ء

معجزہ اگر دلیل نبوت ہے تو دلیل اور مدلول میں مطابقت علمائے کرام کی بتائی ہوئی ایک سے زیادہ راہیں، معجزہ کے دلیل نبوت ہونے پر ایک مثال، معجزہ کے دلیل نبوت ہونے پر مشہور اہل حدیث مولانا محمد حسین بٹالوی کے نام شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا خط، اثبات نبوت کے لئے صرف معجزہ ہی نہیں بلکہ اور بھی پائے ہیں، صحیح بخاری کے آغاز میں ان پیمانیوں کا تذکرہ، نبی کی تعریف اور حدیث انما الاعمال کے آغاز کتاب میں لائے کی توجیہ مصداق اور مظاہر کی حقیقت، جیسے نبی افضل خلق ہوتا ہے ویسے ہی متنبی ارذل خلق ہوتا ہے۔ ہر جھوٹ نمایاں ہوتا ہے، جھوٹی دیانت جھوٹی امانت، جھوٹی نصیحت اور جھوٹی محبت کون سی چیز ہے، جسے جاننے والے نہیں جانتے۔ نبی شناسی کا ایک ذریعہ خود انبیاء کی ترازو ہے، صرف خبر نہیں بلکہ قرآن بھی علم کے لئے کافی ہیں۔

علیہم السلام

عزیز المعزیز! تم نے بارہا معجزے کے دلیل نبوت ہونے کے بارے میں دریافت کیا۔ آج بیٹھے بیٹھے تم یاد آئے اور ساتھ ہی تمہاری باتیں بھی یاد آگئیں۔ جی چاہا کہ تم سے باتیں کروں۔ مشہور یہی ہے اور کلام کی کتابوں میں لکھا بھی ایسا ہی ہے کہ الدلیل علی نبوة الانبیاء المعجزات۔ علماء علم کلام نبوت کو ثابت بھی اسی راہ سے کرتے ہیں اور ہے بھی یہی بات یہ امر آخر ہے کہ اگر معجزہ

دلیل نبوت ہے تو دلیل اور دلول میں یا دعویٰ اور شہادت میں مطابقت کیلئے؛
 علمائے کلام نے اس گتھی کو سلجھانے کی مختلف راہیں بتائی ہیں۔ مثلاً یہ کہ معجزہ
 ہے تو بظاہر ایک مظاہرہ عمل مگر درحقیقت یہ گفتار کے قائم مقام ہے کیوں کہ
 اس راہ سے نبوت کے بارے میں جو علم حاصل ہوتا ہے اس کا زیادہ تعلق
 ماحول، گرد و پیش اور ان حالات و واقعات سے ہے جن میں معجزے کا ظہور ہوتا
 ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے شرمندگی شرمندہ کیلئے، غصہ غصے والے کیلئے
 کہ دونوں کا وجود لفظوں میں کچھ نہیں ہوتا۔ مگر کیفیت اور حالت جو ان کو پیش
 آتی ہے وہ اس کے وجود کی شہادت ہے۔ اسی طرح معجزے کا عمل
 وجود پذیر ہوتا ہے اور یہ عمل اللہ جل شانہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ ہوتا ہی
 ہے عادت الہیہ کے خلاف اور دعوائے نبوت کی خاطر ہوتا ہے۔ دعویٰ نبوت
 کو معجزے کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ یہ میرا عمل ہے بلکہ وہ تو کھلے
 لفظوں میں مطالبہ پر بھی کہتا ہے

إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ

جن حالات و کوائف میں یہ مظاہرہ عمل ہوتا ہے دراصل وہ ہی معجزے
 کو دلیل نبوت بناتے ہیں۔ ان حالات و واقعات کا دباؤ ہی ماننے والوں
 کو ماننے پر مجبور کرتا ہے۔ علمائے کلام نے اسے ایک مثال کے ذریعے
 یوں سمجھایا ہے کہ — بادشاہ نے دربار لگایا ہے۔ دربار لوگوں سے
 کچھ کچھ بھرا ہوا ہے، ہر شخص اپنی اپنی جگہ بیٹھا ہے۔ اچانک بادشاہ کے
 خواص میں سے ایک شخص درباریوں کے سامنے آکر حالات حاضرہ پر
 تبصرہ شروع کرتا ہے اور لوگوں کو لاقین دلاتا ہے کہ میں بادشاہ کا قاصد
 ہوں اور معتمد ہوں۔ بادشاہ ہی کی موجودگی میں بادشاہ کی طرف رخ کر کے

کتاب ہے۔ عالجاً! اگر میں درست کہہ رہا ہوں تو ان کے سامنے میرے کہنے کے مطابق ذرا عادت کے خلاف کیجئے اور نیچے شریفینے آئیے۔ بادشاہ اپنے کردار سے اس کی تصدیق کرتا ہے۔ الفاظ کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ مگر بادشاہ کے عمل کا مظاہرہ مقرر کے قاصد ہونے کا حاضرین کو یقین دلاتا ہے اور وہ کھلے بندوں اقرار کر لیتے ہیں کہ ہاں یہ بادشاہ کا قاصد ہے اور اس کا فرمودہ بادشاہ ہی کا فرمودہ ہے۔ دعویٰ و شہادت یا دلیل و مدلول میں مطابقت پیدا کرنے کی یہ راہ علامہ ابو العالی نے بتائی ہے۔ قاضی ابوبکر الباقانی نے اسے الطريقة المرصیۃ کہا ہے۔ اور بقول حافظ ابن تیمیہ "امالی" میں ابوالحسن کا میلان بھی یہی ہے۔ احناف میں سے ابو محمد صابونی بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ ان کا ایک نہیں بلکہ متعدد راہیں سوچی گئی ہیں۔ چند در چند تجاویز ہیں۔ تفصیل دیکھنی ہو تو حافظ ابن تیمیہ کی "النبوات" دیکھو اور اجمال چاہتے ہو تو شرح العقیدۃ الاصفہانیہ کا مطالعہ کرو۔ اور اگر دل کے ساتھ ذہن و دماغ کا بھی سکون درکار ہو تو اس موضوع پر حضرت مولانا محمد قاسم نالوتوی کا وہ گرامی و تدریکتوب دیکھو جو اسی موضوع پر مولانا محمد حسین بٹالوی مدیر رسالہ اشاعت السنۃ کے نام لکھا گیا ہے۔ بڑی معلومات ہیں۔ مسائل۔ دلائل اور لطائف کا اچھا ذخیرہ ہے۔ میں اس وقت تم سے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ دلیل و مدلول کی مطابقت کی کہانی نہیں اور نہ یہ کہ معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں۔ یہ تو سب ہی جانتے اور مانتے ہیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ صرف معجزہ ہی پیمانہ نہیں ہے یہاں اور بھی پیمانے ہیں جن کی مدد سے نبی کا نبی ہونا معلوم ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ لا یحصل العلم بالنبوة الا بطریق المعجزات دون غیرها

یہ ان کا ذاتی خیال ہے اور اپنا تجربہ، ورنہ کبھی بات نہ یہ کہے کہ "الحاجر بالنبوة يحصل بطريق متعددة". تمہارے "الجامع الصحیح المسند الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ایامہ و سننہ" کا بارہا مطالعہ کیا ہوگا اور کتاب الایمان سے پہلے بڑی لمبی لمبی بحثیں پڑھی ہوں گی مگر کبھی خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ امام صاحب کتاب الایمان سے پہلے بدرہی کے عنوان کے تحت مختلف احادیث کیوں لائے ہیں؟ اور اپنے مخالفوں کے ذہن میں کیا بات اتارنا چاہتے ہیں، افسوس کہ خط کا محدود دائرہ تفصیل سے مایوس ہے۔

ورنہ جی چاہتا ہے کہ سینہ بخاری سے اپنی ہوتی علمی طاقت کو ان سینہ چاک ریزہ گروں کے سامنے رکھوں جو ادب سے محروم اپنی خلوتوں میں حضرت امام بخاری پر زبان رازیاں کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ارشادات نبوت کی نگرانی میں ان کی جلالت شان کیا ہے؟ مگر کیا گروں اپنا جہہ بعناطی، علم کی کمی اس راہ میں سنگ گراں ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ امام بخاری نے بدرہی کے عنوان میں "رسول اللہ کے اصناف سے نبوت و رسالت کی تعریف کی ہے، تعریف کو بدل کر لے کے لیے آیات وحی میں سے سورہ مائدہ کی آیت - انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح و النبیین من بعدہ الخ کا انتخاب کیا صرف یہ بتانے کے لیے نہیں کہ وحی ایک مشترک المعانی لفظ ہے بلکہ یہ سمجھانے کے لیے کہ انبیاء دو طرح کے ہوتے ہیں - مؤسسین، مجددین، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تعلق اول الذکر قسم سے ہے، نبوت کی تعریف کے بعد ضرورتاً نبوت بتانے کے لیے مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات لائے ہیں، سمجھایا ہے کہ اقدار ہوں یا افعال، اعمال ہوں یا اقوال، ان کی قیود و قیمت اور فائدیت کا دار و مدار صرف وہ چیزیں ہیں ایک روح و دوسرے ڈھانچہ، روح عمل کو

مصلحت اور عمل کے ڈھانچے کو مظاہر کہتے ہیں۔ لہذا جیسے اعمال اخلاق کیلئے مصادر ہیں اللہ کی رضا شرط ہے ایسے ہی مظاہر ہیں اللہ جل شانہ کی وحی سے موافقت ہونی چاہیے اور بس۔ یہ متعین ہو جانے کے بعد کہ رسول وہ ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیغمبر ہیں پیغمبر بھی نبی مرسس۔ اعمال کے مصادر میں اللہ کی رضا اور مظاہر میں اللہ کی وحی پیش نظر ہونی چاہیے۔ اب سمجھنا یہ چاہتے ہیں کہ وحی کیا ہوتی ہے؟ مگر ابادتاً اسے چھوڑ کر کیفیت دالی حدیث لے کر آئے ہیں۔ صرف یہ بتانے کے لئے کہ وحی وہ معلوماتی ذریعہ ہے جو ہمارے ادراک کی گرفت میں نہیں آسکتا ہے۔ یہ اللہ کی دین ہے۔ محنت اور ریاضت سے حاصل نہیں ہوتا۔ ہم کچھ جان سکتے ہیں تو وہ وحی نہیں بلکہ وحی کی آمدی کیفیت ہے اور وہ بھی صرف تمثیل کے درجے میں۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث سے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد آغاز وحی میں نبوت سے پہلی زندگی ماہی شناسی کا اخلاقی اور نوعی پیمانہ بتانے کے لئے حدیث عائشہؓ اور شخصی پیمانہ بتانے کے لئے دربارہ نقل کی لمبی داستان لاکر کتاب کے دیباچہ کو ختم کیا ہے۔ درمیان میں یہ بتانے کے لئے کہ نبی بننے میں خود نبی کی ریاضت اور محنت کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث لے کر آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی لانا اور وحی کے ذریعہ نبی بننا تو بڑی بات ہے۔ نبوت ملنے اور وحی آنے کے بعد بھی خود وحی کو حافظہ میں اپنی قوت سے محفوظ رکھنا بھی نبی کی دسترس سے باہر ہے۔ میں صرف اشارات کر رہا ہوں اور جان کر رہا ہوں۔ کہ خط کا محدود پیمانہ تفصیلات کا متحمل نہیں ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نبی شناسی

کافر بجز وہی پیمانہ نہیں ہے اور بھی ذرائع ہیں میرے خیال ناقص ہیں امام بخاری نے کتاب کے دیباچہ میں اپنی ذرائع اور وسائل کی طرف اشارات کئے ہیں۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں اور روں کا پتہ نہیں — حافظ ابن تیمیہؒ بھی ان اکابر میں سے ہیں جو صرف معجزے ہی کو نبی شناسی کا پیمانہ نہیں مانتے بلکہ اس کے علاوہ دوسرے ذرائع کو بھی پیمانوں کے درجے میں بتاتے ہیں۔ شرح العقیدۃ الاصفہانیہ میں بڑے زور شور سے تفصیلی بحث کی ہے۔ امام غزالی "المنقذ من الضلال" میں اس خیال کے علمبردار ہیں مگر کھوٹی سی تزییم کے ساتھ۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جیسے عقل آدمی میں منجملہ دیگر انعامات کے ایک انعام الہی ہے جس کے ذریعے ان معقولات کا ادراک کر لیتا ہے جو اس کی گرفت سے باہر ہیں۔ ایسے ہی نبوت بھی ایک انعام ہے جس کے ذریعے صاحب نبوت ان غیبی حالات کا پتہ لے لیتا ہے جو عقل کی دسترس سے باہر ہیں فرماتے ہیں۔

فالنبوۃ ایضاً عبارة عن طور یحصل فیہ عین لہانور یتظہر

فی نورھا الغیب و امور لا یدرکھا العقل

یہ بتانے کے بعد شخص مقرر کے نبی معلوم کرنے کے لئے احوال و کوائف مشاہدہ، تواتر اور تسامع کو سامنے رکھ کر بتایا ہے کہ ہیں تو یہ ذرائع مگر ان ذرائع سے صرف وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو جانتا ہو کہ نبوت کیا ہے، اگر نبوت معلوم ہو تو ان ذرائع کی مدد سے نبی معلوم ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ۔

اذ عرفت الطب والفقہ یمکن ان تعرف الفقہاء والاطباء

بمشاهدة احوالہم و سماع اقوالہم۔

بات تو بڑی سادی ہے مگر ہے یہ پیمانہ بڑا کٹھن۔ یہ تو ان ہی کے بس کا روگ ہے جو نبی سے پہلے خود نبوت کو جانتے اور پہچانتے ہوں۔ زیادہ سے زیادہ

کچھ خواص ہی ایسے ہونگے جو طریق تصوف کے مطابق امام غزالیؒ کی طرح ایک قسم کا ذوق حاصل کر کے نبوت کو جانیں۔ اور نبوت کی مدد سے نبی کو پہچانیں۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں واقعات کی چھان بین کے لئے سچا اور جھوٹا معلوم کرنے کے کچھ ذرائع رکھتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ نبی کو پہچاننے کا معجزے کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ ہو۔

جیسے یہ حقیقت ہے کہ نبی افضل خلق ہوتا ہے ایسے ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ منتہیٰ ارذل خلق ہوتا ہے۔ عام نگاہیں افضل اور ارذل میں ضرور امتیاز کرتی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ کرنے والوں نے کیا ہے۔ قبیلہ ثقیف کے ایک لیڈر نے نبی شناسی کا یہی پیمانہ بتایا ہے۔ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ثقیف کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کی تو ان کے ایک لیڈر نے آپ کو مخاطب کر کے کہا کہ میں آپ سے کوئی بات نہ کروں گا۔ آپ کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں آپ سچے ہیں تو نبی افضل خلق ہوتا ہے۔ اس لئے آپ بہترین ہیں۔ آپ کے منہ آنا آپ کی توہین ہے۔ اور اگر معاذ اللہ اس کا عکس ہے تو منتہیٰ ارذل خلق ہوتا ہے۔ اسے منہ لگانا میری توہین ہے۔ حسان بن ثابت نے کسی پتے کی بات کہی ہے۔

لولا تکتن فیہ آیات بینة کانت بدیہة قانیک بالخیر

ہے بھی یہ واقعہ کہ جھوٹا بہر حال جھوٹا ہے۔ موٹی سی سمجھ والا آدمی جھوٹے کے جھوٹ، فریب، نادانی اور بدکاری کو تارڑ سکتا ہے اور سچا بہر حال سچا ہے سچائی، علم و دانائی، نیکی و پارسائی اور خیر و تقویٰ کی اس میں نشاندہی ہو سکتی ہے۔ جو رسالت کے مقام پر کھڑا ہوگا وہ بہر حال لوگوں سے خطاب

کرے گا۔ کچھ باتوں کا پتہ دے گا۔ کچھ احکام سنائے گا۔ کسی کو دیکھ کر وار کا مظاہرہ کرے گا۔ اس کا اپنی باتوں، اپنے احکام، اپنے کردار سے صادق ہو یا معلوم ہو جائیگا۔ کیونکہ راستی کا لازم ٹکلی اور جھوٹ کا خاصہ بدکرداری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ خود قرآن ہی کا بیان کردہ پیمانہ ہے۔

قل هل انبشکم علی من تنزل الشیاطین تنزل علی کل اقلاب انیم

یلقون السمح واکثرهم کاذبون

آیت بتاتی ہے کہ شیطانی وحی جھوٹوں پر ہوتی ہے۔ بد معاشوں پر آتی ہے۔ راست گوئی، امانت، پاک بازی اور خداترسی وہ اوصاف اور خوبیاں ہیں۔ جو بچپن ہی سے آپ کی ذات گرامی میں اس طرح پیوست تھے کہ یگانے، اور یگانے مانتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے آپ کا لقب ہی معاشرے میں الصادق الامین ہو گیا تھا۔

نبوت ہی پر کیا موقوف ہے ہر شخص اپنے اپنے ماحول میں سچے اور جھوٹے کو پہچانتا ہے۔ جھوٹی امانت، جھوٹی نصیحت اور جھوٹی محبت کون سی چیز ہے جسے سمجھنے والے نہیں سمجھتے اور دیکھنے والے نہیں دیکھتے۔ پر جھوٹی رسالت کو نہ سمجھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی صرف راستی ہی پیمانہ نہیں ہے بلکہ نبی کو پہچاننے کا ایک اور ذریعہ ہے یعنی یہ کہ نبوت جن علوم و اعمال کی دعوت لے کر اٹھتی ہے۔ ضروری ہے کہ خود صاحب نبوت ان کا اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں علم بردار ہو۔ ہر ایک شخص سے اس کی دعوت کی ترازو میں رکھ کر تول سکتا ہے اور تولنے کے بعد فیصلہ کر سکتا ہے کہ اپنے دعویٰ نبوت میں مدعی کہاں تک سچا ہے نبوت کی تاریخ بتاتی ہے کہ نبوت زمانہ آدم سے آتی رہی ہے اور انسانیت میں خدا کی مرضی کی نمائندگی ہوتی رہی ہے۔ ہر شخص نبوت اور اس کی دعوت سے واقف

ہے۔ ایسی حالت میں اگر بالفرض اگر ایک شخص نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھا اور معاشرے کو اس نے ایسی دعوت دی جس میں شرک، کفر، فواحش، ظلم و کذب اور بدکاریوں کی ترغیب ہے تو کیا تاریخ نبوت کے کسی طالب علم کو اس کے جھوٹے ہونے میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟ اور کیا کوئی بیوقوف ایسے شخص سے کسی معجزے کا مطالبہ کر سکتا ہے؟ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ خبر — صرف خبر کے درجے میں اگر اپنی پشت پر قرآن اور دلائل کی قوت رکھتی ہے تو نہ صرف قابل پذیرائی ہے بلکہ علم و یقین کا بھی فائدہ دیتی ہے۔ محققین کا مذہب یہی ہے کہ خبر ہی ہمیں بلکہ صرف قرآن بھی علم کے لئے کافی ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پنامہ مولوی حافظ محمد شریف قاسمی مالک مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ

داعی کی صدا یہ نہیں ہوتی کہ دے کوئی اللہ کا بندہ بلکہ یہ ہوتی ہے کہ
 لے کوئی اللہ کا بندہ، دعوت میں زبان کی شیرینی کا جواب عمل کی تلخی سے
 موت کو سامنے دیکھ کر اسلام کے داعی کا جواب، دعوت خدا کے
 روٹھے ہوئے نبردوں کو منانے کا نام ہے۔ عروہ کی "صاحب یسین"
 سے تشبیہ، عقیدت کا بوجھ مشکل ہی سے اترتا ہے۔ تقیف تقیف
 کا مسلمان ہونے کے باوجود لات سے پیار، تقیف کا مطالبہ اور
 حضور انورؐ کی ترویج، حبیب بخار کا دعوتی کارنامہ اور قرآن میں اس کا
 ذکر، نہ ماننے والوں کو پیغام پہنچانا تبلیغ اور ماننے والوں میں جاننے
 سمجھنے اور برتنے کے لئے تنگ و دو کا نام "تذکیر" ہے، تبلیغ اور تذکیر
 دونوں کے لئے جان کھپانے، جان تھک کرنے اور محنت و مشقت
 کرنے کا نام جہاد ہے، صحابہ میں پہلی خاص اور دوسری عام تھی،
 صحابہ میں تذکیر کا ایک تاریخی بصیرت افروز واقعہ، صحابہ میں فرض کا

احساس

علیہ السلام

جی نی اللہ مرزا صاحب !

ہم مولوی ہیں اور مولوی ہونے کا سنا داسا مطلب یہ ہے کہ گویا ہم اسلام آشنا
 ہیں۔ عوام اس کشتی کے سوار ہیں۔ کہاں جانا ہے؟ یہ جاننا عوام کا کام نہیں ہے
 کہاں نہ جانا ہے؟ یہ جاننا ہمارا کام ہے۔ صحابہ مولوی نہ تھے مگر اسلام کی
 کشتی کی نگرانی اور اس کی رکھوالی کا کام جس دل سوزی سے کرتے تھے۔ اس
 کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ اس آئینے میں جب اپنا چہرہ دیکھنا

ہوں تو ندامت سے سر جھک جاتا ہے۔ بومیری نے شاید میرے ہی حالات کی نقاب کشائی کی ہے۔

استغفر اللہ من قول بلا عمل لقد نسبت بلاء نسلاً لذی عقم

میں بغیر عمل سے اللہ کی جناب میں بخشش مانگتا ہوں۔ تعلق پیدا کر چکا ہوں میں اس کے ساتھ ایک بانجھ سے۔

امرتك الخیر لکن ما ائتیت به وما استغفرت فما قولى لك استقم

تجھے میں نے نیکی کا حکم دیا لیکن خود میں نے اس پر عمل نہیں کیا جب میں خود ٹھیک نہیں ہوں تو پھر کیا ہے تیرے لئے میرا کہنا کہ ٹھیک ہو جا۔

ہجرت کا نواں سال اور رمضان کا مہینہ تھا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے مدینے واپس تشریف لارہے تھے۔ ابھی مدینے نہ پہنچے تھے راستہ ہی میں تھے کہ اچانک چھپے سے ایک شخص آیا۔ آئے والے کا نام عروہ ہے قبیلہ ثقیف کی وجہ سے ان کو ثقفی کہتے ہیں۔ باپ کا نام مسعود ہے۔ باپ اور خاندان کی نسبت سے عروہ ابن مسعود ثقفی ہیں۔ آئے اور آتے ہی مسلمان ہو گئے اور مسلمان ہوتے ہی مسلمانوں کی خاطر قربانی یا اپنی مسلمانوں کی عمل کی دنیا میں شہادت پیش کرنے کے جوش میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے اسلام کے داعی کی حیثیت پیسے میرے خاندان میں روانہ کیجئے۔ ابن ہشام نے ابن اسحاق کے حوالہ سے درخواست کے الفاظ بتائے ہیں :-

وسألت ان یرجم الی قومہ بالاسلام

آپ سے درخواست کی کہ مجھے دعوت اسلام کے کر میری قوم میں روانہ کر دیجئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ عروہ کو حالات کی ناخوشگوار کی

طرف متوجہ کیا اور بتایا کہ ان میں ابھی اس کے لئے فضا سازگار نہیں مگر محبت
عقل کی عدالت سے نہیں پوچھتی۔ محبت کا سر جوش پوش باختگی کا پیغام ہوتا ہے
لوٹے اور بڑے دروسے لوٹے

انا احب الیہم من اباہم

یا رسول اللہ میں قوم کے نوجوانوں میں بہت محبوب ہوں۔
ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ واقعی عروہ کھتے بھی قوم کے چہیتے اور برگزیدہ۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے دیوانہ کی منہ مانگی کرامت کو احترام کی
نگاہوں سے دیکھ کر قبول کر لیا۔ چل دیئے۔ کچھ قوم میں اپنے مقام کی بلندی سے
اس یہی تھی کہ مخالفت نہ ہوگی۔ ابھی اس پر دعوت اسلام کا پیالہ ہاتھ میں لیکر
لوگوں کو پکارنا شروع کر دیا۔ پکاریے نہ تھی کہ دے کوئی اللہ کا بندہ۔ بلکہ آواز یہ تھی کہ
لے کوئی اللہ کا بندہ۔ ایک روز بالا خانے پر کھڑے ہوئے جھروکے سے سینہ باہر
کئے لوگوں کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔ کہ سننے والوں نے زبان کی شیرینی
کا جواب تل کی تلخی سے دینا شروع کیا اور ہر طرف سے تیر اندازوں نے تیر سلائے
قدرت کا کرنا کہ ایک تیر نے عروہ کو پہچان لیا اور ابلیس اپنی تمنا سے ہمدوش ہو
گیا۔ خون سے غسل کی حالت اچھے اچھے دلیروں کیلئے پوش رہا ہوتی ہے پاؤں
اکھڑ جاتے ہیں مگر عروہ کا نشہ اور تیز ہو رہا تھا۔ کسی سر مچھرے نے پوچھ لیا۔
ما تری فی دمک؟ تیر اپنے خون کے بارے میں کیا خیال ہے)

پورے استقلال اور بھرپور متانت کے ساتھ اسلام کے اس داعی نے جو
لوگوں کو جواب دیا۔ وہ سننے اور سمجھنے کے قابل ہے

کرامۃ اکرمی اللہ بہا وشہادۃ ساقھا اللہ الی داہن یشام۔ نانا لعاہ

ایک عزت ہے جس کے ساتھ اللہ نے مجھے معزز بنایا اور شہادت

سب سے حسین کو اللہ نے یزیدی طرف روانہ فرمایا۔

یہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ اس حادثہ کی اطلاع چیب جناب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو اپنے اسلام کے اس شیدائی کا مقام دنیا والوں کو بتایا

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ دعوت کا کام یعنی خدا کے روٹھے ہوئے

بندوں کو خدا یاد کرانا اور خدا ہی کی یاد پر ان کو آمادہ کرنا اللہ جل شانہ کے یہاں بہت

قیمتی ہے۔ اتنا قیمتی کہ اس کا اندازہ لگانا بھی دنیا والوں کے بس کا کام نہیں۔ آپ

نے فرمایا کہ — وہ نے اپنی قوم میں وہی کام کیا ہے جو صاحب یسین نے اپنی

قوم میں کیا تھا۔ "صاحب یسین" کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دور کے

اشارہ سے وہ کا اونچا مقام بتایا ہے۔ یہی بات سمجھنے کی ہے۔ ابن ابی حاتم نے

عبدالملک بن عمیر کے حوالہ سے واقعہ کے اس حصہ کی ابن اسحاق سے زیادہ تفصیل

بتائی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عروہ نے لشکر توحید سے مخمور ہو کر کس

جرات مندانہ عزیمت سے ماحول کو سر کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ عبدالملک کا بیان ہے

کہ عروہ دعوت کا پیمانہ لے کر چلے۔ راستہ میں لات و عزی تھے۔ آپ نے دولوں

کو ابراہیمی اسوہ پر عمل کرتے ہوئے مخاطب کر کے کہا۔

لَا صِبْغَ لَكَ غَدًا بِنَايَسُوكَ

یہ کل کی صبح تیرے لئے میرے ہاتھوں غم کی صبح ہے۔

یہ بات خلوت میں نہیں بلکہ شہراہ عام پر بیانگِ دل کی تھی قبیلہ لقیف

کے بوٹھے جوان اور بچے موجود تھے۔ ان کے مجمع میں لات کے بالے میں منہ

سے یہ بات نکالنی جان کو توج کرنے اور جو کھوں میں ڈالنے کے مترادف تھا

کون نہیں جانتا کہ یہی لقیف جب چند ماہ کے بعد مسلمان ہونے کے ارادے

سے مدینے پہنچے اور مسلمان بھی ہو گئے۔ مسلمانوں کے باوجود انہوں نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مطالبہ کیا تھا۔ ان میں بنیادی مطالبہ ہی تھا۔

ان ید عہد المطاعینہ وہی اللات لا یهد مہا ثلاث سنین

تین سال تک ہمارے طاغیہ کو کچھ نہ کہا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے انکار پا کر منت سے بولے۔ کہ

اچھا ایک سال رہنے دیجئے۔ یہ بھی نا منظور ہوا تو بڑی بجا جت سے بولے کہ اچھا

ایک ہی مہینہ چھوڑ دیجئے۔ مگر نبوت نے اس مانگ کو بھی ٹھکرا دیا۔ اندازہ لگائیے کہ

جو مسلمان کو قائم رکھنے میں لات سے یہ بستگی قائم رکھتے ہیں تو جو کفر کی گود میں پلے ہوئے ہیں ان کی عقیدت

کا کیا حال ہوگا۔ آہ قربان جائیے۔ عواقب سے بے نیاز ہوو گے۔

عبدالملک ہی کا بیان ہے کہ عروہ ابن مسعود نے برسر عام دعوت شروع کر دی

اور اعلانیہ سب کو پکار پکار کر یہ کہنے لگے۔

ان اللات ثلاث وان العزى لا یهدى اسلموا تسلموا

منہ سے یہ بات تین دفعہ نکلی کہ تیر اندازی میں تیر کا نشانہ بن گئے۔ واقعہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا۔

هذا مثل كمثل صاحب یسین قال یا بیت قریمی یعلمون

بما عفرلی بی وجعلنی من المکرهین

اس کی مثال صاحب یسین جیسی ہے جس نے اپنی قوم سے

کہا تھا۔ اے کاش! میری قوم جانتی کہ میرے رب نے مجھے کیا

بخشش عطا فرمائی ہے اور مجھے کیسے عزت والوں میں سے

بنایا ہے۔

جن صاحب یسین کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ

فرمایا۔ ان سے وہ بزرگ مراد ہیں جن کا قرآن نے سورہ یسین میں کاروبار

دعوت کے سلسلے میں ذکر کیا ہے۔ عبداللہ بن عباس نے ان کا نام حبیب اور پیشہ نجاری بتایا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ کسی بستی میں لوگوں کو خدا کی طرف بلائے کیلئے خدا نے پہلے اپنی مرضی کے دو ممتاز مذہب روانہ کئے بستی والوں نے دونوں کو جھٹلایا۔ تو ایک ان دونوں کی امداد کے لئے مقرر ہوا۔ تینوں نے مل کر اور جم کر یہ دعوت پیش کی۔

إِنَّا إِنَّا نِيَكُم كَمَا نَسَلُونَ - لَقِينَا بِمِثَارِي هِيَ طَرَفِ يَحْمِي

گئے ہیں۔

لوگوں کا جواب یہ تھا۔ کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ خدا نے کچھ بھی نازل

نہیں کیا تم تو پائے ہی جیسے آدمی ہو۔ داعیوں نے خدا کا واسطہ دے کر اپنی صداقت کا یقین دلایا اور کہا کہ ہمارا کام کالوں تک پہنچانا ہے اور بس لوگوں نے ان کو جو جواب دیا یہ تھا کہ تمہارا یہ وجود ہمارے لئے ایک پیغامِ نحوست بن کر آیا ہے۔ زندگی کا مزہ کرنا ہو گیا۔ ہر طرف مصیبت ہی مصیبت سے بستی کی بستی گرفتار بلا ہے۔ اگر تم باز نہ آؤ گے تو سنگ سار کر دیئے جاؤ گے اور پائے ہا محقوں تمہیں دردناک تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔

دعوت دینے والوں نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا، نحوست کے

اسباب تو تمہاری ہی غلیظ زندگی کے پیدا کردہ ہیں۔ رہا قتل و سنگ ساری

کی دھمکیاں، تو کیا یہ اس کا بدلہ ہے کہ تم میں تزکیہ و دعوت کا کام کیا

گیا ہے اور تمہیں بتایا گیا ہے کہ ایک اللہ جل شانہ کو مانو۔ اور اپنی

زندگی کے سارے نیاز مندانہ کاموں میں صرف اسی کی لو لگاؤ۔ سچ

یہ ہے کہ تمہاری قومی زندگی کے سارے ہی گوشے عدل و راستی سے بٹے

ہوتے ہیں۔ گفتگو پبلک اور ان داعیوں میں اسی مرحلہ پر تھی۔ اور

پبلک آپے سے باہر ہو کر ان لوگوں کا کام تمام کرنا چاہتی تھی کہ اچانک ایک شخص آیا۔

جاء رجل من اقصى المدينة يسعى قال يا قوم اتبعوا
المرسلين اتبعوا من لا يسئلكم اجرا وهم
مهتدون

آیا ایک شخص شہر کی طرف سے دوڑتا ہوا کہا لوگو! رسولوں
کی پیروی کرو اور لوگو! پیروی کرو اس شخص کی جو تم سے
مزدوری نہیں مانگتا۔ اور وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

یہی آنے والا شخص وہ "صاحبِ یسین" تھا جس کی طرف یہاں
نبوت نے عروہ کا مقام بتانے کے لئے اشارہ کیا۔ قرآن میں یہاں سے ان
کی پُر عَزِيزَت اور جرات مندانہ دعوت کو بیان کیا ہے۔ قوم کے سامنے جس
وقت ان کی زبان پر یہ الفاظ آئے۔

إِنِّي آمَنْتُ بِرَبِّي كَمَا سَمِعْتُ

بیشک میں ایمان لے آیا تمہارے پروردگار پر پس میری
بات سنو!

لوگ ان پر حملہ آور ہو گئے، پتھر برسائے، اس پتھراؤ میں پتھر مارنے
والوں کے حق میں ان کی زبان سے جو دعائیں نکل رہی تھی۔ یہ تھی

اللهم اهد قومی فانہم لا یعلمون

اے اللہ میری قوم کو راہ بتا ان کو پتہ نہیں ہے۔

عروہ کی طرح یہ بھی کوا منة اکرمی اللہ بھائے ہم دوش ہو گئے اور حام
شہادت نوش کر گئے، اللہ کے یہاں دعوت کے عمل کی قیمت دیکھی۔ تو

بول پڑے

يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِمَّنَّ
الْمُتَكْرِمِينَ .

اے کاش میری قوم جانتی کہ میرے رب نے مجھے کیا بخشش
عطا فرمائی ہے اور مجھے کیسے عزت والوں میں سے بنایا ہے۔

وہ نے بھی وہی فرض انجام دیا جو دعوت کی راہ میں صاحبِ لیسین حبیب
نے ادا کیا۔

اللہ کے دین کی خاطر مخلصانہ جدوجہد کرنے اور خدا کے بندوں تک
خداپی کا پیغام پہنچانے اور اسے پھیلانے کیلئے مال، عزت اور جان کو
تج کرنے اور بے قیمت بنانے کا رواج اسلام میں بہت پرانا ہے اسے
ہی اسلام کی اصطلاحی زبان میں جہاد کہتے ہیں۔ اللہ نے اس دعوت
کے پہلے ہی دن سے سرانجام دینے کا حکم دیا تھا۔ زاد المعاد میں حافظ
ابن القیم رحمہ اللہ نے بتایا ہے

وامرہ الله نزلت بالجهاد من حين بعثه وقال لو شئنا
لبعثنا في كل قرية نذيراً فلا قطع الكافرين وجاهدنا
به جهاداً كبيراً .

آپ کی بعثت ہی کے وقت سے اللہ نے آپ کو جہاد کا
حکم فرمایا اور فرمایا اگر ہم چاہتے تو البتہ روانہ کرتے رہتے
میں پیغمبر پس مست کہا مان کافروں کا اور جہاد کر ان سے
بڑا جہاد۔

نہیں مانتے، انہیں بتانا اور ماننے پر آمادہ کرنا اسی طرح جو مانتے

ہیں مگر جانتے نہیں انہیں سکھانا اور خدا سے کو لگانے کا ان میں ولولہ پیدا کرنا جہاد ہے۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ نہ ماننے والوں کی خاطر خود ماننے والوں نے کیسی کیسی محنتیں کی ہیں مگر یہ بات بہتوں کو معلوم نہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملتے والوں میں جاننے اور سمجھنے اور بستے کا جوش پیدا کرنے کی خاطر کیسی ہمہ گیر اور زور دار کوشش کی ہے۔ اسکے لئے کتنی اچھی اچھی جانوں کو قربان کر دیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی سرفروشانہ زندگی میں آج یہ نشانات ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ اس لئے دین سمجھنے سکھانے، سمجھنے اور سمجھانے کے لئے قربانی کرتے، وقت نکلنے اور گھر سے بے گھر ہو کر اللہ جل شانہ کی رضا کی خاطر در بدر پھرنے کا رواج مٹ گیا ہے۔ آج ہمارے یہاں یہ رواج نہیں ہے۔ اس لئے اسلام ماننے والوں میں اسلام جاننے والوں کی کتنی بھی نہیں۔ ماننے والے تو اس وقت ۲۴ گھنٹے میں مگر جاننے والے ان میں فی ہزار ایک بھی نہیں۔ فانا لله والی اللہ الممشکتی۔ صحابہ میں سب کے سب جاننے والے تھے، جو نہیں جانتے تھے وہ جاننے کے لئے بیتاب تھے اور جو جانتے تھے وہ تلمذ کے لئے بے قرار تھے۔ دین نہ جاننے والوں کو دین جاننے کی خاطر گھر سے بے گھر ہونے کا حکم دیا تھا۔ مٹھیک اسی طرح دین جاننے والوں سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جو کچھ بھی سینوں میں امانت ہے اسے در بدر پھرنے کا کام صحابہ میں عام تھا۔ اس پہنچا دینے کی قوت ہی سے انہوں نے سراب جہالت میں بھٹکتی ہوئی دنیا کو علم کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ ابن ہشام نے سیرت میں، ابن کثیر نے

البدایہ والنہایہ میں اور ابن القیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے، صفر المظفر کا مہینہ
 تھا اور ۳۰ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف فرما تھے کہ اسی
 مہینے میں عضل اور قارہ قبیلہ کے کچھ آدمی نیاز مندانہ انداز سے آئے، بات ہی
 بات میں آنے والوں نے یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ

ابعت معنا فقرا من اصحابك يفتقروننا في الدين وبقرا

وتنا القران و يعلموننا شرائع الاسلام

ہمارے ساتھ اپنے صحابہ کی ایک جماعت بھیج دیجئے، وہ ہمیں
 دین کے مسائل سکھائیں گے، قرآن پڑھائیں گے اور اسلامی
 قوانین کی تعلیم دیں گے۔

پہلے یہ جتا دیا کہ اسلام کو تو سمجھتے ہیں۔ اِنَّا فِينَا اِسْلَامًا۔
 جاننے کا کوئی بندھا ٹکڑا انتظام فرما دیجئے اور اپنے ساتھیوں کی ایک
 جماعت ہمارے ساتھ ہمیں دین سکھانے، قرآن پڑھانے اور اسلامی زندگی
 کی راہیں بتانے کیلئے روانہ کر دیجئے۔ یہ تو واقعہ ہے کہ بنائے والوں
 نے اسلام کی بات جھوٹ موٹ بنائی تھی مگر سمجھنے اور سوچنے کی چیز یہ ہے
 کہ مسلمانوں ہی کو مسلمانی کا بھیس بدل کر دھوکہ دینے کی تدبیر انہیں کیسے
 سوچھی۔

بلا تامل کہا جاسکتا ہے اور ہے بھی یہ واقعہ کہ مسلمان ہونے کے
 بعد مسلمانوں کو مسلمانی کے تقاضے اور اسلام کی عملی زندگی کے سمجھانے اور بتانے
 کا چونکہ وہاں عام رواج تھا اور اس مقصد کی خاطر دیہات اور شہروں میں
 قبیلوں اور خاندانوں میں خاکروبی کرنا اسلام کے بنیادی مقاصد میں
 داخل تھا۔ اس لئے اسلام کا چولا پہن کر فریب دینے والوں نے اسی

پاک مشن سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور جھٹ مطالبہ کر دیا کہ اپنے صحابہ کی ایک
جماعت ہمارے ساتھ روانہ کر دیجئے اور پھر خود ہی جماعت کی روانگی کے بنیادی
مقاصد بھی بتا دیئے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کام صحابہ کی زندگی
میں اتنا عام تھا کہ خواص تو خواص بلکہ عوام - نہیں مسلمان تو مسلمان غیر مسلموں
کو بھی پتہ تھا کہ مسلمان ہونے کے بعد مسلمانوں کو اسلامی زندگی سمجھانے کے
لئے جماعتیں روانہ کرنے کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور ہے۔ اس دستور سے آشنا ہونے
کے بعد انہوں نے یہ کہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مطالبہ
منظور کر لیا اور امام بخاری کی رائے میں دس اور ابن اسحاق کی تصریح کے
مطابق چھ آدمیوں کی جماعت روانہ فرمادی۔ اس جماعت میں روانہ ہونے والوں
کے نام یہ ہیں: مرثد عنوی، خالد لثی، عامر، خبیب، زید بن الدثنہ اور عبد اللہ بن
طارق۔ قصہ تو تاریخ کی کتابوں میں پڑھیے میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رجب
کے مقام پر پہنچ کر فریب کا پردہ چاک ہوا اور پتہ چلا کہ دھوکہ دیا گیا ہے اور مسلمان
کے نام پر اسلام اور قرآن کی آڑ میں خود اسلام سے کھیل گیا ہے۔ چاروں میں قتل
کر دیئے گئے، خبیب اور زید گرفتار ہوئے، مکہ کے بازاروں میں فروخت
ہوئے، صفوان نے حضرت زید کو خریدا اور ان کو قتل کر دیا۔ بیان کرنے والوں
نے بیان کیا ہے کہ تنعیم جو حضرت زید کی قتل گاہ ہے مکہ کے بڑے بڑے آدمی
وہاں جمع ہوئے، ان میں ابوسفیان بھی تھے، زید قربان گاہ پر گئے، ابوسفیان
نے زید کی جان لبوں پر کھلتی دیکھ کر چاہا کہ زید کے ایمان سے کھلیوں، ابوسفیان
بولے! زید کیا تم گوارا کرتے ہو کہ اس وقت ہم تمہاری جگہ رسول اللہ کو لے
آئیں اور موت کا یہ پیالہ تمہارے لبوں پر نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے لبوں پر ہو۔ اور تم اپنے گھر میں مزے سے رہو۔ سچ یہ ہے کہ یہ زید کی

جان کا نہیں بلکہ زید کے ایمان کا کھیل تھا۔ زید نے کیا جواب دیا، وہی جو ایسے
 موقعہ پر ایمان والے دیتے ہیں — فرمایا رسول اللہ کا یہاں آنا تو بڑی بات
 ہے، بخدا مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ رسول اللہ جہاں تشریف فرما ہیں وہاں
 ہی ان کے ایک کانٹا چبھے اور میں آرام سے رہوں۔ لوگ سن رہے تھے
 اور زید کا منہ تک رہے تھے، ابوسفیان سے نہ زبلا گیا، بولا محبت کے
 متوالے بہت دیکھے ہیں مگر محمد کی محبت کے دیوانوں کی کوئی نظیر نہیں
 دیکھی، حضرت خبیب کچھ عرصہ تو لے بالآخر ان کیلئے بھی تختہ دار رہے جانے
 کا فیصلہ ہوا، ان کو جب قتل گاہ میں لایا گیا تو انہوں نے لوگوں سے جو بات
 کہی یہ تھی کہ مجھے اتنا وقت دو کہ اپنے رب کی بارگاہ میں دنیا کی زندگی کا
 آخری اور حقیقی آداب بجا لاؤں۔ یعنی رخصتی کی مناسبت — اجازت مل گئی
 آپ نے دو رکعت نماز ادا کی اور فرمایا کہ

لولا ان تظنوا فی انما طونت جزعاً من القتل لا

استکننت من الصلوة والبیاد

اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم میری نماز کی لمبائی کو قتل سے گریز سمجھو گے
 تو میں نماز بہت لمبی کرتا۔

ابن اسحاق کا خیال ہے کہ قتل کے وقت نماز کا یہ طریق خبیب کا

جاری کر وہ ہے السروض الالف میں علامہ سہیلی نے جو حیرت ناک

انکشاف کیا ہے، اس سے بھی اس نماز کا ایسے وقت میں سنون ہونا

معلوم ہوتا ہے، بیٹا ابن سعد کا بیان ہے کہ ایک بار حضرت زید ابن

حارثہ نے طائف کے کسی شخص سے پوچھا کہ یہ پر لیا اور چل دیئے

پھر والا آپ کو لے کر ایک نامعلوم برباد مقام پر پہنچ گیا، وہاں مقتولوں

کے پشتے تھے پھر والا حضرت زید کو بھی اسی لئے لایا تھا۔ حضرت زید کے قتل کی تیاری ہوئی تو اس پر کہا۔

دَعْفِ حَتَّىٰ اصْبِي دَكْنِيْنَ - مجھے چھوڑو میں دور کھنیں

پڑھ لوں۔

بولو۔ پڑھ لیجئے۔ ان سب نے بھی نمازیں پڑھی ہیں جن کی کھوپریاں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کی سزا تو ان کے کام نہیں آئی۔ حضرت زید کا کہنا ہے میں نے پڑھی۔ قاتل میرے قتل کے ارادے سے آگے بڑھا۔ میں نے کہا یا ارحم الراحمین کہ اچانک کسی نے چیخ کر کہا لا تقتلہ (اسے نہ مارو) قاتل ڈرا اور اس نے نظر دوڑائی مگر کوئی نہ تھا۔ میری طرف پھر قاتل بڑھا۔ میں نے پھر کہا یا ارحم الراحمین۔ پھر وہی آواز آئی مگر آدمی کوئی نہ تھا۔ پھر قاتل بڑھا۔ پھر کہا یا ارحم الراحمین۔ پھر وہی آواز آئی مگر آدمی کوئی نہ تھا۔ پھر قاتل بڑھا۔ میں نے پھر کہا یا ارحم الراحمین۔ اچانک نیزہ بردار سوار نے قاتل کا سر تن سے جدا کر دیا اور پھر سے یوں گویا ہوا۔ کہ جب تو نے پہلی بار دعا کی تو میں آسمان منقہ پر تھا۔ دوسری دعا میں آسمان دنیا پر تھا تیسری بار دعا میں میں یہاں موجود تھا۔

الغرض۔ زید نے اس موقع پر دعا مانگی تھی۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ جب حضرت نبیب کو تختہ دار پر پہنچایا گیا تو ان کے منہ سے جو دعا نکلی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے نبوت کے زمانے کے مردوں اور عورتوں کے فرائض اسلام، ایمان، صدق، صبر، خشوع، تصدق، صوم، عفت اور ذکر لگنا کہ

الذین یہتدون رسالات اللہ و یحشونہ ولا یحشون

احدًا الا الله

وہ لوگ جو اللہ کے پیغاموں کی تبلیغ کرتے ہیں اسی سے
ڈرتے ہیں۔ اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

میں اللہ کے نمازیں جو فرض بتایا تھا اس کی پابجائی کے لئے
ان میں کس قدر سرشاری تھی کہ اس کی خاطر وہ موت سے کھیلنے اور تختہ
دار پر پھینک کر اسی فرض کے احساس میں دبے ہوئے اور ڈوبے ہوئے
الفاظ کو اپنی دعاؤں کا سانچہ بناتے تھے۔ رضی اللہ عنہم ورضوانہ
حضرت خبیب کی دعا یہ تھی۔

اللهم انما قد بلغنا رسالتك فبلغنا الخداة
ما يصنع بنا

اے اللہ ہم نے تیرے رسول کا پیغام پہنچا دیا تو صبح کو اپنے

رسول تک ہماری آپ بیتی پہنچا دے۔

مجھے اس واقعہ میں بتانا ہی مقصود ہے کہ ان میں فرض کا احساس
کس درجہ کا تھا اور روزے، نماز، زکوٰۃ اور حج کرتے ہوئے اس
فرض کی ادائیگی کو نہ صرف اپنی زندگی کا ناگزیر تقاضا سمجھتے تھے بلکہ دراصل
وہ اس کے بغیر اپنے دین ہی کو ادھورا سمجھتے تھے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بنام جناب مرزا محمد امین بیگ صاحب محلہ کاج روڈ شہر سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۵ جنوری ۱۹۵۴ء

حقوق اور فرائض کا فرق۔ اسلام نے مسلمانوں کے سامنے
فرائض رکھے ہیں۔ فرائض کی تلاش۔ اولیٰ فرائض کا ہند
ادائے فرض پر اللہ کا شکر سوچنے کی پیرہن۔ ادائے فرض
ہے۔

صدیقی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

یاد آئے ہو۔ خدا کرے تم اچھے ہو۔ الحمد للہ ہر سانس بہتر سے بہتر
گزر رہا ہے۔ شاید تم تو اپنی جگہ حالات کی ناخوشگوار یوں سے مایوس
ہو گئے ہو گے۔ مگر میں الحمد للہ خوش ہوں کہ ادائے فرض کی توفیق
نصیب ہوئی۔

در اصل رنج و غم صرف ان لوگوں کو ہوتا ہے جن کی نظریں عوالم
اور نتائج پر لگی ہوتی ہیں۔ آج ہمارے معاشرے کی سب سے بڑی بیماری
یہی ہے۔ فرد سے لے کر جماعت تک زندگی کا ہر گوشہ اسی کا شکار
ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر شخص کی زبان پر حقوق کی تہیہ ہے۔ حاکم
محکوم سے، محکوم حاکم سے، باپ بیٹے سے، بیٹا باپ سے، شوہر
بیوی سے، بیوی شوہر سے۔ طلبہ اساتذہ سے، اساتذہ طلبہ سے
مزدور کارخانہ دار سے، کارخانہ دار مزدور سے، زمیندار کاشتکار سے
کاشتکار زمیندار سے اور زعماء عوام سے اور عوام زعماء سے غرض کہ
دفاتر، بازار، کارخانے، مدارس سے لیکر ایوان حکومت تک ہر شخص

کی زبان پر حقوق حقوق کا نعرہ ہے اور اسی کے سانچے میں سب کے سب اپنے اپنے عقائد، اعمال اور اخلاق کو ڈھال رہے ہیں۔ نگاہوں میں روحانیت بے قیمت اور مادیت قیمتی ہوتی جا رہی ہے۔

اسلام نے مسلمان کے نام سے جو سوسائٹی تیار کی تھی۔ وہ دنیا میں حقوق نہیں بلکہ فرائض لیکر آئے تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن ہی فرائض کی تحقیق تھا۔ وہ ہر وقت اس کے جو یا تھے کہ ہمارے ذمہ اللہ کے فرائض اور اللہ کے رسول کے فرائض کیا ہیں حاکم محکوم، میاں بیوی، شاگرد استاد، زمیندار، کاشتکار مزدور، کارخانہ دار، لیڈر اور عوام سب کے سب اپنے اپنے فرائض کی تلاش میں رہتے تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ فرائض معلوم ہو جانے کے بعد ہر شخص اداائے فرض کی منکر میں لگا رہتا تھا۔ اداائے فرض ہی فخر نہیں بلکہ اپنے مولا کے سامنے اس توفیق پر مسرور ہو جاتا۔ نتیجہ یہ کہ کمزوروں کی ہمدردی، غمگساری، ناداروں کی حاجت روائی، بیماروں کی بیماریاں، بھوکوں اور پیاسوں کی دلجوئی، ناتوانوں پر رحم معاشرے میں عام تھا۔ اولاد والدین کی خدمت، والدین اولاد کی تربیت کو، اساتذہ طلبہ کی تعلیم کو، طلبہ اساتذہ کی اطاعت کو، سربراہان مملکت شہریوں کی حیوانی اور انسانی ضرورتوں کی کفالت کو اور شہری سربراہوں کی فرمانبرداری کو اپنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور اس کی ادائیگی میں اپنی جان بچ کر دیتے تھے جس ظن دلوں میں الفت، ہمدردی، طاعت، خیرات، کمزوروں کی امداد بازار کی بے قیمت جنس تھی۔ جب چاہو جہاں سے چاہو۔ جتنی

چاہو لے لو۔

لیکن آہ آج معاشرے میں حقوق حقوق کی ربط کے نتیجہ میں یہ تمام خوبیاں کہیں کسی قیمت پر نہیں ملتی ہیں اور اس کی وجہ بدگمانی، بدکلامی، بدنگاہی جیسی گندی اور ناپاک جنس عام ہے۔ باپ بیٹے سے، بیٹا باپ سے، حاکم محکوم سے، محکوم حاکم سے، استاد شاگرد سے، شاگرد استاد سے، کارخانہ دار مزدور سے، مزدور کارخانہ دار سے، ڈاکٹر بیمار سے، بیمار ڈاکٹر سے، امام مقتدی سے، مقتدی امام سے اور بالآخر مرید شیخ سے اور شیخ مرید سے بدگمان ہے۔ اور صرف بدگمان نہیں بلکہ ایک دوسرے کے حق میں ہر ایک بدکلام ہے۔ سب ایک دوسرے کو بے محابا اور بے تحاشا برا بھلا کہہ رہے ہیں۔

آج بھی اگر ہم میں حقوق سے ہٹ کر فرائض کی لگن میں پیدا ہو جائے تو ہماری زندگی آج ہی بدل سکتی ہے۔
ختم نبوت کے نام پر جو کچھ ہم نے کیا یہ ہمارا فرض تھا۔ اب ہمارے سوچنے کی چیز صرف یہ ہے کہ ادائے فرض کی ہم کو توفیق ملی یا نہ ملی۔ اگر مل گئی ہے تو اس پر ہمیں اپنے مولا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور بس۔ یہ کوئی حق نہیں ہے جس کے نہ ملنے پر ہمیں کوئی شکایت ہو۔ جو کچھ ہمارا فرض تھا۔ اللہ کی توفیق سے وہ ادا ہو گیا۔ انہوں نے اگر ادائے فرض میں کوتاہی کی ہے۔ تو اس کی باز پرس ان سے ہوگی اور وقت آ رہا ہے کہ ان کو اس پر ندامت ہوگی۔ مگر

اس وقت یہ ندامت مفید نہ ہوگی۔ اس لئے نتائج سے بھا
 کر صرف خرائض پر نظر رکھیے یہی ایک مسلمان کا کام ہے۔ لیجئے
 اب ملاقات ختم۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بنام شیخ محمد حسین صاحب صندل بمبر لوہین کونسل نمبر ۱ محلہ رنگپورہ سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

۲۷ جنوری ۱۹۵۴ء

الطفیل کی شخصیت . دعوت کا پر آشوب زمانہ . الطفیل کی مکہ میں آمد . وفد قریش کی انطفیل سے ملاقات . ملاقات کا پس منظر طفیل کا غیر ارادی طور پر قرآن سننا اور لٹو ہو جانا . طفیل کی حضور ﷺ سے ملاقات . دعوت اسلام . معوذتین کی تلاوت اور طفیل کا اسلام کے لئے شرح صدر . مسلمان ہوتے ہی اسلام کے داعی راہ دعوت کی تنگنائی . ابوہریرہ طفیل کی دعوتی محنت کا پہلا نتیجہ ہے . دعوت کی راہ میں رکاوٹیں اور داعی کی مایوسی . نبوت کی تسلی بخیر کے داعی کو خود خیر اناس ہونا چاہیے . دعوت اور دعایت .

مکرمی - زاد مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
 دل بے چین ہو کر رہ جاتا ہے جب تاریخ میں اسلام کی خاطر صحابہ کی قربانیاں پڑھتا ہوں . شخص نہیں بلکہ ایک عظیم المرتبت شخصیت ہے . الطفیل نام ہے . دوس قبیلہ سے منسوب تعلق ہے . ذوالنور لقب ہے . ابن اسحاق نے سیرۃ میں اور ابن سعد نے طبقات میں جو تفصیلات بتائی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ بہت بااخلاق ، ہوشیار اور بلند پایہ شاعر تھے . بنی کریم سے اپنی ملاقات مکہ ہی میں ہوئی تھی . جس سال یہ مکہ میں آئے وہ نبوت اور دعوت نبوت کا بڑا پر آشوب سال تھا . پر آشوبی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی آمد پر قریش نے ان سے ملاقات کے لئے ایک وفد تیار کیا . ملاقات کا پس منظر اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ طفیل کو کاشانہ نبوت پر جانے سے

روکا جائے۔ وفد طفیل سے ملا اور بیٹھتے ہی لیوں برسے۔

جناب آپ یہاں تشریف لائے۔ آپ کو مقامی حالات کا پتہ نہیں ہے۔ دیکھئے اس آدمی نے ہمارا ناطقہ تنگ کر دیا ہے۔ ہم میں بھوٹ ڈال دی ہے۔ ہمارے نظم کو پا مال کر دیا۔ منہ سے نکلی ہوئی بات جادو اثر ہے۔ باب بیٹے کو بھائی بھائی کو، شوہر بیوی کو چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ آپ اور آپ کی قوم پر اثر نہ پڑ جائے۔ اس لئے نہ ان سے بات کیجئے اور نہ ان سے کچھ سنئے۔

خود طفیل کا بیان ہے کہ قریش نے میرے اتنے کان بھر دیئے کہ میں اپنی جگہ طے کر چکا تھا کہ نہ آپ سے بات کروں گا اور نہ آپ سے کچھ سنوں گا۔ حد ہے کہ میں مسجد میں گیا۔ تو اس خطرہ کے پیش نظر کہ کہیں کان میں نبوت کی آواز نہ پڑ جائے۔ میں نے کان میں روٹی رکھ دی۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں نبوت سے نکلی ہوئی بات کان میں نہ پڑ جائے۔ مگر قدرت کے کھیل عجیب ہیں۔ ایک روز صبح تڑکے مسجد میں گیا۔ دیکھتا ہوں کہ کعبہ کے پاس ذات نبوت کھڑی نماز میں مشغول ہے۔ میں بھی آپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اللہ جل شانہ نے یونہی کچھ باتیں کان پر ڈالیں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ کیا تھا۔ اب میرا فیصلہ یہ تھا کہ یہ بلند پایہ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ اپنی بھی شاعر ہیں۔ سنیں تو سہی۔ کام کی بات ہوگی مان لیں گے ورنہ چھوڑ دیں گے۔

طفیل کہتے ہیں کہ میں مسجد میں ہی ٹھہرا رہا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھر تشریف لے گئے۔ میں پیچھے پیچھے بولیا۔ آپ اندر تشریف لے گئے۔

میں بھی آپ کے ساتھ گھر پہنچ گیا سب سے پہلی بات جو طفیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر کہی یہ تھی۔ جناب عالی۔ آپ کی ذات اور آپ کی دعوت کے متعلق میرے سے بہت کچھ کہا گیا۔ لوگوں نے اتنا ڈرایا تھا کہ میں نے اپنے کانوں کو آپ کی آواز کیلئے بند کر لیا تھا۔ اب خدا نے مجھے آپ کی آواز سنا دی ہے۔ فرمائیے کہ آپ کیا کہتے ہیں؟ رسول اللہ نے دعوت اسلام پیش کی اور کچھ قرآن سنایا۔ ابوالفرج اصفہانی نے بحوالہ ابن کلی بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے سورہ اخلاص اور معوذتین کی تلاوت کی۔ سننے کے بعد طفیل سے نہ رہا گیا۔ ان کا تاثر خود ان کے الفاظ میں یہ تھا۔

فلا والله ما سمعت قولاً قط احسن منه ولا امراً
اعدل منه

خدا کی قسم؟ میں نے اس سے بہتر اور اس سے زیادہ انصاف والی بات کبھی نہیں سنی۔

اس کے بعد کیا ثبوت خود کہتے ہیں کہ میں مسلمان ہو گیا۔ اور شہادت حق کافر عن انجسام دیا۔ مسلمان تو آج بھی ہوتے ہیں۔ سننے کی چیز یہی ہے۔ اس عہد میں اسلام قبول کرتے ہی ایک مسلمان کو لا الہ الا اللہ کی عائد کردہ ذوالی کا احساس کتنا ہوتا ہے۔ وہ اس کہنے کے ساتھ ہی یہ سمجھتا ہے کہ بس اب میری زندگی میری نہیں ہے۔ طفیل نے بھی یہی سوچ لیا۔ بولے یا رسول اللہ۔ قوم میں میری چلتی کا زمانہ ہے۔ ان میں واپسی اب طفیل کی واپسی نہیں بلکہ داعی اسلام کی واپسی ہے۔ خدا سے دعا کیجئے کہ حق جل شانہ مجھے کوئی ثانی مرحمت کرے جو میرے لئے دعوت کا کام آسان اور سزاگوار ہو جائے۔ رسول اللہ نے دعا دی اور پورا ہوا۔

اللہم اجعل لہا ایۃ اللہ اس کیلئے کوئی نشانی بنا دے
 طفیل وہاں نبوت سے نکلی ہوئی دعا کی سوغات لے کر وہاں سے چل
 بیٹے۔ اب ان کا رخ داعی کی حیثیت سے قوم کی طرف تھا۔ آبادی کی طرف راستہ
 پر چل رہے تھے۔ راستہ کا کچھ محل وقوع ایسا تھا کہ دو پہاڑوں کے درمیان
 سے ہوتا ہوا بندھی سے نیچے جا کر دوسری آبادی سے ملتا تھا۔ طفیل اپنی
 آبادی کی طرف چلنے کے لئے اس راستہ پر پہنچے تو پیغمبر کی دعا پیشانی
 کا نور بن کر چمک گئی۔ طفیل کا رخ آبادی کی طرف تھا۔ ابن عبد البر کا کہنا تھا کہ
 طفیل کا جگمگاتا چہرہ رات کی تاریکی میں پوری آبادی دیکھ رہا تھا۔

بیرانی الحاضر فی ظلمۃ اللیل

رات کی تاریکی میں آبادی دیکھ رہے تھے

طفیل کہتے ہیں میں نے فوراً اللہ جل شانہ سے دعا کی کہ۔

اللہم فی غیر و جہی یا اللہ چہے پر نہیں کسی اور جگہ پر!

یہ بھی طفیل ہی نے بتایا ہے کہ دعا کیوں مانگی۔ فرماتے ہیں کہ اس اندیشہ
 سے وہ بکر کہ مبادا کہیں لوگوں کے منہ سے نکل جائے کہ وہاں سے نکل کر
 صورت بگڑ گئی۔ اور دعا ہوئی اور روشنی کا چمکارا کورے میں آ گیا۔ اب طفیل
 جا رہے تھے کہ راستہ اتر رہے ہیں اور ان کے کورے کا چمکارا آبادی کے
 تماشائی دیکھ رہے تھے۔ ابن عبد البر کہتے ہیں کہ اونٹ پر سوار تھے اور کورا
 قندیل کا کام دے رہا تھا۔ اسی وجہ سے آپ کا لقب ذوالنور ہے گھر پہنچے
 رات گزری۔ صبح اٹھتے ہی دعوت کا کام شروع کیا۔ مگر پہلے پرائے نہیں اپنے امون
 میں بھی ماں باپ اور اہلیہ کے سنا منے اسلام کی سوغات رکھ دی۔ سب سے
 پہلے ابا لے۔ بولے۔ ابا ذرا پرے رہیے۔ رشتہ ایمان رشتہ رحم سے زیادہ

پیارا ہے باپ بولے بیٹا کیوں؟ بولے اس لئے کہ اہمیت و ثابت دین تھیں۔
 ابا نے کہا بہت اچھا لیٹھے فدینی وینک۔ بولے جائیے غسل فرمائیے
 اور کپڑے پاک پہنئے۔ پھر تشریف لائے۔ طفیل کے ابا نے غسل کیا۔ کپڑے صاف
 کئے، واپس آئے۔ طفیل نے اسلام کی سوغات پیش کی مسلمان ہو گئے، بیوی
 سے بھی یہی حالات پیش آئے۔ ان سے غسل کرنے کو کہا۔ مگر داعی حکیم ہوتا ہے اس
 لئے بولے ذی الذریعہ کے خطیرے میں ہنا کر آؤ۔ ابن مشام کا کہنا ہے کہ دوس
 قبیلہ کے بت کا نام ہے۔ اسی کے نام سے خطیرہ تھا۔ خطیرے میں پانی کا
 ایک چشمہ تھا۔ بیوی بولی بچوں کا کیا بنے گا۔ طفیل نے موحدانہ لے باکی سے کہا۔
 کچھ نہیں۔ اس کا میں ذمہ دار ہوں۔ گئیں، غسل کیا، آئیں اور اسلام کی دولت
 سے مالا مال ہو گئیں۔ طفیل نے اس کے بعد قبیلہ دوس میں دعوت کا کام شروع
 کیا۔ مگر سو اٹھی نے طفیل کی دعوت کو دعوت نہیں لکھا۔ سمجھا، ناقدری کے
 ہتھیاروں سے طفیل کا مقابلہ کیا۔ ابن کلی کا خیال ہے ایک شخص کو مستثنیٰ کر کے
 کسی نے بات نہ مانی یہی مستثنیٰ شخصیت ابوہریرہ کے نام سے پہچانی جاتی ہے
 نصرت نہیں ہے۔ مگر قیاس ہی چاہتا ہے۔ طفیل ان ہی کو لے کر رسالت
 مآب کی خدمت میں پہنچے اور دوس قبیلہ کی شکایت کرتے ہوئے انکے
 لئے بددعا کی درخواست کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھائے اور
 بددعا کی جگہ جو صد زبان پرائی یہ تھی۔

اللہم اهدنا دوسنا
 اے اللہ دوس کیلئے ہدایت کے دروازے

کھول دے

عمل سے بتا دیا کہ داعی کے ملنے کی چیز برائی نہیں بلکہ اچھائی ہے داعی
 جو انجیر کی دعوت لے کر آتا ہے اسے خود خیر الناس ہونا چاہیے۔ حسن خیرات ہی

اس کا پیشہ ہونا چاہیے اور اس کو خدا سے لہجہ ہی مانگنی چاہیے۔ اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی۔ اپنے لئے کہیے۔

اجل الحیاة زیادۃ ثانی فی کل خیر مسلم

اے اللہ زندگی کو ہر خیر میں زیادتی کا ذریعہ بنا دے۔

اور طفیل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فہمائش کی — جاؤ دعوت دو اور نرمی برتو۔ بخاری میں جو بحوالہ ابو ہریرہ طفیل کی آمد کے ساتھ اسی دعا کا تذکرہ ہے۔ وہ شاید اسی وقت کی ہے۔ ابو ہریرہ ہی واقعہ بیان کرنے والے ہیں۔ قیاس بھی کہتا ہے کہ ابو ہریرہ طفیل کے ساتھ تھے۔ طفیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوس کے متعلق دعائی تو بول پڑے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو نہ چاہتا تھا۔ نبوت یولی، اسے طفیل جہاں تو دعوت کا کام کر رہا ہے۔ اس زمین پر تیرے جیسے بہت ہیں پھر دوس میں آئے اور ہدایات کی سرشاریوں کے ساتھ آئے کام کیا اور خوب کیا۔ تصریح نہیں مگر واقعات کی ترتیب یہی کہتی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا رنگ لائی۔ بہت سے گھرانوں نے طفیل کی پکار پر لبیک کہی انہیں لبیک کہنے والوں میں حاکم دوس کے صاحبزادے حضرت حذیب بھی تھے۔ حضرت طفیل کہتے ہیں۔ اب میں مدینے آیا، تو دوس کے گھرانے میرے ساتھ تھے۔ بندر احد اور خندق گزر چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیمہ میں تھے میں دعوت کی کمانی پیکر خیمہ میں آپ سے جا ملا۔ وقت گزر گیا، حالات نے ایک نئی کڑی لپی رکھتی تھی اور دعوت کی بناٹی ہوئی زمین پر دعوت کی گاڑی چلنے لگی یعنی اسلام نے افراد کی اخلاقی اور اعتقادی اصلاح سے آگے قدم بڑھا کر سیاست و قانون میں رکھ دیا۔ سب ہی کام کر رہے تھے اور ہر شخص اپنے

اپنے فرس کی تلاش میں تھا۔ ایک روز یہی طفیل بوئے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور اسے لکھنے سے روک دیا اور جلائے کے لئے مجھے مقرر کیجئے۔ ذی الکفین دوسرے لکھنے کا ایک بت تھا۔ حضرت خدیجہ کے والد اس کے تنوں کو بچھے حکم ملنے پر روانہ ہو گئے۔ آگ لگاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے۔

يا ذى الكفین لست من عبادک
انی خشوت النادی فوادک

اے ذی الکفین! میں تیرے پرستاروں میں سے نہیں ہوں۔ ہماری تاریخ
پیدائش تیری پیدائش سے قدیم ہے۔ میں نے تیرے دل میں آگ بھری
دی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک مدینے ہی میں قیام کیا۔ فتنہ
ارتداد میں حضرت ابو بکر کے ساتھ کام کیا اور ریحانہ میں شہید ہو گئے۔
فَانَا جِلْدًا وَرِيَا لِيَكْرَهُ دَا جَعُونَ
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بنام چشتی پیر اللہ و تاجت صاحبہ محلہ احمد پورہ سیالکوٹ شہر

۳۰ جنوری ۱۹۵۲ء

حدیث الدنیا سبحان المؤمن کی تشریح۔ مسلمان کے لئے دنیا کے

جیل خانہ ہونے کا مشہور مطلب اور احادیث کی روشنی میں اس کی تردید۔

یزدگرد کے دربار میں ربیع بن عامر کی تفریحی بحثیں پر حرف گیری گمراہی اور

فقہاء پر بے اعتمادی بے راہ روی ہے۔

صدیقی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

یہاں کے درود یو آر آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں نہیں بلکہ آپ کے خرق میں۔

مگر کے نہیں۔ پھر روی کے آئسو بہاتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی کچھ نہ کچھ آپ کی داستان سنا

ہی دیتا ہے۔ آج مسٹر غلام محمد نے آپ کی کہانی چھڑ دی۔ آپ کی آمد، آپ کی سہاقت

اور آپ کی روانگی عرض آپ کی جیل یا ترائی کا ایک ایک گوشہ سنایا اور خوب منے

لے لے کر سنایا۔ میں بار بار اپنی عدیم الفرستی کو درمیان میں آڑ بنا کر پیش کرتا ہوں

مگر وہ سناٹے ہی جاتے ہیں اور روزانہ بعد نماز عصر کھانے پر آپ کا افسانہ چھڑ

دیتے ہیں۔ خوب آدمی ہیں مگر حرفوں کے بنے ہوئے ہیں۔

دراصل ایک مسلمان کی پوری زندگی اس حیثیت سے جیل کی زندگی سے مشابہ ہے

کہ اس میں بے راہ روی آزادی اور خود مختاری کو ختم کر کے قانون کی پابندی کو لازمی قرار دیا

گیا ہے۔ صحیح مسلم میں جو یہ حدیث آئی ہے کہ الدنیا سبحان المؤمن من جنتہ للکافر

تو اس کا مطلب یہی ہے کہ دنیا میں کافر کی زندگی آزاد بے راہ روی اباحت مطلقہ

اور خود رانی کی ہے اور مسلمان اس دنیا میں اللہ کی بندگی، پیغمبر کی طاعت اور اس

کی پیروی سے کر آیا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان دنیا میں مجوم لوانزل، انبوه

زلزل اور احاطہ حوادث کے لئے آیا ہے اور کافر سر فرار لہوں، بالادستین نعمتوں

اور آسائشوں سے ہم دوش ہونے کے لئے آپ سے مسلمانوں کی تاریخ اس کی تکذیب کرتی ہے یا دپڑتا ہے کہ ربیع بن عامر نے یزدگرد کے دربار میں مسلمانوں کے قاصد کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

اللہ نے ہمیں اس لئے روانہ فرمایا کہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔ انسانوں کی بندگی چھڑا کر خدا کی بندگی پر آمادہ کریں۔ انکو دنیا کی تنگی سے نکال کر کشادگی کی طرف لائیں اور مذاہب کی بجزوی اور بے اعتدالی سے نکال کر اسلام کی صراطِ مستقیم پر لگائیں۔

یقین فرمائیے اللہ نے مسلمانوں کو کافروں کی زمین، مکانات اور مال و اسباب کا وارث بنایا ہے اور ایسی زمین کا وارث بنایا ہے جس پر وہ ابھی چلے نہیں و اور تمہارے ارضکم و ارضنا لم تطو وھا، انہیں زمین کی خلادت دی ہے اور اقتدار عطا کیا ہے۔

حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تم نے پڑھا یا سنا ہوگا کہ ان اللہ ذری لیا لادین خرابیت مشادقھا۔ اللہ نے میرے لئے زمین کو سمیٹا تو میں و معادبھا و ات امتی سیلخ ملکھا فنزوی نے مشرق اور مغرب کو دیکھ لیا میری امت کی حکومت دہاں تک پہنچے گی جہاں تک فی و اعطیت الکفریت الاھد الابیہی۔ میرے لئے زمین سمیٹی گئی اور مجھے سرخ و داؤکما قال (ترمذی) سفید یعنی سونا اور چاندی کے دونوں ننانے دیئے گئے۔

اور یہ ارشاد بھی تم نے سنا ہوگا کہ :-

اذاھلک کسری فلا کسری فلا یعد داذا جب کسری نہ رہے گا تو پھر کوئی کسری نہ ہوگا۔ اور جب ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ والذی نفسی قیصر ختم ہو جائے گا۔ تو پھر کوئی بھی قیصر نہ ہوگا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے تم ان دونوں کے خزانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے۔

اور کما قال (ترمذی)

سوچئے کہ کیا ان ارشادات کی موجودگی میں کوئی شخص یہ سوچ بھی سکتا ہے کہ دنیا کے مسلمان کے لئے جیل ہونے کا مطلب اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے جو میں عرض کیا ہے۔

در اصل لوگ ایمانِ نبوت سے نکلی ہوئی بات خود نہیں سمجھتے اور اس کے نتیجے میں یا تو ارشاد ہی کا انکار کر دیتے ہیں اور بلب کی روشنیوں اور چکھوں کی پواؤں میں پیٹھ کھدین پر حرف گیری کرتے ہیں یا پھر جنہوں نے ارشادات کے معانی کو سمجھا ہے یعنی فقہاء ان کے علم کو اپنے خود ساختہ گزروں سے ناپنے لگتے ہیں۔ اول مرتا سرگزی اور دوسرا مرتا سر خود رانی اور بے راہ روی ہے۔

اجحاب آنکھوں میں نیند بھرا آتی ہے دیکھتا نہیں بلکہ زور سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لالٹین کی روشنی بھی مدہم پڑ رہی ہے اسے بھی تیل کی کمی کی شکایت ہے۔ جیل سے تیل کھڑا ہی ملتا ہے۔ گھر سے تیل منگا یا کھتا ہوں میں جو کچھ کھادہ لالٹین کی نذر کر چکا ہوں۔ شاید تیل کو آجائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پیام جناب شیخ احمد دین صاحب سابق صدر، سرار اسلام، محلہ احمد پورہ، سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ
۲۴ فروری ۱۹۵۴ء

یزید بن رومان کی روایتی تحقیق۔ تراویح اختلاف کا بنیادی نقطہ۔
مرسل حدیث کی تعریف۔ مراسلات مؤطا کا حکم۔ مرویات مرسلہ کی آئینی
حیثیت۔ تابعین کو اپنے بزرگوں پہ ایسا ہی اعتماد تھا۔ جیسے یہیں بخاری
اور مسلم پر۔ روایات مرسلہ میں محدثین کا مذہب۔

عزیزم !
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اس وقت تم یاد آئے۔ عشاء کی نماز سے فراغت کے بعد چار پائی پر
بیٹھا ہوں۔ یکایک دماغ میں تمہارا خیال آیا اور خیال کے ساتھ دل میں تمہاری
یاد چٹکیاں لینے لگی۔ اور یکدم تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا تو تمہاری مؤطا
امام مالک کی یزید بن رومان کی روایت تنقید یاد آگئی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تم
نے ایک بار کہا تھا۔ کہ مؤطا امام مالک کی یہ روایت مرسل ہے۔ جی چاہا کہ آج کی
صحبت میں تمہیں یہی بتاؤں۔ پہلے روایت سن لو۔

عن مالک عن یزید بن رومان قال: کان الناس یقومون
فی زمان عمر بن الخطاب فی رمضان بثلاث وعشرین رکعة۔

اوکا قال۔ (مؤطا)

یہ جمہور اور ائمہ اربعہ کا تراویح کے زمانہ عمر میں بیس ہونے کے لئے استدلال ہے
اگرچہ زمانہ عمر میں تراویح کا بیس ہونا اس پر موقوف نہیں ہے کیونکہ یہ مسئلہ امت میں
اتفاقی ہے کہ زمانہ عمر میں تراویح بیس تھی یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس کا منکر
کوئی نہیں اور اس میں امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں۔

نواب صدیق حسن خان قنوجی ہوں یا امیر محمد بن اسماعیل یمنانی حافظہ محمد بن ابراہیم

یہانی ہوں یا قاضی شوکانی یہانی سب اس پر متفق ہیں۔ افسوس کہ میرے پاس کتابیں نہیں ہیں۔ ورنہ ایک ایک کے متعلق تصریح بتا دیتا کہ سب زمانہ عمر میں بیس ہونے کے اقرار ہی ہیں۔ نواب صدیق حسن خان کے الفاظ تو کوذہ ذہن میں اب بھی محفوظ ہیں۔ حکیم احمد دین نقشبند نے ایک بار اپنی حیات میں اپنی کچھ کتابیں مدرسہ کو منتقل کی تھیں۔ ان میں نواب صاحب کی ایک کتاب ہدایۃ السائل الی اولیٰ المسائل بھی آئی تھی۔ یہ نواب صاحب کا فتاویٰ ہے۔ اس میں لکھا ہے۔

فالحاصل انہما صحیح عنہ صلے اللہ علیہ وسلم وانما هو من سنن عمر

قال العسکری اول من قیام رمضان عمر سنة اربعة عشر۔

چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں۔

مقصود آنکہ یا زودہ از آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مروی گشتہ دہست رکعات زیادت عمر بن الخطاب است۔

یہ یا اسی طرح کی عبادت ہے۔

الغرض زمانہ عمر میں تراویح کا بیس ہونا مسئلہ اختلافی نہیں ہے۔

اختلاف تو صرف اس میں ہے۔ کہ خلافت کے اعمال دین میں حجت ہیں یا نہیں جمہور

اہل السنن صحابہ کے اعمال کو حجت اور ان کی سنت کو سنت اور ان کو معیار حق مانتے

ہیں مگر ایک شذوذ قلیل کا دعویٰ یہ ہے۔ کہ صحابہ کے اعمال دین میں حجت نہیں

ہیں۔ یاد پڑتا ہے کہ مشہور اہل حدیث عالم امیر محمد بن اسماعیل یہانی نے سب السلام

میں لکھا ہے کہ خلیفہ راشد کو کوئی ایسا طریقہ رائج کرنے کا حق نہیں ہے۔ جس

پر حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم عمل پیرا نہ تھے۔

اگرچہ یہ ان کی قلعی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ ایک سے زیادہ مسائل میں

جمہور اہل السنن سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ مگر بنائے نزاع یہی ہے۔ یہ نہیں کہ زمانہ

عمر میں تراویح بیس کھتی یا نہیں۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ زمانہ عمر میں تراویح کا بیس ہونا اس روایت پر موقوف نہیں ہے۔ اس کی تکذیب تو محدثین، مورخین کی تکذیب ہے۔ جہاں تک اس روایت پر تمہاری تنقید کا معاملہ سے سروست میں اسی کو سلجھانا چاہتا ہوں۔

محدثین کی اصطلاح میں حدیث مرسل وہ کہلاتی ہے جس میں تابعی اپنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان جو واسطہ ہے۔ اس کو بیان کئے بغیر بیان کرے جیسے اس حدیث میں یزید بن رومان نے کیا کہ زمانہ عمر نہیں پایا مگر بتا دیا کہ زمانہ عمر میں بیس تراویح ہوتی تھی۔

یہاں دو باتیں تفتیح طلب ہیں۔

ایک مرسل روایات کی آئینی حیثیت

دوسرے مراسیل موطا کا حکم۔

موطا کے مراسیل کی تکذیب تو محدثین کا فیصلہ ہے کہ موطا کے تمام مراسیل منقطعاً اور بلاغات متصل اور مسند ہیں۔ چنانچہ علامہ صلاحی نے فرائض لکھتے ہیں

ابن عبد البر نے بجز چار روایتوں کے تمام مراسیل اور منقطعات موطا کو باسناد صحیحہ موصلاً ذکر کیا ہے۔ اور ان چار کے متصل ہونے پر بھی حافظ ابن الصلاح نے ایک مستقل تالیف کی ہے جو میرے پاس موجود ہے۔ اور اس پر خود ان کے قلم کی تحریر بھی ہے۔

ایک مقام پر حافظ مغلطائی نے دعویٰ کیا ہے کہ وفتر حدیث میں سب سے پہلی صحیح کتاب موطا امام مالک ہے۔ حافظ مغلطائی کے اس دعویٰ پر حافظ عسقلانی نے

یہ اعتراض کیا کہ چونکہ موطا میں روایات مرسلہ ہیں۔ اس لئے موطا صرف امام مالک کو ماننے والوں کے نزدیک ہی صحیح ہے۔ دوسروں کے نزدیک نہیں۔ اس کا جواب تنویر الحوالک میں حافظ جلال الدین السیوطی نے جو دیا ہے وہ ہی سنانا چاہتا ہوں فرماتے ہیں۔

موطا میں جو مراسیل ہیں علاوہ اس کے کہ وہ بلا کسی شرط امام مالک اور ان کے ماننے والوں میں حجت ہیں۔ ہمارے نزدیک بھی حجت ہیں کیونکہ ہمارے یہاں جب مرسل کا کوئی مؤید موجود ہو تو وہ حجت ہے اور موطا میں کوئی مرسل روایت ایسی موجود نہیں ہے کہ جس کا ایک یا ایک سے زیادہ مؤید موجود نہ ہو۔ (تنویر الحوالک)

یہ تو مراسیل موطا کی بات ہے۔ اور جہاں تک مرسل روایات کی آئینی حیثیت کا تعلق ہے۔ تو یہ حقیقت ہے کہ تیسری صدی سے پہلے مرسل روایات مسند کی طرح قابل حجت سمجھی جاتی تھیں۔ تیسری صدی کے شروع میں محدثین میں حدیث مرسل کے بارے میں اختلاف رونما ہوا۔ کچھ نے اس کو حجت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ نے اس کا درجہ مسند کے بعد رکھا اور کچھ نے اس کو مسند پر ترجیح دی۔

سب سے پہلے امام شافعی نے مرسل روایات پر کلام کیا ہے۔ چنانچہ امام ابو داؤد اپنے خط میں جو انہوں نے اہل مکہ کے نام لکھا ہے۔ اور جس میں انہوں نے اپنی کتاب سنن ابو داؤد کا تعارف کرایا ہے اور جس کے اقتباسات مشہور اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خان نے الخوطہ میں درج کئے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

مرسل حدیثوں سے گذشتہ علماء جیسے سفیان ثوری۔ مالک بن انس اور اوزاعی استدلال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ امام شافعی آئے اور انہوں نے اس پر گفتگو کا دوازہ کھولا اور احمد بن حنبل وغیرہ نے اس موضوع پر ان ہی کی پیروی

کی ہے۔ لہذا جب کوئی مستند روایت مرسل روایت کے خلاف موجود نہ ہو۔
تو ایسی صورت میں مرسل روایت کو اپنایا جائے گا۔

لیکن الآمدی نے امام شافعی کے متعلق یہ بھی نقل کیا ہے کہ ایسے مراسلات ہیں جن کے ارسال کرنے والے کے متعلق یہ معلوم ہو گیا کہ وہ ارسال ایسے لوگوں سے نہیں کرتا جن میں جہالت نہ ہو۔ تو اس قسم کے لوگوں کی روایات قابل قبول ہوں گی۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ قابل اعتماد لوگوں کی روایات چاہے وہ اس کی سند نہ بتائیں۔ لیکن ان کا بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے بے سوچے سمجھے اس کو بیان نہیں کیا ہے۔ کیونکہ غالب امید ایک متدین متقی اور پرہیزگار آدمی سے یہی کی جاسکتی ہے کہ اپنے آپکو مطمئن کر لینے کے بعد ہی اس بڑی ذمہ داری کو انہوں نے قبول کیا ہے۔ یقیناً یہ ایک حیثیت سے افتراء علی اللہ ہے اور قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر افتراء علی اللہ کو سب سے بڑا ظلم قرار دیا گیا ہے۔ جن بزرگوں کی عدالت مسلم ہو ان سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ گھلا ہوا ایک عقلی قانون ہے اور اسی بنا پر مرسل روایات کو عموماً حجت قرار دیا جاتا ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ الآمدی نے لکھا ہے۔

والمختار قبول مراسیل العدول مطلقاً۔

بتایا جائے کہ یزید بن رومان ثقہ اور عادل ہے کہ نہیں۔ ان کی عدالت پر عوف گیری مستند روایات کی بربادی ہے۔ یہ اس موضوع پر شیخ صدیق کے ارباب حدیث کے نظر یہ کی توضیح ہے۔ ورنہ دوسری صدی کے محدثین یعنی تابعین کے یہاں تو اس موضوع پر کبھی دو رائے نہیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ امام محمد بن جریر طبری کے حوالے سے حافظ ابن عبد البر نے نقل کیا ہے۔

ان التابعین اجمعوا باسرهہم علی قبول المراسیل

اور یہ بھی لکھا ہے کہ دوسری صدی تک اس کا تابعین میں سے نہ کسی نے انکار کیا اور نہ ہی ائمہ میں سے کسی سے اس کے خلاف کوئی تکفیر ثابت ہے۔ مصنفین صحاح میں سے صرف امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں تصریح کی ہے کہ مرسل روایات حجت نہیں ہیں۔ لیکن یہ تمام ادباً صحاح کا متفقہ فیصلہ نہیں ہے۔ امام ابو داؤد کے متعلق آپ سن آئے ہیں کہ

جب مسند مرسل کے خلاف نہ ہو اور مسند موجود نہ ہو تو مرسل

سے استدلال کیا جائے گا۔

بلکہ حافظ ابو الفرج ابن الجوزی نے اپنی مشہور کتاب التَّحْقِيقُ فِي أَحَادِيثِ الْخِلَافِ میں اور محدث خطیب بغدادی نے الجامع فی آداب الراوی میں امام احمد سے یہاں تک نقل کر دیا ہے کہ

بسا اوقات مرسل روایت مسند سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے۔

(شرح نقایہ ص ۲۰)

اور تو اور متاخرین میں سے حافظ ابن حزم ظاہری تو یہاں تک فرما گئے۔

ایسے مراسیل جن کی پشت پر اجماع ہو۔ جو قرناً بعد قرن نقل ہو کر

آ رہی ہو۔ اس کے لئے کسی بھی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ واقعہ

کے ہونے کے لئے اس مرسل کا ہونا اور نہ ہونا دونوں یکساں ہیں۔

(توجیہ النظر)

آئیے اس ترازو میں بزید بن رومان کی روایت کو تول کر دیکھ لیجئے کیا اس کی

پشت پر سیزدہ صدی سالہ امت کی اجماعی قوت نہیں ہے۔ کیا یہ قرناً بعد قرن نقل

ہو کر نہیں آ رہی ہے؟ بتلا یا جائے کہ کیا اسکی حیثیت لا وصیتہ لو ارت سے کچھ بھی

مختلف ہے۔

اگر یہ بغیر سند کے صرف اس لئے مقبول ہے کہ اس کی پشت پر امت کی اجماعی طاقت ہے۔ تو بتلایا جائے کہ یزید بن رومان کی روایت کو درجہ پذیرائی کیوں نہیں ہے؟ یہ تو مرسلات تابعین ہیں۔ ان کا تو مقام ہی بالابہ آج تو خود مرسلات علماء بھی حجت ہیں۔ بتلایا جائے کہ آج بھی بخاری و مسلم وغیرہ کی متصل روایات کو ہم جو صحیح مانتے ہیں تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ صرف ان ائمہ کی دیانت پر اعتماد ہی کی وجہ سے ان کو صحیح کہا جاتا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الونزی کہتے ہیں۔

اعلم ان اقوی المراسیل ما ارسله العلماء من احادیث

هذه الكتب

اللہ اکبر! ہم اگر کہیں کہ یہ کتاب امام بخاری کی تصنیف ہے یہ تو صحیح ہے حالانکہ یہ بات ہم دس صدیاں گزرنے پر لوگوں کو بتلا رہے ہیں اور یزید بن رومان اگر پہلی ہی صدی میں صرف چند سال پہلے کی بات بتائیں کہ یہ کام زمانہ ٹمڑ میں ہوتا تھا تو یہ غلط ہے۔ چاہے یزید نے حضرت عمر کے پوتوں عبید اللہ اور سالم کے سامنے ہی زانوئے شاگردی نہ کیا ہو۔ اور چاہے وہ عالم ہوں، کثیر الحدیث ہوں اور نکتہ ہوں مگر منظور نہیں۔ فانالہ وانی اللہ الممشکی۔

اسی قسم کے اختراعی قواعد کے نتیجے میں متعدد مسائل میں ائمہ مجتہدین اور فقہاء سے کٹ کر نئے نئے فرقوں کی بنیاد پڑ گئی ہے۔

سچ یہ ہے کہ تابعین کو اپنے بزرگوں پر ویسا ہی اعتماد تھا۔ جیسا کہ صاحب مشکوٰۃ اور صاحب مصابیح کی صحاح سنت کے مؤلفین پر تھا۔ اور جس طرح انہوں نے حدیثوں کو اپنی کتابوں میں صرف اپنے بزرگوں کے اعتماد پر بلا سند یہ کہہ کر کہ

وان كان نقله وانہ من الثقات كالاستاد
 درج کر دیا ہے۔ اسی طرح تابعین نے اپنے اساتذہ کی روایات کو لوگوں
 کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ آخر یہ کونسا انصاف ہے کہ ہم تو اپنے اساتذہ پر اعتماد
 کریں۔ اور تابعین سے اپنے اساتذہ پر اعتماد کی توقع نہ رکھیں۔ ہمارے مراسیل تو مقبول
 ہوں اور تابعین کے مراسیل مردود ہوں قیاللاسف ویاللہ اعلم بحججہ اب وقت زیادہ
 ہو گیا ہے۔ ختم کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بنام مولانا سید کریمت علی شاہ صاحب فاضل دیوبند مدرس عربی تبلیغ الاسلام
 ہائی اسکول۔ چونڈہ ضلع سیالکوٹ

ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ

پار فروری ۱۹۵۲ء

رہائی کی تاریخ اور پھر قید کی توسیع۔ جیل کی زندگی میں بے فکری، علاقے کی کثرتِ غم و الم کا سامان ہے۔ عزت کی برکتیں، دنیا سے بچشیت دنیا کے بے تعلقی اور دل میں اللہ کی لگن، ایمانِ کامل ہی دل کی راحت کا ضامن ہے۔ جیل میں قیدیوں کی قید کا پس منظر۔ اگر جیل میں آنا ہی سزا ہے۔ تو مجرم اور غیر مجرم میں کیا فرق۔ جیل میں قیدیوں کی زندگی کی تصویر۔ اگر اسلام کے صرف فوجداری حصہ کو اپنایا جائے تو جیلیں اتنی فیصدی خالی ہوتی ہیں۔ اسلام کی خاطر چراغ آرزو روشن ہو کر بھڑک بھی گیا۔

عزیز من ! اسلام عنیلم ورحمت اللہ وبرکاتہ

جی چاہا کہ تم سے کچھ دل بہلاؤں۔ کیا کہوں ایک بجا تھا۔ آسمان نکھرا ہوا تھا چمکتے آفتاب کی تیز کرنوں میں دیوار پر بیٹھا سرمائی سلوٹوں کو کھول رہا تھا۔ میری نگاہ سامنے جیل کی دیوار پر بیٹھی ہوئی چوٹیوں کے تماشے میں پختی۔ کبھی وہ سطح دیوار پر آتیں اور کبھی جیل کی کوٹھڑیوں میں گھس جاتیں۔ پھر اٹھتیں۔ ادھر ادھر اٹھتیں۔ جیل کی دیواروں سے گزر کر واپس آ جاتیں۔ ان کی اسی آزادی سے اپنی نظر بندی کا خیال آیا۔ اور اسی خیال میں ڈوب کر رہ گیا۔ اور سوچ ہی رہا تھا کہ

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرفار دیکھ کر

دیتے ہیں بادہ طرف قدح نوار دیکھ کر

چھ تاریخ کے بعد رہا ہو کر کیا کرونگا۔ کہاں جاؤنگا۔ لوگوں کو کیا سناؤنگا۔ اور

ان سے کس چیز کا مطالبہ کرونگا۔ اس وقت مشکلات کیا ہیں۔ وقت کے سوالات

کہا ہیں۔ میں اندر کیوں آیا تھا۔ اور باہر کیوں جا رہا ہوں۔ اگر میرا آنا کسی مقصد کی خاطر تھا تو جانا کیوں؟ دماغ میں جانے کے خیالات کیوں چٹکیاں لیتے ہیں کیا اس لئے کہ جا کر کچھ کرنا ہے۔ کرنا ہے تو کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ انہیں خیالات کی ادھیڑ میں تھا کہ اچانک دروازہ کھلا۔ آگے آگے کرنل فخر الدین اور پیچھے راجہ صاحب۔ ہیڈ کلرک وغیرہ ہاتھوں میں کچھ کاغذ لائے آئے۔ حالات کیسے ہی خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار مگر کرنل صاحب اپنی خاص ادا میں رکھتے ہیں۔ میں کاغذات کو دیکھ کر متحیر سا ہوا۔ رہائی کا بھوت دماغ پر پہلے ہی سے سوار تھا کاغذات کی نمود نے ایک تلامح پیدا کر دیا۔ کچھ حیرت سے اور کچھ تعجب سے آئندگان کے چہروں کو پڑھنے میں لگ گیا مگر

شمع خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کرنل صاحب نے

خوش تر آں باشد کہ سرد لبران

گفتہ آید در حدیث دیگران

کی طرح ڈالتے ہوئے چوٹھے پر رکھی ہوئی دیگچی کے متعلق پوچھا لیا کہ کیا ایک رہا ہے۔ ہم دلبران نظم و نسق کی ایک ایک ادا کے محرم راز ہو چکے تھے۔ بھانپ

گئے کہ اسرار کی منادی سر باز رہنے والی ہے وہ تو نے

ہاؤن تو ہے عقل کا دستہ پالسی کا

کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ مگر یہاں معاملہ اور تھا گو پاس

لیکن ادھر تصور جانا نہیں کسی کا

مانا کہ نظر بند ہیں لیکن سے

نہاں ہے اگر ناتوانی سے بند سرے دل پر نہیں معنی کے در بند

کھان گئے اور یوں گویا ہوئے کہ لو دستخط کرو۔ دستخط کا نام سنتے ہی اپنے طوطے اڑ گئے
 قلم لیا۔ شرم سے گر گیا۔ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جو نام سب سے بڑے نبی اور سب
 سے اونچے ولی کے ناموں کا مجموعہ یعنی محمد علی۔ اس کے پہلے ہی لفظ نے زبان
 قلم پہ آنے سے یہ خیال کر کے انکار کر دیا۔ کہ رہائی کی خاطر شاید یہ پیکٹ ہو رہا
 ہے۔ کہ یکا یک ہجوم عام میں نگاہ نے پیشانی کو دیکھا۔ تو

یہ نظر بندی نکلی نورِ سحر دیدہ نامے ہوش اب جا کر کھلے
 بہتہ چلا کہ رہائی نہیں بلکہ نظر بندی کی توسیع ہے سہ
 مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا

کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ آپ کہیں گے کیا خوب پیوند لگایا ہے
 میں کہوں گا کیا خوب اظہار حقیقت ہے۔ دل باغ باغ ہو کر بگیوں اچھلنے لگا۔
 ساری الجھنیں ختم ہو گئیں۔ خیالات میں جس قدر گلچٹیاں تھیں اب ایک ایک
 کر کے خود بخود کھل گئیں۔ باز نگاہ اقدس سے پر امید ہوں۔

امتحان سخت ہی پر دل مومن ہی وہ کیا جو ہر ایک حال میں امید سے معمور نہیں
 ہم کو تقدیر الہی سے نہ شکوہ نہ گلہ اہل تسلیم و رضا کا توبہ دستور نہیں
 اب تو یہی کہتا ہو کہ خداوند اتیری رضا مطلوب اور تیری پسند مقصود ہے۔ جو ہر کا ایک
 شعر ذرا سی ترمیم سے میرے محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

اپنی عزت مجھے مطلوب ہے لیکن انکو نہیں منظور تو پھر مجھ کو بھی منظور نہیں

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی محسوس کرتا ہوں کہ وقت گزر رہا ہے۔ معاش کی
 ساری الجھنوں سے آزاد ہوں۔ چائے تین وقت اور کھانا شاندار صبح و شام مل جاتا
 ہے۔ زندگی کی ساری آسائشیں یہاں جمع ہیں۔ سب سے بڑی آسائش اور سب
 سے بڑی نعمت جو باہر کسی قیمت پر نہیں ملتی۔ وہ خلوت اور تنہائی ہے۔ اور گویا

بقول حضرت جوہرہ

تنہائی کے سب دن ہیں اور تنہائی کی سب راتیں

اب ہونے لگیں خلوت میں ان سے ملاقا میں

تو بیچ آنے سے پہلے بھی خلوت تھی۔ مگر ایسی تھی۔ اب تو واقعی سے

تنہائی کے سب دن اور تنہائی کی سب راتیں ہیں۔ اکیلا رہتا ہوں کوئی نہیں۔ اب دل میں باہر جانے کی وہ بھڑک نہیں جو یکم فروری سے پہلے تھی۔ اب تو یہ

محسوس ہو رہا ہے۔

میں تیرا گھر سمجھ کے سر راہ گر پڑا دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

تجربہ یہی ہے کہ علاقہ کی کثرت جس قدر ہوگی اسی نسبت سے سامان غم و الم بھی بڑھنے جائیں گے۔ امن و عافیت تو بس خلوت میں ہے۔ اکیرا الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

دل تعلق بڑھا کے پھٹا یا پاؤں پھیلا کے ہاتھ ملتا ہے

اگر خلوت صالحہ نہ ہو تو سارا وقت دوسروں کی عیب چینی اور نقص جوئی میں گزارتا ہے اور اپنی کمزوریوں، خطا کاریوں کی طرف خلوت میں بھولے سے بھی توجہ نہیں ہوتی۔ آہ سے میری نسبت جو ارشاد ہوا وہ میں نے سنا ہے یہ تو کہیے اپنی نسبت

آپ کی کیا رہے۔

انسان کی نسبت سب سے زیادہ صحیح رائے خود اس کا ضمیر قائم کر سکتا ہے کیونکہ

وہ اس کی اصلی کمزوریوں سے واقف ہوتا ہے۔ میں ساری دنیا کو دھوکہ دے سکتا ہوں۔ لیکن خود اپنے ضمیر سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔

نہ پھول اس پر کہ یہ اور وہ تجھے ایسا سمجھتا ہے

تو اسے دل اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے

دل کا معاملہ اللہ جل شانہ کے ساتھ ہے اصل میں خود کمزور ہوں۔ ورنہ اخلاق کو

صفائی، تزکیہ نفس صرف گوشت نشینی سے حاصل نہیں ہوتی۔ اصل چیزوں کی بے تعلقی اور اس کا مدار عمل پر ہے۔ اچھی باتوں کی داد دینے والے بہت سے مل جاتے ہیں۔ دل سے ماننے والے ان پر عمل کر کے دکھانے والے کم ہی ہوتے ہیں۔

حرص دنیا سے نہیں ہر صاحب عزت بری
خلاقا ہیں اور ہیں اور دل کا گونا اور ہے
مدحت گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند
خوب کہنا اور ہے اور خوب ہونا اور ہے

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ عزت میرے لئے راحتوں کا سامان ہے اور اسمیں بھی میری ہی کمزوری کا راز چھپا ہوا ہے کہ نفس کی راحتوں کے سامان تلاش کرتا ہوں۔ اب خود ہی سوچ لیجئے کہ مجھ میں اور بزرگوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ وہاں خلوت کی اسلئے تلاش ہے کہ اسمیں نفس کی ناگواریاں سمٹی ہوتی ہیں۔ اور اب اسلئے مطلوب ہے کہ اس میں لذتوں کا سامان ہے۔ سکون دل اور اطمینان خاطر کا راستہ خلوت نہیں اسکی شاہراہ اور ہے۔ سارے ولیوں کا بچھایا ہوا راستہ یعنی دنیا سے بحیثیت دنیا کی بے تعلقی و بے زاری اور دل میں کسی کی لگن۔ ہاتھ پیر چلیں پھریں مگر دل میں انگلیٹی دکھتی رہے۔ جو اہل دنیا کا رخ کرو گے۔ سکون خاطر کبھی نہ ہوگا۔ شریک غفلت بہت سے ملینگے شریک عبرت کوئی نہ ہوگا۔ صدیوں پیشتر اسکی منادی کر دی گئی۔ کہ اطمینان و راحت دل صرف ان لوگوں کا حصہ ہے۔ جو ایمان کامل رکھتے ہیں۔ اور اپنی بد عملیوں سے اپنی ایمان کو ننگ آلود نہیں بناتے۔

نیکی کی طرف رخ ہو یہی ناموری ہے
کھوٹے کو جدا کر دے وہی بات کھری ہے

جو ہر کی آواز بھی اس آوازہ حق کی صدائے بازگشت ہے۔

سوز دروں سے جل بھینو لیکن دھواں نہ ہو
ہے درد کی یہ شرط کہ لب پہ نغماں نہ ہو

مرد لبریں کچھ حدیث دیگر ہیں میں خوش تر و خوشگوار تر ہوتا ہے۔ اور استاد غالب اپنی زبان میں فرماتے ہیں۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں بجا دہ و ساغر کہے بغیر

سننے ہیں۔ قدیم صوفیہ میں ایک فرقہ ملا متبیہ تھا۔ ظاہر خراب باطن آراستہ، وضع زندانہ اور

صورت مستاد، لیکن اعمال زاہدانہ اور سیرت فقیرانہ۔ جیل بھی ایک چھوٹے پیمانہ پر عالم صغیر ہے۔

یعنی عالم کبیر میں جو کچھ بھی ہے۔ سب کا نمونہ انگریزی کی لباسی ہوئی اس نگری کے اندر موجود ہے۔ کم از کم ضلع سیالکوٹ کا تو اسے ایک زندہ عجائب خانہ سمجھ لیجئے۔ ہر نوع، ہر فاش، ہر نمونہ کے انسان کو اس ننھی سی دنیا میں آکر دیکھ لیجئے۔ گویا یہاں انسانیت بکھری ہوئی ہے۔ سب کے باطن سب کے اخلاق، سب کمالات یہاں کے یونیفارم کے پردے میں پھپھے ہوئے ہیں۔ مہاترقی جہاڑا کو، قاتلوں کے راجہ، چوروں کے گرووں کے گروپ میں وہ بے گناہ چہرے بھی ہیں۔ بوسوچ کی کڑوں سے شرم جائیں۔ اور جن میں ابھی تک ماں کے دودھ کی آب باقی ہے۔

بدل چاہیگا انداز طبائع دور گردوں سے نئی صورت کی خوشیاں اور نئے سامان نمونے یہاں لباس کی سادگی۔ رہائش کی سادگی، خوراک کی سادگی کو دیکھ کر مسلمانوں کا تصور آجاتا ہے مگر یہ نہ سمجھ لیجئے کہ یہ ملائی ہیں۔ تشبیہ صرف ظاہر میں ہے۔ کردار اور اعمال میں ہرگز تشبیہ نہیں ہے۔ باطن کا حال سب کا خدا کو معلوم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جیل کے قانون کا پس منظر کیا ہے۔ عقوبت و قصاص یا اصلاح و تربیت۔ اس نگری میں زندگی کے جو نقوش پائے جاتے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے کوئی پس منظر مقرر کرنا اذیس مشکل ہے۔ بیشک یہاں مناظر کا لطف عمدہ ترین کھانوں کی لذت بہترین نعمتوں کا مزہ، شیریں پھل اور ٹھنڈے پانی کی روح افزائی، بہتی ندیوں کے کناروں کے دلربا سائے حور و شہوئی اور مسلمان رو بچوں کی رفاقت نصیب نہیں ہے مگر اس میں سزا اور عقوبت کا تصور ہی کیا ہے۔ جیل سے باہر بھی کتنے ناکردہ گناہوں کی زندگیاں ان سے محروم ہیں۔ اگر یہی سزا ہے۔ تو مجرم اور غیر مجرم میں کیا فرق؟ ذرا غور سے دیکھو کہ یہاں معیشت کا معیار خواہ کتنا سادہ ہے۔ مگر بے فکری سے کھانے کیلئے روٹی۔ پہننے کیلئے کپڑے پہننے کیلئے مکان بغیر بلے جلے ملتا ہے۔ اسے کاشی حکومت باہر غریبوں، اندھوں، ابا بچوں لنگڑوں، بوڑھوں اور بے کاروں کیلئے جیل ہی جیسی معیاری معیشت کا انتظام کر دے۔ یا کم از کم ان بے کٹوں سے قوم کیلئے کوئی مفید کام کرائے۔ تم یہ سن کر حیران ہو گے، کہ کوئی جیل خانہ بھی خود کفیل نہیں ہے۔ بلکہ چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں کا بوجھ عوام کی جیبوں

پر پڑتا ہے۔ لیجئے جرم کون کرتا ہے۔ اور جرم کس کو ہے۔ مجھے ہی لے لیجئے کہ میں
 ناگردہ گناہ کے جرم میں اندر پڑا ہوں۔ کوئی اصولی حکومت ہو تو مجھ پر عدالت میں مقدمہ
 چلائے جرم ثابت ہو جائے۔ تو تختہ دار پر لٹکا دے۔ مگر داد دیجیئے اس بے عقلی کی کہ اندر لکھے
 ہوئے ہیں۔ اور پورے ۷۵ روپے مانا نہ خرچ کر رہے ہیں۔ اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ
 اسلام اپناتے میں بڑی راحت ہے۔ سچ کہتا ہوں۔ آج اگر صرف فوجداری عدالت میں
 اسلامی قانون اپناتے تو جیلیں اتنی فیصدی خالی ہو جاتی ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ یہاں ۸۰ فیصد قیدی فوجداری الزامات میں گئے ہیں۔ اگر آج کچھ نہیں
 پاکستان میں صرف فوجداری الزامات کی حد تک اسلامی قانون نافذ ہو جائے تو میں بلا خوف
 تردید کہہ سکتا ہوں۔ کہ جیل کی ۸۰ فیصدی آبادی گھٹ جائے اور بالفاظ دیگر ۸۰ فیصدی
 حکومت کو مالیاتی شعبے میں اخراجات کی بچت ہو۔ اس سے بھی آگے ترقی کر کے کہتا ہوں کہ
 عوام سے ۸۰ فیصدی بوجھ ہٹ جائے۔ مگر کیا کہوں اور کس سے کہوں۔ بھلا ان اسلامی
 آئین کے ڈھنڈور چوں کو کون سمجھائے۔ وعدہ تو کرتے ہیں مگر

یقین آئے کو تو آجائے تیرے ہڈ پیمان کا تیری آنکھ سے وعدہ بنت شکن کچھ اور کہتی ہے
 کن کن صبر آئے مائیوں کے بعد آرزوں کی یہ کلی کھلی تھی۔ کہ اسلامی تہذیب، اسلامی تمدن،
 اسلامی ثقافت، اسلامی روایات اور اسلامی معاشرت کو گوتہ آزادی نصیب ہوا۔
 کس زور کی لڑائی تھی اللہ کے کشمکش کھنی رات یاس اور دل نا صبور تھا

بیشک دستور میں اسلام کی خاطر کچھ دفعات کا اضافہ ہوا ہے

پراسس غریب کی بوسے، کفن کچھ اور ہی کہتی ہے

خوب کہنے کی حد تک تو میں بھی خداوندان پاکستان کی بڑھ بڑھ کر داد دیتا ہوں۔ مگر

خوب کہنا اور ہے اور خوب ہونا اور ہے

کیونکہ حکومت کے کردار کا مظہر ہی عوام ہوتے ہیں۔ اکبر کا ایک شعر ذرا سی ترجمیم سے حالات

کا نقاش بن جاتا ہے۔

باتوں کو تم نہ جاچو پبلک سے مل کے دیکھو

کیا پورہ ہے آخر کیسی گذر رہی ہے

یہ شاعری نہیں بلکہ واقعات کی ترجمانی ہے۔ اقبال نے جو دعائیں کہتی تھیں کہ

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے

چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کر دے

وہ آدھی تو پوری ہو گئی۔ اسلام کی خاطر چراغ آرزو روشن ہو کر بھڑک بھی گیا

لیکن ابھی اسلام کو ضرورت ہے شہیدان جستجو کی میں دور نکل گیا۔ بتانا یہ چاہا

ہوں۔ کہ اگر ضابطہ فوجداری کی حد تک اسلام کو اپنا لیا جائے تو جیل کی آباد کاری کی

ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اچھا لو۔ آپ بچوں سے لئے پیاروں کی سوغات، بڑوں

لئے سلاموں کی ڈالیاں، اور دوستوں کے لئے دعاؤں کے تحفے لے جاؤ۔ سچ بتاؤ کہ

یاد بھی کرتے ہو۔ تمہارا متبسم چہرہ ہر وقت لگا ہوں میں کھیلتا رہتا ہے۔ ۲۳

پیچھے الٹی زقند لگا کر تمہیں دیکھتا ہوں۔ تو حیران رہ جاتا ہوں۔ اور اپنا اب

نہ پوچھو۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بنام چوہدری محمد جمیل صاحب اڈھتی گندم منڈی شہر سیالکوٹ

108

DATA ENTERED

فتویٰ ختم نبوت

یعنی تحریک ختم نبوت کی قیید و بند میں لکھے ہوئے مختلف احباب کے نام خطوط، جن میں اسلام کے بنیادی مسائل ختم نبوت، مسئلہ ارتداد، توحید و رسالت، مقام نبوت، احسان و استحسان پر تبصرہ اور مختلف آیات قرآنی اور ارشادات نبوت کی تشریح کی گئی ہے۔

— — — — —

حضرت مولانا الحافظ الحاج محمد علی صاحب صدیقی

صدر دارالعلوم الشہابیہ سیالکوٹ

— — — — —

مکتبہ قاسمیہ رنگپورہ روڈ شہر سیالکوٹ